



رضیہ بیٹ

ریشم

ششم

رضیہ بٹ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور



”خواب نہ ہو تو اور کیا ہو.....“ ریشم نے منہ بنایا۔

سارہ بڑے پیار سے اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”بھوک لگ رہی ہے ناں؟“

”بھوک.....“ ریشم بڑبڑائی۔ ”تین بج رہے ہیں سارہ باجی.....“

”موڈ ٹھیک کرو۔ میں ابھی کھانا گرم کر کے لاتی ہوں.....“ سارہ نے اس کی حسین ٹھوڑی کو چھوا۔

”موڈ ٹھیک کرو..... موڈ ٹھیک کرو.....“ ریشم نے منہ بنایا۔ ”ایک تو بسوں میں خواب ہو ہو کر آتے ہیں۔ اس پر پہلا سوال ہی یہ ہوتا ہے، اتنی دیر کیوں لگا دی..... کوئی نہیں پوچھتا..... بھوک لگی ہے..... تھک گئی ہو..... ہونہہ.....“

”اوہو ہو.....“ سارہ مسکرائی۔ ”تو اس بات پر جنابہ کا موڈ خراب ہوا ہے.....“

”اور نہیں تو کیا.....“ ریشم قدرے نرمی سے بولی..... ”امی نے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال یہی کیا۔ آپ نے یہی بات پوچھی..... آپ سب کو نہیں پتہ کہ میں ہر روز بس میں آتی ہوں..... اور بسوں.....“

”بس بس.....“ سارہ نے مسکراتے ہوئے اسے پیار کر لیا۔ ”غلطی سے میں یا امی یہ سوال کر ہی بیٹھے ہیں تو اتنا غصہ زیب نہیں دیتا تمہیں۔ آئندہ نہیں پوچھیں گے۔ ریشم صاحبہ.....“

”مصیبت ہے اللہ قسم باجی۔ گھنٹہ گھنٹہ بس سٹاپ پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ کالج میں اتنا نہیں تھکتے جتنا آنے جانے میں تھکن ہوتی ہے.....“ ریشم نے سوٹا تارتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا کیا جائے.....“ تاکنگے یار کشتے والی بات بھی تو نہ بن سکی تھی۔ کجخت اتنے پیسے مانگتے ہیں.....“ سارہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہاری تکلیف کا ہمیں بھی احساس ہے لیکن اور لڑکیاں بھی تو جاتی ہیں.....“

”ضرور جاتی ہیں.....“

”بس پھر.....“

”لیکن مجھ سے نہیں آیا جایا جاتا۔ میں نے سوچ لیا ہے.....“

”کیا.....“

”زریں کے ساتھ آ جایا کروں گی.....“

”زریں کون.....؟“

”میری کلاس فیلو ہے..... اتنی بڑی گاڑی میں کم بخت اکیلی آتی ہے..... انتظار کرنا پڑتا ہے، نہ ایک ایک سٹاپ پر رکنا..... ٹھاٹھ سے آتی جاتی ہے.....“

”تم.....“

”مجھے کئی دفعہ اس نے آفر کی ہے..... اسی سڑک سے گزر کر جاتی ہے۔ بس میں تو ضرور اس کے ساتھ آیا کروں گی۔ یہ گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے بسوں کے انتظار میں کھڑے رہنا تو ختم ہوگا..... مزے سے آیا کروں گی۔ نہ کوفت نہ تردد.....“

”لیکن ریشم.....“

”بس باجی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... ہرج بھی کیا ہے۔ کونسا اسے صرف میری خاطر ادھر سے جانا پڑے گا۔ راستے ہی میں تو پڑتا ہے ہمارا گھر..... چلی بس میں جایا کروں گی کہ یہاں سے جانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں..... آیا اس کے ساتھ کروں گی۔“

”امی سے پوچھ لو.....“

”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ آنا مجھے پڑتا ہے یا امی کو.....“

سارہ نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ ریشم کی عادت سے خوب واقف تھی۔ جس بات پہ بھی اس سے الجھا جائے، وہ اس کی ضد بن جایا کرتی تھی اور پھر اس وقت سارہ بحث کے موڈ میں بھی نہ تھی.....

”کپڑے بدل کر ادھر ہی آ جاؤ..... میں کھانا لگاتی ہوں۔“ سارہ کمرے سے جاتے ہوئے بولی۔

”کھانا لگاتی ہوں۔“ ریشم نے زہر خند سے کہا اور پھر سارہ کے قریب لپک کر آئی۔ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے خوشدلی سے بولی۔

”لفظوں کی ہیرا پھیری سے باز آ جائیے.....“

”کیا مطلب؟“

”کہنے سالن گرم کرتی ہوں اور روٹی.....“

”تو بہ ریشو..... تم بھی خدا جانے کیا چیز ہو.....“

”کھانا لگاتی ہوں..... تو آپ یوں کہہ رہی ہیں..... جیسے دو چار قسم کے سالن،

چاول..... کباب بیٹھا.....“

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سیدھی بات کا الٹا مطلب، الٹی کا سیدھا

عادت ہی بن گئی ہے تمہاری.....“

”ناراض ہو گئیں.....“ ریشم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے سفید سفید ہموار دانت

چمک رہے تھے۔

”تمہاری باتوں سے سخت کوفت ہوتی ہے۔“

”حقیقت کو حقیقت کہنے سے کوفت کیوں ہوتی ہے سائرہ باجی..... میں اکثر یہ

بات سوچتی رہتی ہوں.....“ وہ مسکرانے لگی۔

سائرہ نے کمرے سے جانا چاہا لیکن ریشم اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹنے ہوئے پلنگ

کی طرف لے آئی۔ اب اس کا موڈ ٹھیک ہو چکا تھا۔ ٹکان اور بیزاری چھٹ گئی تھی۔

”ریشم پہلے کھانا کھا لو۔“

”کھالوں گی۔ آئیے میں آپ کو ایک مزیدار بات سناؤں۔ سچی آج ہم ہنس

ہنس کر پاگل ہو گئیں سب سہیلیاں.....“

وہ کالج کا کوئی قصہ سنانے کے موڈ میں تھی۔

سائرہ کھڑے کھڑے اس کی باتیں سننے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں بہنیں بے

تکلف سہیلیوں کی طرح گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں..... ریشم کی باتوں پر سائرہ بھی خوب

ہنس رہی تھی۔

”ہائے اللہ..... ریشم تیری تو باتیں ختم ہونے سے رہیں۔ مجھے تو کتنے کام کرنے

ہیں..... وہ کرن بھی ٹانگنا ہے ابھی.....“ اس نے میز کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”یہ کس کا دوپٹہ ہے.....“ ریشم نے دلچسپی سے دوپٹے کو دیکھا۔

”نعیمہ.....“

”کیوں.....“

”شادی ہو رہی ہے اس کی.....“

”سچ.....“

”ہاں تاریخ بھی مقرر ہو گئی..... چچی دے گئیں دوپٹے..... کرن گوٹے لگانے

کے لیے..... دن تھوڑے ہیں کام بہت..... سترہ تاریخ مقرر ہوئی ہے..... اور آج دو ہونچکی

ہے۔“

سائرہ نے دوپٹہ تہہ کرتے ہوئے بتایا..... ریشم کی حسین آنکھوں میں ایک

اضطرابی سوچ گھلنے لگی۔

”کتنے امیر، کیسے ماڈرن ہیں وہ لوگ.....“ وہ بولی۔ ”لڑکا بھی کتنا خوبصورت

اور سمارٹ ہے.....“

”ہاں نعیمہ کے مقابلے میں وہ بہت خوبصورت ہے.....“ سائرہ نے پھیکے پھیکے

انداز میں کہا۔

”باجی.....“

”ہوں.....“

”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں.....“

”کیا سوچتی ہو.....؟“

”ایسے ایسے بے جوڑ رشتے کیونکر ملے پا جاتے ہیں.....“

سائرہ کے چہرے پر ایک پھیک سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”دیکھیں نا۔ نعیمہ اور سلیم بھائی اور پچھلے ماہ ریفیہ اور حامد کی جو شادی ہوئی ہے۔

اللہ قسم ریفیہ! بات کرنا آتی ہے۔ نہ شکل و صورت ہی لاکھوں میں ایک ہے۔ پھر

بھی اتنے اچھے گھرانے میں بیاہی گئی..... کتنا پیسہ ہے ان موڈیوں کے پاس..... آخر یہ

شادیاں کیسے ہو جاتی ہیں..... شکل و صورت کے علاوہ ذہنی تفاوت.....“

”ریشو! چھوڑو ان باتوں کو کیا لینا ہے تمہیں.....“

”کوئی قدر بھی مشترک نہ ہو۔ پھر بھی شادی اسی دھوم دھام سے ہو جائے۔ یہ

کیا بات ہوئی.....“

”ایک قدر جو مشترک ہوتی ہے ریشم.....“

”کون سی.....“

”پیسے کی اور کون سی.....“

”تو صرف ایک مشترک قدر کے لیے اور ساری باتیں قربان کر دی جاتی ہیں؟“

”اکثر یہی ہوتا ہے.....“

”بری بات.....“

”تمہارے کہنے سے بری نہیں ہو جائے گی.....“

”ہونی چاہیے.....“

”بحث شروع نہ کر دینا۔ چلو یونیفارم اتارو اور چل کر کھانا کھا لو.....“

”میری تو سارہ باجی بھوک ہی اڑ گئی.....“

”کیوں؟“

سارہ نے استفہامی نظروں سے بہن کو دیکھا جو خاصی پریشان نظر آ رہی تھی.....

وہ پھر بستر پر دھم سے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے ٹانگیں اضطراب

سے ہلانے لگی۔

”کیا شے ہو تم بھی.....“ سارہ نے اکتا کر اسے دیکھا۔ ”بیٹھے بٹھائے اب کیا ہو

گیا؟“

”بڑا غصہ آ رہا ہے.....“ ریشم نے خوبصورت آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے کہا۔

”کس پر.....“ سارہ نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا.....

”نعیمہ کے سنہرا والوں پر..... اور اپنی سیدھی سادی امی پر.....“ ریشم نے

بلا جھجک کہہ دیا۔

سارہ مسکراتے ہوئے اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس کے خوبصورت بالوں پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”ان غریبوں پر کیوں؟ اور اپنی امی.....“

”ان پر اس لیے کہ انہیں.....“ ریشم نے ہاتھ ہلاتے ہوئے الفاظ چبا چبا کر کہا۔

.....”آپ نظر نہیں آئیں.....“

”ریشم.....“ سارہ کا چہرہ دھندلکوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

”سچ کہتی ہوں سارہ باجی۔ آپ جو نعیمہ سے بہت زیادہ خوبصورت، سارٹ،

سلیقہ شعار..... سوئی سلائی کی ماہر..... اور پھر انہوں نے آپ کو.....“

”ریشم۔“ سارہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن ریشم اسی انداز میں بولتی بیٹھ گئی۔

”اور پھر خاندان تو ہمارا بھی وہی ہے۔ اب کیا ہوا جو ہمارے ابا فوت ہو گئے اور

ہماری آمدنی کے وسائل نعیمہ کے باپ اور بھائی جیسے غیر قانونی اور ہیرا پھیری کے نہ

ہوئے.....“

”تو بہ ہے ریشم تم سے تو.....“ سارہ کے بات دل کو لگی تھی۔ پر ظاہر داری سے

بولی۔ ”اب کیا چچا اور چچا زادوں کے بچے ادھیڑ نے لگی ہو..... کچھ بھی ہے۔ دولت تو سمیٹ

رہے ہیں.....“

”کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے۔ بھائی جان کو میں بھی اکساؤں کہ کیا چھ سو روپے کے

لیے دن رات ایک کئے ہو..... مار دھاڑ شروع کر دو..... رشوت لو..... چور بازاری

کرو.....“

”ریشم.....“ سارہ ڈر گئی۔ ”تمہاری سوچیں کیسی خطرناک ہیں۔“

”تو پھر یہ سب زیادتیاں کیوں ہوتی ہیں..... مجھے اچھی طرح علم ہے کہ یہ لوگ

آپ سے متاثر ہوئے تھے۔ ناصر کی شادی پر آپ کو دیکھا تھا لیکن رشتہ لے اڑیں چچی.....

ایک ہماری امی ہیں کہ قابو ہی نہ کر سکیں..... ہونہہ..... منہ دکھتی رہتی ہیں یا ٹھنڈی آہیں بھر

بھر کر تقدیر کو کوسنے دیتی رہتی ہیں.....“

”اور کریں بھی کیا.....“ سارہ جھلائی۔

”بے عمل لوگ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں.....“ ریشم نے مستحکم لہجے میں کہا۔

”غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو.....“

”تمہیں باتیں بنانا خوب آ گئی ہیں.....“ سارہ نے نگاہوں سے سرزنش کرتے

ہوئے کہا..... ”امی بے چاری..... دل جل جاتا ہے تمہاری باتوں سے ان کا.....“

ریشم نے ایک طویل گہری اور بے اطمینانی کی سانس لی۔ دوسرے لمحے اٹھ کر  
 ذہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں.....  
 ”کھانا نہیں ملے گا آج..... چلیے..... کھانا تو گرم کر دیں.....“  
 سائرہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی..... اور ریشم کپڑے تبدیل کرنے غسل  
 نے میں کھس گئی۔

میناروں والی کوٹھی اپنے علاقے میں کافی مشہور تھی۔  
 پچاس ساٹھ برس پہلے جب یہ کوٹھی فرید الدین نے بنوائی تھی تو اس محل نما کوٹھی کو  
 لوگ دور دور سے دیکھنے آتے تھے۔ اس کے عظیم الشان مینار ایک شان اور تمکنت سے  
 کھڑے تھے۔ بہت وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ بیسیوں کمرے تھے، کئی دالان تھے۔ کتنے ہی  
 طویل برآمدے اور راہداریاں تھیں۔ کئی چمن تھے اور بہت سے صحن تھے۔  
 دولت کی ریل پیل تھی..... رونق اور گہما گہمی دید کے قابل تھی۔ فرید الدین کے  
 اپنے بال بچوں کے علاوہ بھائیوں، بہنوں کے پورے پورے خاندان یہاں آباد تھے۔ چھ  
 سات خاندانوں کے افراد فرید الدین کی سرپرستی میں ایک مربوط اور مضبوط خاندان کی طرح  
 یہاں رہا کرتے تھے۔ فرید الدین کی حیثیت سربراہ کی سی تھی۔ ان کے رعب اور دبہ کے  
 سامنے کسی کو سر اٹھانے کی مجال نہ تھی۔ ہر بات میں ان کی اہمیت برقرار رکھی جاتی..... خوشی  
 ہو یا غمی ہر قدم ان کی مرضی کے تابع ہوتا..... جو فیصلہ کر دیتے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔  
 جو بات کہہ دی وہ پتھر پر لکیر..... بیٹی کسی کی بیٹا کسی کا..... لیکن فرید الدین نے رشتہ طے کر دیا  
 تو اس سے انکار کی گنجائش ہی ختم۔

فرید الدین بھی بڑے جہاندیدہ انسان تھے۔ سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھایا کرتے۔  
 تجربہ کار نگاہیں تھیں۔ زمانے کے نشیب و فراز دیکھے تھے..... اس لیے کسی کے اعتراض کا  
 سوال اٹھانے کی نوبت ہی نہ آتی..... کچھ زمانے کے تیور بھی تو ایسے نہ تھے۔ بزرگوں کا  
 لحاظ..... پاس ادب اور رشتوں میں اعتماد تھا..... وقت بخوبی گزر رہا تھا..... کبھی کسی کے لبوں  
 پر شکوہ نہیں آیا تھا۔ کبھی زبانیں شکایت کے لیے نہ کھلیں..... کبھی ہونٹ گلے کے انداز میں وا  
 نہ ہوئے.....

لیکن

وقت کے ہاتھ کبھی کبھی بے رحم بھی ہو جاتے ہیں۔

فرید الدین کی زندگی ہی میں کوٹھی پر چھائی بہاروں کے رنگ فق ہونے لگے۔ ٹھیکہ داری میں گھائے پر گھائے پڑنے لگے۔ لاکھوں کا خسارہ ہوا۔ رکھی رکھائی سے ان ناگہانی آفتوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی..... لیکن کچھ نہ بن سکا۔ ظاہر داری کا خول ہی خول رہ گیا.....

اور پھر حالات بد سے بدترین ہوتے گئے۔ جب فرید الدین فوت ہوئے تو بچوں کے ورثہ میں اس عظیم الشان کوٹھی کے ساتھ بے شمار قرضے بھی آئے۔ مربوط اور مضبوط خاندان بکھر گیا۔ ہمیشہ ایک کنبے کی طرح رہنے والے لوگ ٹوٹی تیج کے دانوں کی طرح بکھر گئے۔

کوئی تلاش روزگار میں شہر ہی چھوڑ گیا۔ کوئی اس کوٹھی سے اتنی دور جا بسا کہ اس کے عالی شان اور پروقار میناروں کو نظروں سے ہی اوجھل کر دیا۔

کوٹھی کا بہت بڑا حصہ قرضوں کی ادائیگی کے لیے بیچ دینا پڑا..... باقی تین بہنوں اور دو بھائیوں میں تقسیم ہو گیا۔

شادی شدہ بہنیں دوسرے شہروں میں رہائش پذیر ہو گئیں تو اپنا اپنا حصہ بھی فروخت کر دیا۔ یوں درمیانی اور مغربی حصے میں کئی غیر خاندان آ بسے۔

صرف انتہائی مشرقی حصہ حمید کے پاس رہا..... اور بربل سڑک مردان خانے کا کچھ حصہ رشید کو ملا۔

حمید فرید الدین کے بڑے بیٹے تھے۔ مزاج شاہانہ تھا۔ وضع داری نبھانے میں بے وقوفی کی حد تک جذباتی تھے۔ کام کاج تو خاص تھا نہیں لیکن رہائش ٹھٹ باٹ سے تھی..... وہ تو محمودہ بیگم ہی سیانی عورت تھی جو زیور اور نقدی کی صورت میں کچھ نہ کچھ آنے والے دنوں کے لیے رکھتی رہی..... اگر حمید پر ہوتا تو سفید پوشی کا بھرم رکھتے رکھتے کوٹھی کی اس رہی سہی ملکیت سے بھی محروم ہو جاتے۔

یہ جو اتنی بڑی محل نما کوٹھی تھی..... اب چھ الگ الگ کوٹھیوں کا روپ دھار چکی

تھی۔ خریدنے والوں نے اپنی اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق اس کی شکل ڈھال لی تھی۔ رشید اور اس کے بیٹوں نے بھی مشرقی حصے کو الگ تھلگ حصے میں منتقل کر لیا تھا اور جب سے دولت کے حصول کے آسان ترین راستے تلاش کر لیے تھے، یہ حصہ رونق اور گہما گہمیوں کا پھر سے گہوارا بنتا جا رہا تھا۔

لیکن حمید کے حالات نے کوئی خوشگوار پلٹا نہ کھایا تھا۔ بڑی بیٹی خالدہ کی شادی اور خالد کی تعلیم بھی محمودہ کی ہمت سے ہوئی تھی۔

خالد ایم اے کر کے ان دنوں کسی پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر رہا تھا۔ سائرہ ایف اے کے بعد تعلیم چھوڑ چکی تھی اور ریشم ان دنوں زیر تعلیم تھی۔

محمودہ نے اچھے دنوں کی آس میں برے دن اس طرح کاٹے تھے کہ بچوں کو بہت کم احساس ہونے دیا تھا۔ رشتہ داروں میں بھی رکھ رکھاؤ سے اٹھتی بیٹھتی تھی۔

حمید چند سال ہوئے بار زندگی سے گھبرا کر دنیا سے منہ موڑ گئے تھے۔ مالی لحاظ سے تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ پھر بھی باپ کا سایہ..... شوہر کا تاج بہت بڑی چیز تھی۔

ان دنوں گھر داری کے سارے اخراجات خالد کے ذمہ تھے۔ زیادہ نہ سہی تنخواہ معقول ضرور تھی۔ اپنا خرچہ رکھ کر وہ باقاعدگی سے ماں کو روپیہ بھیجا کرتا تھا۔ وقت گزر رہا تھا..... کچھ خالد بھیجتا..... کچھ پس انداز کی ہوئی رقوم کام آئیں اور کچھ کرایہ آ جاتا۔

تین کمرے اپنے تصرف میں رکھ کر پچھلے دونوں کمرے محمودہ بیگم نے کرائے پر اٹھار کھے تھے۔

سامنے کا حصہ یوں بالکل الگ ہی تھا..... سامنے چمن تھا۔ اس کے آگے برآمدہ اور پھر تینوں کمرے..... اتنا ہی ان کی ضرورت کو کافی تھا۔

چمن کافی بڑا تھا..... گو پہلے سی بہار تو اس پر کبھی نہ آئی تھی۔ پھر بھی سائرہ اور ریشم پھولوں کی کیاریاں بناتی ہی رہتیں۔ چھٹی کے دن تو ریشم پائینچے اڑ سے فوارہ اور کبھی ربڑ کی نالی ہاتھ میں لیے چمن میں جٹی رہتی..... گھاس جب بہت اگ آتی تو غریب عورتوں کو گھاس کاٹ لے جانے کی اجازت دے دی جاتی۔ کبھی کبھی تانگے والے بھی گھاس کاٹ کر لے جاتے۔ چند پرانے درخت بھی تھے جو بڑے اہتمام سے وفاداریاں نبھائے جا



رہے تھے۔ ریشم اور سائرہ کو ان درختوں سے بڑا پیار تھا۔ انہی درختوں کے سرد و گرم سایوں تلے ان کی زندگی کے کیسے کیسے دو گزر رہے تھے۔

دادا کے شاہی دور کو سائرہ نے دیکھا تھا نہ ریشم نے لیکن قصے جو زیادہ پارینہ تھے، بچپن سے سنتی آئی تھیں۔ محمودہ بیگم متحمل مزاج سنجیدہ اور کم گو تھیں لیکن جب کبھی بچپلی یادوں کے چہروں سے نقاب الٹیں تو بے تکان بولے جاتیں۔ کبھی جذباتی ہو جاتیں۔ کبھی سنجیدہ۔ اللہ اللہ ان کی آنکھوں نے کیا کیا دور دیکھا تھا..... اسی لیے آنکھیں سیر تھیں..... انا اور وقار کو اب بھی مسئلہ بنالیتی تھیں۔ ریشم اور سائرہ بڑی دلچسپی سے یہ داستان گم گشتہ سنا کرتی تھیں۔

سائرہ خیالوں میں ڈوب جایا کرتی۔ ماں کے سنگ ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ تقدیر کی بے رحمی کا شکوہ کیا کرتی۔

لیکن

ریشم کا انداز شروع ہی سے منفرد تھا۔ اسے تقدیر کا شکوہ کرنے کی عادت تھی نہ وقت کی بے رحمی کا گلہ..... ہاں اسے غصہ بہت آ جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اتنی جھنجھلا جاتی کہ موڈ ہی خراب ہو جاتا۔ بے دھڑک کہہ اٹھتی کہ دادا ابا زاد اور اندیش نہ تھے۔ اور پھر اپنے ابا..... ان کی شاہی مزاجی کا تو اسے خوب ہوش بھی تھا..... بقول امی ابا کے دور میں تو جاہ و جلال اور ٹھاٹ باٹ دادا کے وقت کے عشرِ عشر بھی نہ تھے لیکن ریشم کی یادوں میں سہولت اور فراغت کی نرمی رچی بسی تھی..... شاید اسی لیے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اس آسودگی اور فراغت کی تہمتی رہتی تھی۔

سائرہ اور ریشم یوں تو سگی بہنیں تھیں۔ ریشم اگر ریشم ہی جیسی نرم و ملائم حسین سی لڑکی تھی تو سائرہ بھی کچھ کم نہ تھی۔ کشمیری اور پٹھان خون کا احتراز قیامت ہی قیامت تھا۔

لیکن دونوں بہنوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ سائرہ چپ چاپ، راضی برضا رہنے والی سعادت مندی لڑکی تھی۔ عمر چوبیس سال کو پہنچ رہی تھی لیکن کبھی کسی کو دکھایا نہیں تھا۔ شوریدہ سر جوانی اندر ہی اندر سر پھوڑتی رہتی تھی لیکن مجال ہے کبھی شوریدگی کو راہ دے پائی ہو۔

ریشم کو اس کی یہی عادت ناپسند تھی۔ وہ بہت صاف گو، نڈر اور بے باکی کی حد تک

حقیقت کو تسلیم کرنے والی سچی لڑکی تھی۔ جذبوں کی پردہ پوشی کو خود کشی کے مترادف جانتی تھی۔ ضرورت وقت کی اٹل سچائی ہے اور اس سچائی کا اسے ہر حال، ہر رنگ میں اعتراف تھا۔ اس نے اس سچائی کو کبھی چھپایا نہ مستور رکھا۔ وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کی یہ عادت ماحول اور شاید معاشرے میں بھی مستحسن نہیں لیکن وہ کرتی بھی کیا۔ بس عادت سے مجبور تھی اور یہ عادت اس کی اپنی نظر میں بہت بڑی خوبی تھی..... وہ اکثر سوچا کرتی کہ حقیقت کو حقیقت کیوں نہیں کہا جاتا..... سچ بولنے میں مصلحت کیوں برتی جاتی ہے، اگرچہ کسی چیز کی افادیت ہے تو اسے برملا کہنے میں ہرج کیوں ہے۔

سائرہ کے ساتھ اسے پیار بھی بہت تھا لیکن لڑائی بھی بہت ہوتی تھی۔ دونوں بہنیں متضاد نظریوں پر جم کر جب بحث میں الجھ جاتیں تو محمودہ بیگم کو بیزارگی اور کوفت محسوس کر کے اکثر انہیں ڈانٹا پڑتا۔

اور

سائرہ حسب عادت سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک دم بحث ختم کر دیتی۔

لیکن ریشم سچائی کو منوانے کے لیے تلی رہتی۔ اس لیے کہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ سائرہ دل ہی دل میں اس سچائی کی معترف ہے لیکن جرات کا فقدان ہے جس کے لیے تسلیم نہیں کر پاتی۔

-----○-----

کوٹھی بقیہ نور بنی تھی۔ رنگین قمقے درختوں میں جگمگا رہے تھے۔ کیاریوں کے ارد گرد روشنیوں کے ہالے تھے۔ جگہ جگہ عارضی ستون بنا کر مرکزی ٹیوب لائیں لگائی گئی تھیں۔ اتنی جگمگ کرتی روشنیاں تھیں۔ اتنے جھلمل کرتے اجالے تھے کہ رات پر خوب صورت سے روشن روشن دن کا گمان ہوتا تھا۔ اندر باہر روشنی کا سیلاب اٹھ اٹھا۔

بے شمار لوگ تھے۔ کمروں میں بیٹھے تھے۔ صحنوں میں گھوم رہے تھے۔ برآمدوں میں کھڑے تھے۔۔۔۔۔ ادھر ادھر ٹولیوں میں بے لوگ مسرور و شاداں تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ مسکراہٹیں بکھر رہی تھیں۔ بہت بڑے جہیز کے چرچے ہو رہے تھے۔ اپنے اپنے خوبصورت اور دیدہ زیب لباسوں کے دکھاوے ہو رہے تھے۔ زیوروں کی نمائش تھی۔ ہر عورت دوسری سے سبقت لے جانے میں کوشاں تھی۔ مرد اپنی دھن میں مست تھے۔ دل کھول کھول کر تہقہ لگا رہے تھے۔

بحث مباحثے میں الجھے تھے۔ بہترین کھانے کی تعریف کر رہے تھے۔

نعیمہ کی شادی معمولی شادی تو نہ تھی۔ اچھی خاصی نمائش کا اہتمام تھا۔ کچھ تو والدین صاحب استطاعت تھے ہی، کچھ سسرال والوں کی شان اور پاس و قار تھا۔۔۔۔۔ انتظام بھی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر کیا تھا۔ جہیز بھی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ دو بڑے بڑے کمروں میں جہیز کو سجایا گیا تھا۔ قیمتی سامان۔۔۔۔۔ جھلملاتے لباس۔۔۔۔۔ نئے نئے برتن۔۔۔۔۔ الیکٹریک کی بے شمار چیزیں، چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز موجود تھی۔ مہنگائی کے اس دور میں ایسا ساز و سامان ہر ایک کے لیے موضوع تھا اور تو اور سونے کے اتنے سیٹ، گرانی کا یہاں تو دور دور نشان نہ تھا۔

عورتیں گری پڑتی تھیں۔ ایک ایک شے دیکھ رہی تھیں۔ زیور کو ہاتھوں میں لے

لے کر وزن کا اندازہ کرتے ہوئے ایک دوسری کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

سسرال والے بھی خاصے مرعوب ہوئے تھے۔ گو خود بھی صاحب حیثیت تھے۔ پھر بھی معترف تھے کہ جہیز ان کی توقع سے کہیں زیادہ ہے۔

کھانے کے بعد مہمان ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ تذکرہ جہیز اور خاطر و مدارت ہی کا تھا۔۔۔۔۔ باہر شامیانے تلے کرسیاں اور صوفے دائرے کی صورت میں رکھے گئے تھے۔ درمیان میں سرخ قالین تھا۔۔۔۔۔ دلہن کے لیے نشست کا بندوبست بھی یہیں کیا گیا تھا۔ درمیانی صوفے پر پھولوں اور گلے سلسلے کے ہار اور سرخ ریشمی چادر ڈال دی گئی تھی۔

دلہن کو باہر لایا گیا تو مہمانوں کا ریلا بھی ادھر آ گیا۔ بھاری جوڑے اور مرصع طلائی زیورات سے لدی نعیمہ اپنے خوبرو دولہا کے پہلو میں بٹھا دی گئی۔۔۔۔۔ چند رسوم ہونا تھیں۔ لوگ شوق اور تجسس سے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ باراتی، سسرالی اور میکے کے عزیز سبھی گڈمڈ ہو گئے۔

ریشم اور سائرہ ہر کام میں پیش پیش تھیں۔ تین چار دن سے مسلسل کام کر رہی تھیں۔ چچی کو کام لینا بھی تو خوب آتا تھا۔ ایسی شیریں زبان تھی کہ جی نہ چاہتے ہوئے بھی کام کر دینا پڑتا تھا۔ صدقے واری ہو ہو جاتی تھیں۔ پھر بھلا انکار یا فرار کی کون سی راہ رہ جاتی تھی۔

سائرہ اب تھکی تھکی سی تھی۔ اللہ جانے واقعی نکان تھی یا کسی اندرونی مایوسی کا رد عمل۔۔۔۔۔ بہت نڈھال نظر آ رہی تھی۔ نعیمہ جب چمن میں دولہا کے پہلو میں بیٹھی تو سائرہ دور ایک کونے میں جہاں روشنیاں کچھ دھندلائی ہوئی تھیں جا بیٹھی۔ کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر اس نے دوسری کرسی پر ٹانگیں رکھ دیں۔ پاؤں پر پاؤں رکھے۔ وہ آنکھیں بند کئے جیسے ماحول سے بھی بیگانہ ہو گئی۔ نعیمہ اس سے پورے چار سال چھوٹی تھی۔ شاید سالوں کے یہی فاصلے پھلانگ جانے پر اسے نعیمہ سے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ بھڑکیلے عنابی رنگ کے لباس میں بھی اس کے چہرے کا پھیکا پن نظر آ رہا تھا۔

لیکن

ریشم خوب چمک رہی تھی۔ سیاہی مائل فیروزہ سادہ کپڑوں میں بھی اس کا حسین

پیکر حشر سامان تھا..... دوپٹے پر صرف کرن مکی تھی اور کانوں میں بڑے بڑے باریک تار ایسے سنہرے بالے تھے۔

سنہری پن صرف اتنا ہی تھا لیکن وہ محفل میں نور کی پھوار کی طرح تھی۔ رقصاں شرارہ تھی..... مومی شمع تھی..... جہاں سوزی کی بھر پور قوت رکھتی تھی۔

دولہا سے مذاق کرنے میں بھی وہ پیش پیش تھی۔ اس کے عین سامنے قالین پر دوزانو چھیڑ چھاڑ میں مصروف ریشم بالکل بے خبر تھی کہ دولہا کے عقب میں کھڑے ایک خوبصورت جوان کی نگاہوں کے زاویے مسلسل اسی پر ہیں۔

باتونی سی لڑکی کی باتوں سے سلیم بھی خوب لطف لے رہا تھا۔ سبھی ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ترکی بہ ترکی جواب دے رہے تھے۔ لڑکے کی ممی اور بہنیں بھی اس کی طرف داری کر رہی تھیں لیکن ریشم سب سے پوری اتر رہی تھی..... بہنوئی سے پیسے وصول کرنے تھے..... اس بات پر تکرار ہو رہی تھی..... سلیم نے ایک روپے سے شروع کیا تھا اور اب بمشکل سو روپے تک پہنچا تھا۔

ریشم کی پشت پر چچی امی، کاشف، راحت سبھی تھے۔ ”پانچ سو سے کم نہ لینا“ کی صدائیں بار بار آتی تھیں۔

اور پھر واقعی ریشم اڑ گئی۔ خوب خوب لے دے ہوئی۔ تھقبے ابل پڑے۔ ہنسیوں کے فوارے چھوٹ گئے۔ ریشم نے پانچ سو وصول کر ہی لیا۔

وہ پیسے ہاتھ میں دبا کر جھک جھک کر سلیم کو سلام کرتے ہوئے اٹھی..... تو اٹھتے ہی حصہ داروں نے گھیر لیا۔ چاچا زادوں، ماموں زادوں، خالہ زادوں میں گھری شور مچانے لگی، محفل زعفران زار بنی گئی.....

اس ہنگامے کے بعد بینڈ کی سریلی دھنوں نے فضا میں مترنم سا شور بکھیر دیا۔ دھنیں اتنی پر زور اور مسرور کن تھیں..... کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے پاؤں میں کھجلی ہونے لگی۔ چند لمحوں بعد لوگوں کا گھیرا پھیلتا گیا اور تھرکتے قدم درمیان میں آ گئے۔

کوئی باقاعدہ رقص تو نہیں تھا۔ نہ ہی تربیت یافتہ ناچنے والیاں تھیں۔ یہ تو خوشی کا موقع تھا۔ مسرور جذبات کے اظہار کا وقت تھا۔ تو کسٹ، چاچا چا..... رمھا..... خٹک

ڈانس..... بھنگڑہ..... لڈی اور کٹھالی سبھی گڈمڈ ہو گئے تھے۔ عمر کی قید نہ تھی۔ کبھی چچی پھیرے لے رہی تھیں۔ کبھی خالوناچ رہے ہیں۔ کبھی کوئی دولہا کی موٹی تازی، سرخ و سپید ممی کو درمیان کھینچ رہا ہے اور کبھی بڑے تکلف سے میک اپ کئے بھاری بھاری ساڑھیوں..... خوبصورت میکسیوں اور جدید لباسوں میں لپٹی بھابیوں اور بہنوں کو ناچنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

شور شرابہ..... مسرور سا ہنگامہ پورے عروج پر تھا۔ ارد گرد صوفوں، کرسیوں پر بیٹھے لوگ تالیاں، بجابجا کر داد دے رہے تھے۔

ریشم بھی اپنے عزیزوں کے ساتھ کھڑی بینڈ کی تال پر تالیاں بجارہی تھیں۔ شمع بھا بھی اور رفواس کے ساتھ تھیں۔ ساتھ ساتھ ناچنے والوں پر بے لاگ تبصرہ بھی کئے جا رہی تھیں۔

دولت مند اور فیشن ایبل باراتی ریشم کو دل ہی دل میں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ شمع بھا بھی اور رفو جب ان پر کوئی طنز کرتیں تو ریشم فوراً ان کی حمایت میں ایک آدھ جملہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دیتی۔ اتنے اتنے اچھے لوگوں کو برا بھلا کوئی کیوں کہے..... ریشم کے لیے ایسے لوگ تو ہمیشہ سے کمزوری رہے تھے۔

ناچنے والوں میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ دونو جوان عورتیں اس خورونو جوان کو بار بار کھینچ کر درمیان لا رہی تھیں لیکن وہ تھا کہ احتجاج کئے جا رہا تھا..... قسمیں کھا رہا تھا، معذرتیں کر رہا تھا۔

”اللہ قسم مجھے ناچنا بالکل نہیں آتا..... ذرا بھی نہیں..... بالکل بھی نہیں.....“ وہ کہہ رہا تھا۔

”تو کیا ہم سب پیشہ ور ڈانسریں.....“ نئی نویلی دلہن نے چکر لیتے ہوئے کہا۔

”آ جاؤ! اشی میاں یہ سب چلتا ہے۔“

”ضرور ضرور.....“ سب اکسا نے لگے۔

”ناچنا پڑے گا ورنہ تمہاری شادی پر کوئی نہیں ناچے گا.....“ آوازیں آئیں۔ وہ ہاتھ باندھے سب سے بار بار معذرت چاہ رہا تھا..... لیکن عزیزوں نے بلہ

بول دیا تھا۔ جان کہاں چھوٹی۔ سبھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر ایک نے اکسایا۔ پھر اس کے گرد لوگوں کا گھیرا تنگ ہو گیا۔

اس گھیرے میں ریشم بھی تھی۔

اس خوبصورت نوجوان کو کچھ دیر پہلے دولہا کے صوفے کی پشت پر کھڑے ریشم نے سرسری نظروں سے دیکھا تھا۔

اب وہ نشانہ بنا ہوا تھا اور لوگوں کے ساتھ ریشم بھی اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”ناچو نا.....“

”ناچنا پڑے گا۔“

”چلو تھوڑا سا ہی.....“

”بس اب کوئی بہانہ نہیں۔“

”لڑکیوں کی طرح شرمارہے ہو۔“

”ناچو.....“

”ناچو.....“

چاروں طرف سے آوازوں کا شور تھا۔

”ناچیں نا.....“ لوگوں کی دیکھا دیکھی ریشم نے بھی اکسایا۔

اس مترنم اور پہاڑی جھرنے کی سی مدھر آواز پر اس نے سر کو ذرا سا خم دے کر ریشم

کی طرف دیکھا..... اور یہ دیکھنا.....

ریشم گھبرا سی گئی۔

پلکیں جھپکائیں..... ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔

وہ نگاہوں میں شوق کے امنڈے طوفان لیے تھا۔

ریشم پیچھے ہٹ گئی..... اس کا دل تو اچھلا جا رہا تھا۔ ڈر گئی تھی..... شاید اسے ایک

اجنبی سے اس طرح اصرار کرنے کی جسارت کا احساس ہو گیا تھا۔

اجنبی کی نگاہوں میں اتنی اپنائیت نظر آ گئی کہ خوف کی لہر بن گئی تھی۔ بات ڈرنے

ہی کی تو تھی۔ بالکل غیر..... بالکل ہی غیر نوجوان ایک دم اتنا اپنا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی

نگاہوں میں کتنا اپنا پن تھا!!

ریشم جھپکتے ہوئے، نگاہوں کے قاتل وار سے بچتے ہوئے نازی بھابھی کے پیچھے

چھپنے کے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اتنی بڑی دلآویز سی مسکراہٹ لبوں پر لیے ہلہ بولنے والوں

کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”چلو ہم دونوں ڈانس کرتے ہیں۔“ دولہا کی ممی نے ہنستے ہوئے اشی کے بازو

میں بازو ڈال کر دوسرا ہاتھ اوپر اٹھایا اور پھر قدم بینڈ کی آواز پر تھرکنے لگے..... بینڈ پر بڑی

ہنگامہ خیز دھن بجائی جانے لگی۔ دھن کے ساتھ تالیوں کا طوفانی ریلا بھی آ گیا تھا۔

موٹی سی ممی اور اونچے قد و قامت کا نوجوان عجب مضحکہ خیز جوڑا تھا۔ ممی اسے

تقریباً گھسیٹ رہی تھی۔ خود بھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور محفل کو بھی ہنسا رہی تھی۔

لوگ پیٹ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔ آنکھوں میں پانی آ رہا تھا..... طوفانی قہقہے اٹھ رہے تھے۔

شور مچا رہے تھے۔ طلق پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔

وہ کتنا بے چارہ تھا..... الٹے سیدھے پاؤں مار رہا تھا۔ ہاتھ ہلا رہا تھا اور ممی سے

چھٹکارے کے لیے منتیں کر رہا تھا۔ لوگوں کو ہنسی اسی لیے تو آ رہی تھی۔

سب ناچنے والوں میں شاید وہ سب سے بے ہنگم طریق سے ناچا لیکن لوگوں نے

جتنا حظ اٹھایا جتنی داد دی، جتنا ہنسے کسی اور کی باری پر یہ حالت نہ ہوئی تھی..... اور جب ناچ

کے خاتمے پر لوگوں نے اسے ہنس کر داد دی، پیٹ پکڑ چکی تو وہ رومال سے چہرہ صاف کرتے

ہوئے تو بہ تو بہ کرنے لگا۔

جانے کیوں ریشم کو اس کا بے ہنگم ساناچ اور تو بہ تو بہ کرنے کی ادارہ کے اندر

اترتی محسوس ہوئی.....

گھبرا کر وہ وہاں سے ہٹ گئی..... اس نوجوان کا قرب تو..... نہ جانے دل ڈانوا

ڈول سا کیوں ہونے لگا تھا.....

”امی جانی۔“

”ہوں۔“

”کون کون جارہا ہے ویسے پر؟“

”اللہ جانے..... جسے سہلی بی نے کہا ہوگا، وہی جائے گا۔“

”ہم تو سبھی جائیں گے نا.....“

”کہا تو اس نے ہے.....“

”بس ٹھیک ہے.....“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں امی جانی..... ہم تو ضرور جائیں گے..... ہوٹل میں دعوت

ہے، مزہ آئے گا..... کتنی اچھی ہیں ہماری امی جانی..... امی..... جانی۔“

ریشم نے ماں کے گلے میں بائیں ڈالتے ہوئے فٹ سے ان کا پیار لے لیا اور

قریب بیٹھی سارہ دیکھ کر خوشی سے مسکرائی۔

”یہ چا پلوسی یونہی نہیں ہو رہی امی۔“

”میں جانتی ہوں اسے۔“ محمودہ نے ریشم کی بانہوں کے حلقے سے نکلنے کی کوشش

کرتے ہوئے کہا۔

”امی..... میں کوئی چا پلوس ہوں۔“ ریشم نے پھر سے ماں کے گال پر بوسہ دیا۔

”اب آپ ہی کہئے جس چیز کی مجھے ضرورت ہے، وہ آپ سے نہ مانگوں تو اور

کس سے مانگوں۔“

”دیکھا نا امی..... آرہی ہے نا مطلب کی طرف۔“ سارہ نے ہنس کر کہا۔

”بتاؤں امی..... کیا مانگ رہی ہے.....“

”صرف ایک قمیص کا کپڑا امی.....“ ریشم نے ماں کی ٹھوڑی کو پیار سے ہلاتے

ہوئے کہا۔ ”وہ جو اورنج پیس ہے نا آپ کے پاس..... وہ.....“

”اس کی کیا ضرورت پڑگئی.....“ محمودہ بیگم نے پوچھا۔

”کرنا سیوں گی.....“

”کس لیے.....“

”کل ویسے پر پہننے کے لیے۔ چوڑی دار پاجامہ سارہ باجی کا۔ دوپٹہ بھی انہی

سے لوں گی۔ صرف قمیص آپ سے لے لوں گی..... سارہ باجی آپ کا جامنی پاجامہ اور

دوپٹہ۔“ ریشم نے انگلیوں پر گنتے ہوئے کرتے پاجامے اور دوپٹے کا ذکر کیا۔

”لیکن ریشم.....“ محمودہ نے اس کی بات کاٹی..... ”دو جوڑے جو نئے بنائے

تھے، ان میں سے ایک پہن لینا.....“

”وہ دونوں پہن لیے تھے..... ایک مہندی پر دوسرا بارات پر، مہندی والا ویسے پر

نہیں پہنوں گی.....“ اس نے نہیں پر زور دیا۔

”ریشو..... کچھ سوچا بھی کرو۔“ محمودہ بیگم نے منہ بنایا؟ ”اتنا کہاں سے آئے کہ..“

”بس امی.....“ وہ بیزار سی بولی۔ ”یہ تقریریں سنتے سنتے کان پک

گئے..... آپ قمیص کی بات کریں۔“

”تجھ پر تو جیسے اثر ہو جاتا ہے نا۔“ سارہ نے کہا۔ ”بات تو اپنی ہی منواتی ہو۔“

”دیکھئے سارہ باجی۔ اتنی جلی کٹی نہ سنائیے، لڑائی ہو جائے گی۔ میں بات امی

سے کر رہی ہوں۔ آپ چپ رہیے.....“

سارہ چپ ہو گئی..... اور وہ پھر ماں کے گلے میں بازو ڈال کر جھول گئی.....

چپکارا، پیار کیا، ضد سے کہا..... بالآخر امی کو رضامند کر ہی لیا..... ”جان چھوڑ میری..... جانا

لے.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ہرا.....“ ریشم نے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے زور سے کہا۔ ”زندہ باڈ امی

جانی، زندہ باد۔“

اور پھر امی کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے برابر والے کمرے میں بھاگ گئی.....  
وہیں امی کے بکس میں اور نچ فلیٹ کا ٹکڑا پڑا تھا۔

”امی آپ بھی کمال کرتی ہیں.....“ سائرہ نے شاکا لہجے میں کہا۔

”تو ہی بتا کیا کروں..... اس کی ضد کا پتہ ہے ناں.....“

”امی یا تو اس کی عادت کو تسلیم کر لیں..... یا..... سختی سے روک دیا کریں۔ آگے پیچھے آپ کہتی رہتی ہیں۔ اس کی ضد کو کوستی ہیں لیکن جب موقع آتا ہے اس کی بات پوری کر دیتی ہیں۔ اسی لیے تو منوا کے رہتی ہے اپنی ہر بات.....“

”شروع ہی سے ایسی ہے۔ جو بات ذہن میں آجائے کر کے رہتی ہے۔ جو چیز پسند آجائے، حاصل کئے بغیر نہیں رہتی.....“

اور پھر امی اس کے بچپن کی باتیں دہرانے لگی۔

”ابو کے لاڈ پیار نے بگاڑا ہے اسے۔“ سائرہ بولی۔

امی نے ایک گہری سانس لی۔ ان کی آنکھوں میں درد کی کیفیت چل گئی.....

انہیں ریشم سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا..... اس کے منہ سے بات نکل جائے، کیا مجال کہ پوری نہ کر دیں۔ اب تو ویسے ضد کرتی ہی نہیں..... کبھی کبھی چل جاتی ہے اور بس..... کیا فرق پڑتا ہے۔ بے ضروری خواہش ہی تو ہوتی ہے..... اب اتنی انجان بھی تو نہیں رہی۔ سمجھدار ہو گئی ہے..... اسی بات کے لیے ضد کرتی ہے جس کے پورا ہونے کا امکان ہوتا ہے.....

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ عادت اچھی بھی تو نہیں..... کل کلاں.....“

”کل کلاں جو ہوگا دیکھا جائے گا سائرہ باجی۔“ ریشم نے اس کی بات کا نٹے

ہوئے کہا..... ”فی الحال تو یہ کرتہ سی دیجئے۔ میں نے کل پہننا ہے.....“

وہ اور نچ کپڑا اکندھے پر رکھے، مشین اٹھائے جھکی جھکی چلی آرہی تھی۔ مشین بہن کے سامنے رکھ کر اس نے کپڑا دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

”بڑی خوش ہو۔“ سائرہ نے منہ چڑایا۔

”آپ کا جی چاہتا ہے تو آپ بنالیں.....“ وہ خوشدلی سے بولی..... ”اچھا، یوں

کرتے ہیں ہل میں پہن لوں۔ پھر آپ لے لیجئے گا۔“

”جی نہیں شکریہ.....“

”اچھی بات.....“

دونوں بہنیں تلخی میں شیرینی اور شیرینی میں تلخی گھولنے لگیں تو محمودہ بیگم اٹھ کر باہر برآمدے میں چلی گئیں..... دوپہر کے کھانے کا بھی تو کچھ کرنا تھا.....

”تم امی کو بہت تنگ کرتی ہو ریشو.....“ ماں کے جانے کے بعد سائرہ نے کہا۔

”اچھا بھئی..... یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے کرتہ کاٹئے.....“

”اپنی خواہشوں کی اتنی تابع نہ رہا کرو..... یہ خود غرضی ہوتی ہے۔ اماں کہاں سے..“

”اف اللہ سائرہ باجی سی کر دیں گی یا نصیحتیں ہی کرتی چلی جائیں گی۔ ایک تو آپ

لوگوں نے زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ خوش ہوتی ہیں نہ خوش ہونے دیتی ہیں..... ایسے موڈ بنا

کر تقدیر کو کہاں تک سنوار لیتی ہیں آپ..... دیکھئے مجھے یہ منہ بنانا..... اور قسمت کو حیلے بہانے

کو ستے رہنا یا اس سے شاکا رہنا قطعاً پسند نہیں..... میں نے آپ سے پہلے بھی کتنی بار کہا

ہے.....“

ریشم نے منہ بنا کر قدرے سخت لہجے میں کہا اور سائرہ ریشم کو یوں بگڑتے دیکھ کر

مسکرانے لگی۔

”دیکھئے سائرہ باجی۔“ وہ مسکراہٹ سے شہ پا کر بولی۔

”ہوں.....“ سائرہ کپڑا پھیلاتے ہوئے بولی۔

”جو بات میرے دائرہ اختیار میں ہو، میں وہ ضرور کر گزرتی ہوں۔ مجھے اس سے

کوئی نہیں روک سکتا..... اب میں ایسی پاگل بھی نہیں کہ ناممکن کو حاصل کرنے کی کوشش

کروں..... خواہشیں کس من میں نہیں ابھرتیں۔ اب یہ اپنا اپنا کمال ہے کہ کوئی باہمت انہیں

پورا کرنے کی تگ و دو کرتا ہے اور کوئی بزدلوں کی طرح ان کا گلا گھونٹ دیتا ہے.....“

”یہ طنز مجھ پر کر رہی ہوں.....“ سائرہ نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

”جس پر فٹ آجائے.....“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”جاؤ نہیں سی کر دیتی کرتہ۔“ سائرہ روٹھ گئی لیکن ریشم سے بچ کر کہاں جانا تھا۔ اس

نے باجی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اتنے وحشیانہ انداز میں اسے بھینچ لیا کہ سائرہ چیخنے لگی۔



”کیا ہو رہا ہے لڑکیو.....“ باہر سے امی کی آواز آئی۔

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں امی۔“ ریشم نے بلند آواز میں جواب دیا..... اور پھر سارہ سے بولی۔ ”سی کر دیں گی نا.....“

”ہاں۔“ سارہ نے بمشکل گلو خلاصی کرائی۔

ریشم کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں بڑی جاندار چمک تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں بہنیں خوشی خوشی کرتے کاٹ رہی تھیں۔ ریشم زمانہ بھر کی باتیں کئے جا رہی تھی۔ موضوع نعیمہ کی شادی تھا۔

”ہائے اللہ..... کتنے خوبصورت لباس کیسے نفیس زیور، ڈائمنڈ کی اتنی بڑی انگلی۔“ ریشم آنکھیں پھیلا پھیلا کر باتیں کر رہی تھی۔

”تیری رال کیوں ٹپک رہی ہے؟“ سارہ نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔  
”اللہ باجی..... ہم اتنے غریب کیوں ہیں۔“ اس نے سارہ کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”خدا نہ کرے جو ہم اتنے غریب ہوں۔“ مشین پر جھکے جھکے سارہ نے اتنے پر خوب زور دے کر مانو اس کی نقل اتاری۔

”ایسی قناعت پسندی بھی.....“ ریشم نے منہ بنایا۔ بات پوری کئے بغیر وہ سارہ کو غصے سے دیکھنے لگی۔

”ریشو..... مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔“ سارہ نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

”بہت غلط باتیں سوچتی رہتی ہو۔“

”مثلاً.....“

”مثلاً یہی کہ ہم اتنے غریب کیوں ہیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کرو، لاکھوں سے اچھے

ہیں۔ اپنا گھر بار ہے۔ عزت سے رہتے ہیں، بھرم قائم ہے..... کھاتے پیتے ہیں۔ پہنتے ہیں..... وہ لوگ بھی تو ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانپنے کو پورا کپڑا بھی میسر نہیں آتا..... ان کو دیکھا کرو نا.....“

”ان کو کیوں نہ دیکھوں جن کے پاس بے اندازہ دولت ہے۔ یہ اتنی بڑی بڑی گاڑیاں، محل نما کوٹھیاں..... لباسوں کا حساب ہے نہ زیوروں کا..... پیسہ اتنا ہے کہ اس کا مصرف ہی معلوم نہیں.....“

سارہ نے تیز نظروں سے ریشم کو دیکھا..... لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ ویسے وہ اس لڑکی کے خیالات سے خائف تھی۔ یوں بھی ریشم کی اس بات کا کیا جواب دیتی۔  
”ویسے باجی۔ سچ سچ کہئے۔ آپ کا جی نہیں چاہتا کہ آپ کے پاس بھی خوبصورت سا گھر ہو..... لمبی سی گاڑی ہو..... بے شمار لباس ہوں..... اور.....“

”جی چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے.....“

”دیکھنا آپ گول کر گئیں بات۔ اسی سے تو مجھے چڑ لگتی ہے..... اور آپ پر غصہ بھی آتا ہے۔ سچ کو سچ کہنا چاہیے باجی..... مان جائیے کہ دولت بہت بڑی قوت ہے۔ اس کے بے انتہا فائدے ہیں۔ آسائشیں ہیں سہولتیں ہیں.....“

”اب اتنی دولت نہ ہو تو کیا سر پھوڑ لیا جائے۔“ سارہ نے الجھ کر کہا۔

”حاصل کرنے کی تنگ و دو کی جائے.....“ ریشم نے سوچتے ہوئے کہا۔

”دماغ ٹھکانے پہ رکھا کرو بیٹو.....“ سارہ نے اس کا سر پکڑ کر ہلاتے ہوئے

کہا.....

”کھوپڑی الٹی ہوتی جا رہی ہے تمہاری۔“

ریشم کچھ نہیں بولی۔

سارہ بھی سوچوں میں گم کرتے سینے لگی۔

ریشم لاشعوری اور شعوری طور پر بڑے اہتمام سے تیار ہو رہی تھی..... اور رنج کرتے کے ساتھ اس نے گہرے جامنی رنگ کا چوڑی دار پاجامہ پہنا تھا اور کرن لگے جامنی دوپٹے کو پلنگ پر استری کر کے پھیلا دیا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑی وہ اپنے ہجر کی سیاہ راتوں کی طرح لمبے بالوں کو بنا رہی تھی۔

سائرہ نے سبز رنگ کے وہی کپڑے پہنے تھے جو مہندی کی رات زیب تن تھے۔ گھنے بالوں کا جوڑا بنا کر اس نے موٹے موٹے کرل کانوں کے پیچھے لے جا کر ناگوں کی طرح لہرانے کو چھوڑ دیئے تھے۔ بس وہ تیار تھی۔ لیکن ریشم..... کتنی ہی دیر سے بالوں کو بنانے میں الجھی تھی۔

”ہنوبھی اب۔“ سائرہ نے آئینے میں سراپا دیکھنے کی کوشش کی۔

”اللہ..... باجی بال تو بنا لینے دیں.....“

”گھنٹہ بھر سے بال ہی نہیں بنے جناہ کے۔“

”کیسے بناؤں باجی.....“

ریشم رخ موڑ کر سائرہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ سائرہ سے بالوں کے اسٹائل کا

پوچھنے لگی۔ ”جوڑا تو ٹھیک نہیں لگے گا.....“

”کھلے چھوڑ دو.....“

”ان کپڑوں کے ساتھ۔“

”تو پھر سیدھی سادی چٹیا بنا لو..... مغل دور کی شہزادی لگو گی۔“

”اوہو..... اتنا نہ بنائیں.....“

”اللہ قسم اتنی پیاری لگ رہی ہو.....“

”آپ سے زیادہ.....“

”نہیں تو اور کیا..... یہ لباس تم پر بہت ہی اٹھا ہے..... تمہاری ٹانگیں اتنی خوب صورت ہیں۔ یہ پاجامہ تمہیں بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”واقعی۔“ وہ گھوم کر پھر اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ سائرہ کی باتوں پر کچھ کچھ یقین آنے لگا تھا۔

”سائرہ باجی..... جو تا کون سا پہنوں گی۔ اس کے ساتھ سلیم شاہی ہونا چاہیے تھا۔“

”چلو یہ چپل ہی کام دیں گے..... اتنے خوبصورت پاؤں ہیں.....“

”سائرہ باجی، آج آپ ساری خوبصورتی مجھ پر ہی کیوں مسلط کرتی جا رہی ہیں۔ میرے پیر خاک اچھے ہیں.....“

”تم تو ناشکری ہو..... کالی کلوثی، موٹے سے ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی ہوتیں تو پھر..... قد اتنا سا ہوتا جسم ایسا ہوتا۔“ سائرہ نے ہاتھ کے اشارے سے لمبائی چوڑائی بتاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

ریشم بنا بولے بالوں میں کنگھی ڈالے رہی..... سائرہ نے اسے ایک طرف کرتے ہوئے اپنے لباس، بالوں اور جسم کا آخری جائزہ لیا۔ انگلیوں سے کرل ٹھیک کئے۔ دوپٹہ کندھوں پر برابر کیا اور پھر پیچھے ہٹ گئی۔

”باجی۔“ ریشم نے بالوں کو ڈھیلی سی چٹیا کی صورت بناتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہے۔“

”میں ان کپڑوں کے ساتھ امی کا گلوبند نہ پہن لوں؟“

”پہن لو.....“

”اچھا لگے گا یا نہیں.....“

”اچھا کیوں نہ لگے گا..... بس ذرا.....“

”ذرا کیا.....“

”بیابھی ہوئی لگو گی..... لوگ سمجھیں گے دہن.....“



”او..... ہو..... لہن..... یہ تو لگتا ہے ہم بہنوں کی قسمت میں ہے ہی نہیں۔“  
”بد تمیز.....“

”سچ سارہ باجی۔“

ریشم نے چٹیا پیچھے ڈال ماتھے کے قریب سے بالوں کو ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”بڑی مایوس ہو.....“ سارہ نے مسکراتے ہوئے ریشم کے بازو میں ہلکی سی چٹکی کاٹی۔

”بالکل۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

سارہ مسکراتے لگی۔

”سارہ باجی، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میری نہ آپ کی..... کبھی شادی ہوگی ہی نہیں۔ دیکھیں نا..... آپ چوبیس سال کی ہو رہی ہیں..... ابھی دور دور تک شادی کا پتہ ہی نہیں۔ نعیہ بیس کی بھی نہیں، رفیعہ آکس کی تھی..... کامو بھائی کی منی سی لہن صرف اٹھارہ برس کی ہیں.....“ ریشم اس موضوع پر بولتی چلتی گئی۔

سارہ کے چہرے پر دھندلے سے سائے لہرانے لگے۔ ریشم حقیقت کی تلخیوں کے چہرے سامنے لانے لگی تھی..... سچی بات کہتی تھی۔ سارہ کو اس سچ کا احساس تھا..... لیکن سچ کوچ مان لینا شکست کے مترادف تھا۔ جبراً مسکرائی۔

”میرا فکر تمہیں کیوں کھائے جا رہا ہے۔ مجھے تو خیال بھی نہیں ہوتا۔ تمہیں خواہ مخواہ تکلیف کیوں ہوتی رہتی ہے.....“

”جھوٹ نہ بولیں..... مجھے چڑ لگتی ہے۔ آپ کو اچھا بھلا معلوم ہے.....“

سارہ نے بات ہی بدل ڈالی..... ”کتنا وقت اور لگے گا تیاری میں۔“

”تیاری خاک ہے.....“ ریشم جھلائی۔

”کیوں.....“ سارہ نے پوچھا۔ ”اور کیا کرنا ہے دوپٹہ لو اور چلو۔“

”اور کرنے کو کچھ ہے ہی کہاں ہمارے پاس..... کوئی میک اپ کی چیز ہی نہیں۔“

آئی لائزر ہی ہوتا.....“

”بی بنو، تمہیں ان مصنوعی چیزوں کی ضرورت نہیں.....“ سارہ نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

”فرار کا اچھا طریقہ ہے.....“ ریشم نے چوٹ کی۔ ”ویسے سارہ باجی میں کتنی اچھی لگ رہی ہوں۔ یہ پتہ وہاں جا کر لگے گا۔“  
”کہاں؟“

”جہاں بڑے بڑے اونچے طبقے کے لوگوں کا اجتماع ہوگا۔ فیشن ایبل، امیر کبیر لڑکیوں میں.....“ ریشم نے کانوں میں بندے ڈالتے ہوئے کہا۔

”چاند لگو گی چاند.....“ ریشم کی طرف بنظر تحسین دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل بھی نہیں.....“ وہ جھلائی۔ اور پھر آئینے میں اپنے کانوں میں پڑے ننھے ننھے بندوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”خدا جانے کیا بات ہے.....“

سارہ نے استفہامی نظروں سے اسے دیکھا۔

”حسن کیا چیز ہے سارہ باجی.....“

”ریشم مجسم.....“

”اوں ہوں..... حسن کوئی اور ہی شے ہے باجی..... میرے تو خیال میں دولت کے نکھار، طمانیت، آسودگی اور خوشی کو حسن کہتے ہیں..... میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب بھی ہم امیر کبیر لوگوں کی محفل میں جاتے ہیں تو ماند ماند سے نظر آتے ہیں..... وہ چیز ہمارے چہروں پر نہیں ہوتی جو.....“

”تو بہ ریشم.....“ سارہ نے عاجز آ کر اس کی بات کاٹی۔

”سچ باجی..... میں اکثر سوچتی ہوں۔ میری کلاس فیلوز ریں ہے نا.....“

”ہوں.....“

”اس کی شکل و صورت کچھ خاص نہیں..... لیکن اس کے چہرے پر طمانیت اور آسودگی کے نکھار سے جو بانکپن ہوتا ہے، وہ اسے ہم سے نمایاں کرتا رہتا ہے۔ نمونکتی خوبصورت ہے لیکن زریں کے سامنے پھکی پھکی سی دکھائی دیتی ہے..... اور وہ.....“

ریشم جانے کتنا لمبا لیکچر اور دے ڈالتی کہ محمودہ بیگم کمرے میں آ گئیں..... سفید

سادہ سے کپڑوں میں فرہی امی بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔

”تیار نہیں ہوئیں..... چلو ناب.....“ امی نے کہا۔

”بس تیار ہیں، کوئی تاگتہ وانگہ.....“ ریشم نے پوچھا۔

”ادھر چلتے ہیں، کئی گاڑیاں جا رہی ہیں۔ ہم بھی چلے جائیں گے۔“ امی نے

کہا۔

”ٹھیک ہے.....“ ریشم بولی..... ”تائنگے میں جانا تو مجھے زہر لگتا ہے خاص کر

یوں تیار ہو کر۔“

”تمہیں اچھا کیا لگتا ہے؟“ سائرہ نے چھیڑا۔

”شانداری گاڑی میں ٹھاٹھ سے بیٹھ کے جانا.....“ ریشم نے بھی چھیڑ کا جواب

شوخی سے دیا۔

محمودہ بیگم مسکرانے لگیں..... اور جب ریشم دوپٹہ اوڑھ کر اپنا سراپا آئینے میں

دیکھ رہی تھی، وہ زیر لب کہنے لگی۔ ”اللہ کرے تیرے نصیبوں میں شانداری گاڑی ہو.....“

”اس کی شادی یہ سب کچھ دیکھ کر ہی کیجئے گا۔“ سائرہ نے امی سے کہا۔ ”ورنہ یاد

رکھئے۔“

”شادی کی حامی ہی نہیں بھرے گی..... کیوں باجی؟“ ریشم نے کھلکھلا کر ہنستے

ہوئے سائرہ کے گلے میں بائیں ڈال دیں اور پیشتر اس کے کہ سائرہ کا گلا گھٹنے لگتا..... وہ

بڑی سرعت سے ان بازوؤں کی گرفت سے اپنے آپ کو نکال کر پرے ہٹ گئی۔

محمودہ بیگم مسکراتی رہی۔

”چلیے امی، ہم تیار ہیں.....“ ریشم کا موڈ بڑا ہی خوشگوار تھا۔

”چلیے نہیں محترمہ..... پہلے یہ کمرہ ٹھیک کیجئے..... کپڑے جوتے..... اور یہ

دوسری سب چیزیں پہلے قرینے سے رکھئے.....“

”سائرہ باجی پہلے کہنا تھا..... اب تو واپس آ کر ہی ٹھیک کروں گی..... کپڑے

خراب نہ ہو جائیں گے..... کیوں امی.....“

سائرہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ ریشم کا روز ہی کا معمول تھا۔ کمرے کو الٹ

پلٹ کر دیتی تھی۔ کوئی چیز سنبھالنا تو آتا ہی نہ تھا..... سائرہ کی طبیعت متضاد تھی۔ اسے الجھن سی ہوتی رہتی اور جب تک ہر چیز ٹھکانے پر نہ رکھ لیتی، اسے قرار نہ آتا۔

”آئیے امی۔“ ریشم نے امی کا ہاتھ پیار سے تھام لیا۔ ”چچی سے پتہ تو کریں۔

کوئی گاڑی لفٹ بھی دے گی یا نہیں..... سائرہ باجی آپ کمرہ ٹھیک کر کے آ جائیں.....“ وہ

ہنستے ہوئے امی کو کھینچ کر باہر لے گئی۔

سائرہ بگڑتے ہوئے پلنگ پر بکھری چیزیں اٹھانے لگی۔

یہ کمرہ دونوں بہنوں کے تصرف میں تھا..... پرانے طرز کے اونچے اونچے چوبی

دریچوں والا کمرہ جس شان و شوکت کا حامل ہوا کرتا تھا۔ وہ بات تو نہ تھی۔ پھر بھی سائرہ نے

اسے ہمیشہ سلیقے سے سنوارا تھا۔ ایک طرف دونوں بہنوں کے پرانے زمانے کے بھاری

بھاری ساگوانی پلنگ تھے۔ دیوار میں بہت بڑی الماری تھی۔ موٹی موٹی چمڑے کی سیٹوں

والی ایک تخت مناشت تھی۔ درمیان میں قالین تھا۔ برسوں کے استعمال سے اس کی رنگت

بدل چکی تھی لیکن ایرانی قالین تھا..... کہیں کہیں سے براڑ جانے کے باوجود چمک قائم تھی۔

دیواروں پر بڑے وزنی فریموں میں پینٹنگز لگی تھیں۔ زیادہ سامان دادا ابا کے وقت ہی کا

تھا..... پرانی ساخت اور پرانی طرز کا..... قیمتی بھی تھا نایاب بھی..... سائرہ اسی لیے ایک

ایک چیز کی حفاظت بڑی تندہی سے کرتی تھی۔ ریشم کو یہ پرانی چیزیں کبھی نہ من بھاتی تھیں۔

اسے تو جدید طرز کا فرنیچر اچھا لگتا تھا۔ فوم کے بیڈ من بھاتے تھے۔

چیزیں سمیٹ ساٹ کر سائرہ بھی کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

برآمدے میں ریشم امی کے بال پھر سے ٹھیک کر کے بنا رہی تھی۔ چھوٹے

چھوٹے بالوں کی پٹیا کی جگہ اس نے چھوٹا سا جوڑا بنا دیا تھا۔

تین بیڈرومز کی کونھی بینک کی طرف سے ملی ہوئی تھی۔ صغیر احمد اپنی چار بیٹیوں، اکلوتے بیٹے اور خدمت گزار بیوی کے ساتھ اس کونھی میں بڑی پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ تنخواہ بہت زیادہ نہ تھی، معقول ضرورت تھی۔ گاڑی بھی بینک کی طرف سے ملی ہوئی تھی۔ عزت سے گزر بسر ہوتی تھی۔ ایماندار آدمی تھے، ہیرا پھیری کر سکتے تھے نہ کوئی اور چکر چلا سکتے تھے۔ یہ صفات ان میں ہوتیں تو لاکھوں میں کھیل رہے ہوتے لیکن آوے کا آواہی تو ابھی نہیں بگڑا تھا..... نیک نیت، مخلص اور راضی برضار بننے والے لوگ اب بھی بہت ہیں۔

عذرا بھی اپنی گھریلو زندگی سے مطمئن تھی۔ شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال اور گھر گرہستی کے بارے میں مصروف رہتی تھی۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی..... نہ ہی جائز و ناجائز خواہشات کا بار اپنی محدود آمدنی پر ڈالتی..... بڑے سلیقے سے اخراجات سے بچتی..... لیکن حالات روز بروز بدل رہے تھے۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی۔ رسم و رواج ترقی پذیر تھے۔ چاروں بیٹیاں جوان ہو گئی تھیں۔ ان کو پالنا تو مشکل نہیں تھا، بساط سے بڑھ کر انہیں لاڈ پیار دیا تھا۔ اچھی تربیت تھی۔ طریقہ سلیقہ سکھایا تھا لیکن اب عذرا بھی کبھی کبھی پریشان ہو جاتی تھی۔ لڑکیوں کی شادیوں کا مسئلہ تھا..... عذرا کا دماغ سوچ سوچ کر ماؤف ہونے لگتا تھا..... کہ وہ جہیز کیسے بنائیں، کہاں سے بنائیں۔

بڑی بیٹی نے اس سال بی اے کا امتحان دینا تھا۔ دوسری تھرڈ ایئر میں تھی، تیسری فرسٹ ایئر میں اور چوتھی آٹھویں میں پڑھتی تھی۔

اشی نے پچھلے سال ایم اے کر لیا تھا۔ اب سی ایس پی کی تیاری کر رہا تھا..... ویسے وقتی طور پر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت بھی کر لیتی تھی۔ اور کچھ نہیں تو جب خرچ تو نکل ہی آتا تھا۔ تین چار سو روپے اس کی ضرورت سے زیادہ ہی تھے۔ بہن بھائی ان

پیسوں سے خوب عیاشی کرتے۔ کبھی سینما، کبھی ہوٹل، کبھی پکنک، کبھی پارٹی۔

عذرا کچھ کہنا چاہتی بھی تو کہہ نہ سکتیں۔ جوان بچوں پر بے جا روک ٹوک کی قائل نہ تھیں..... لیکن یہی باتیں مسلسل سوچ بن کر ذہن کو گھیرے رہتیں۔ ظاہری ٹھاٹھ باٹ تو ریسوں کے سے بن گئے تھے۔ کونھی اور موٹر سے رکھ رکھاؤ بھی شاندار ہو گیا تھا۔ میل ملاپ بھی اچھے اور..... اونچے لوگوں سے تھا۔ ظاہر داری اس وضع داری سے نبھائی جا رہی تھی کہ کوئی نہ جان پاتا کہ سفید پوشی ہی کا بھرم رکھا جا رہا ہے.....

عذرا کبھی اپنی سہیلیوں اور ملنے والیوں سے مہنگائی کے متعلق کہتی بھی تو سب اسے عاجزانہ انکساری سمجھتے۔

”تمہیں کیا فکر ہے بھئی..... مہنگائی کا اثر تو ہم جیسے لوگوں پر ہے۔ تم چاہو تو ایک ساتھ ہی سب بیٹیوں کی شادیاں کر سکتی ہو.....“

عذرا کبھی جھنجھلا کر کبھی مسکرا کر چپ ہو جاتی..... وہ اور اس کا شوہر تو شروع ہی سے اس بات کے قائل تھے کہ بچوں کو پڑھاؤ لکھاؤ، اچھی تربیت دو..... نیکی کا چلن سکھاؤ..... عزت سے رہو، اچھا کھلاؤ، اچھا پہناؤ..... اور یہی کام وہ اب تک کرتے چلے آئے تھے۔

جہیز کی صورت میں عذرا بیگم نے کچھ نہ کچھ پس انداز تو کیا تھا لیکن زمانے کے رنگ ڈھنگ دیکھ دیکھ کر طبیعت پریشان ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں مہنگائی بڑھتی جا رہی تھی، توں توں جہیز کی رسم اجاگر ہوتی جا رہی تھی۔ لوگوں کے پاس تو سیلاب کی صورت پیسہ آ رہا تھا۔ اسی لیے اس رسم کو مٹانے کی بجائے بڑھایا جا رہا تھا۔ زمانے بھر کی چیزیں سمیٹ کر جہیز میں دی جا رہی تھیں اور باقاعدہ نمائش کرا کے دی جا رہی تھیں۔

نعیمہ کی شادی عذرا کی سوچوں میں اضافے کا باعث بنی تھی۔ اتنا لمبا چوڑا جہیز دیکھ کر تو اس کی عقل دنگ رہ گئی تھی۔ سلیم اس کے رشتہ کا بھتیجا تھا۔ یہ لوگ چاہتے تو اس کے ہاں ہی رشتہ کر سکتے تھے لیکن یہاں سے شاید ایسے جہیز کی توقع نہ تھی۔ بہر حال نعیمہ اتنا کچھ لاتی تھی کہ سفید پوشوں کی آنکھیں حیرت زدہ ہو گئی تھیں۔

ماں بیٹیاں تو جب سے جہیز دیکھ کر آئی تھیں، اسی کے تذکرے کر رہی تھیں۔

”اسی جوڑے..... اور کتنے قیمتی..... پوت کی ساڑھیاں کیسی شاندار ہیں.....“

”کامدانی دوپٹے دیکھیے..... کیا جھلمل کرتے ہیں۔“

”ٹشو کا جوڑا تو ساس کو ملا.....“

”خالی جوڑا.....؟ چھ تو لے کے کڑے بھی تو ہیں.....“

”باقی سامان کون سا کم ہے۔ فریج کتنا بڑا ہے.....“

”بجلی کا سامان تو دیکھنے کے قابل ہے.....“

”ریڈیو گرام بھی ہے.....“

”زیور بہت خوبصورت ہے.....“

”اللہ تو بہ..... آج کل کے زمانہ میں سونا..... کچھ نہیں ہوگا تو پچاس تو لے تو ہوگا ہی۔“

”فرنیچر کتنا سبک اور نفیس نفیس ہے.....“

عذرانے تو پوری فہرست صغیر احمد کو بھی سنائی..... لاشعوری طور پر شاید وہ انہیں

احساس دلانا چاہتی تھی..... لیکن وہ تو سیدھے سادے مسلمان آدمی تھے۔

”یہ سب خرافات ہیں..... سلیم کے پاس کیا چیز نہیں تھی..... لوگ تو ناحق

اپنے اوپر بار ڈالتے ہیں۔ کچھ بھی نہ دیتے جب بھی سلیم کی آمدنی اور حیثیت اتنی ہے کہ

بیوی کو ٹھاٹھاٹ سے رکھ سکتا ہے.....“ انہوں نے ساری تفصیلات سننے کے بعد مسکرا

کر کہا۔

”ہم کیا کریں گے؟“ عذرانے پریشان ہو کر کہا۔

”کیوں؟“ وہ بولے۔

”جہیز کہاں سے لائیں گے۔ ہمارے تو اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے۔ یہ

چیزیں کہاں سے نہیں گی؟“ عذر ابولی۔

”کوئی ضرورت نہیں..... کچھ لوگ حماقت کریں تو ضروری نہیں کہ اس کی تقلید کی

جائے۔“

”یہ حماقت تو اب عام ہوتی جا رہی ہے۔“

”ہونے دو..... ہم اس کے قائل ہی نہیں۔“

”کہاں سے ایسے لوگ آئیں گے جو آپ کی باتوں کو مناسب سمجھیں گے۔“

”خدا مالک ہے..... فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا بیگم۔ میں ڈاکہ ڈال سکتا ہوں نہ

بینک لوٹ سکتا ہوں۔ تنخواہ ہی تنخواہ ہے۔ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو بڑی توقعات لے کر

آئے گا۔ رشتہ کرنے سے پہلے ساری باتیں واضح کر دینے کا میں سختی سے قائل ہوں۔“

اس دن باتیں بحث کی صورت اختیار کر گئیں..... عذرا بیگم نے کبھی زبان نہ کھولی

تھی لیکن اب تو کہنا ہی پڑا تھا لیکن صغیر احمد بھی تو معقول باتیں کر رہے تھے۔

رات گئے تک دونوں یونہی باتوں میں الجھے رہے..... چاروں بیچیاں بھی دیر تک

خوب صورت چیزوں کو سراہتی رہیں۔ کسی کو زیور پسند آیا، کسی کو کپڑے۔ کوئی سلائی کڑھائی

سے متاثر ہوئی تو کوئی آرائشی چیزوں سے..... ان کے کمرے کی بتی رات گئے تک جلتی

رہی۔

بتی اشی کے کمرے کی بھی جلتی رہی۔

اپنے پلنگ پر دونوں ہاتھ سر تلے رکھے وہ بستر پر چپٹ پڑا تھا۔ ڈائننگ روم سے

ملحقہ چھوٹا سا کمرہ اشی کا تھا..... ایک پلنگ، دو کرسیاں، ایک میز اور دیوار گیر الماری اس

کمرے کا اثاثہ تھا۔

ان دنوں وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اکثر رات گئے تک پڑھتا

رہتا..... جانفشانی سے محنت کر رہا تھا۔ باپ کے کندھوں پر بیٹیوں کے جو بوجھ تھے اور ماں

کے ذہن پر تشویش کے جو سائے تھے، اس سے مخفی نہ تھے۔ وہ امتحان اعلیٰ پوزیشن میں پاس

کر کے باپ کا مستحکم بازو بننا چاہتا تھا۔

لیکن آج وہ پڑھ نہیں رہا تھا..... کتاب میز پر الٹی رکھی تھی۔ سگریٹ ایش ٹرے

میں سلگ رہا تھا..... اور وہ..... نگاہیں چھت پر جمائے سوچ رہا تھا۔

اس کی سوچوں میں ریشمی لچھوں کی پھسلن تھی۔ بڑے حسین رنگوں کا امتزاج تھا۔

بڑے دل گداز تھوڑے تھے۔

سلیم سے چھیڑ چھاڑ کرتی وہ باتونی سی لڑکی شاید اسے یاد بھی نہ رہتی لیکن جانے کیا

بات تھی.. وہ لمحہ ہی حساس تھا یا اس جھرنوں جیسی مترنم آواز میں کشش ہی اتنی بھر پور تھی..

”ناچیں نا.....“ اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

اور اس نے اس آواز پر صرف ایک بھر پور نظر اس پر ڈالی تھی۔

نظر نظر سے ملی تھی..... تصادم اتنا شدید ہوا تھا کہ وہ اب تک بوکھلایا ہوا تھا..... وہ حسین ساحرہ اس کے خیالوں میں سمٹ کر پھیل رہی تھی..... اور پھیل پھیل کر سمٹ رہی تھی.....

کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لیے دل کے چوکھٹے پہلے ہی سے بنے ہوتے ہیں۔ پہلی نظر ہی میں چہرے ان چوکھٹوں میں اس طرح فٹ ہو جاتے ہیں..... کہ ان کے اکھاڑ بھینکنے یا نکال دینے کا سوال و خیال ہی نہیں آ سکتا۔ وہ کون تھی۔

اشی نہیں جانتا تھا۔

لیکن جاننے کا احساس اتنا جاندار تھا کہ اسے اس لڑکی سے صدیوں کی جان پہچان محسوس ہو رہی تھی..... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسی کی ذات کا ایک حصہ ہو..... اس کی اپنی ذات کا پرتو ہو..... اس کے خیالوں کا عکس اور اس کے تصور کا آئینہ ہو۔

وہ کتنی ہی دیر چپ پڑا رہا..... پھر کروٹیں بدلیں۔ مضطرب ہو کر سرگریٹ پھونکے۔ اٹھ کر کمرے میں ٹہلتا رہا..... اپنی عجیب و غریب ذہنی کیفیت سے جھنجھلایا..... یہ زندگی کا نیا تجربہ سرور بخش بھی تھا..... اور کوفت دہ بھی۔

نیند نہ آنے پر اس نے جھلاہٹ میں بتی بھی گل کر دی لیکن بے چین کروٹوں سے دم گھٹنے لگا۔ اس نے بتی پھر جلا دی۔

وہ اسی کے متعلق سوچتا رہا..... اس کی بے خواب آنکھیں جلنے لگیں۔

اور صبح ناشتے کی میز پر جب سب نے اس کی سرخ سرخ آنکھوں اور ادھوری نیند کی وجہ سے ستے چہرے کو دیکھا تو یہی سمجھا کہ رات زیادہ دیر تک پڑھائی میں مشغول رہا ہے۔

ماں نے بلائیں لیتے ہوئے اتنی اتنی رات پڑھنے سے باز رہنے کو کہا..... ”اتنی دیر تک نہیں جاگا کرو بیٹے۔“

شموہنی۔ ”دیکھیں گے بھائی جان کیا تیر مار لیتے ہیں۔“

”ویسے پڑھ بہت رہے ہیں۔“ چھوٹے پیار سے بھائی کو دیکھا۔ ”رات دو بجے میں غسل خانے میں گئی..... تو ان کے کمرے کی بتی روشن تھی.....“

”ابھی تو کافی وقت ہے امتحان میں..... اتنی اتنی دیر جاگو گے تو طبیعت خراب ہو جائے گی.....“ ماں نے پیار سے کہا۔

اور ان سب کی باتیں، تبصرے اور نوک جھونک سن کر صغیر احمد نے مسکرا کر عذرا کی طرف دیکھا۔

”تم ناحق فکر کرتی ہو..... جوان جہان ہے ماشاء اللہ..... اس وقت محنت کر لے۔ عمر بھر عیش بھی تو کرے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے اس عمر میں رت جکوں سے.....“

اور پھر وہ اپنی جوانی میں محنت کے قصے سنانے لگے۔

جانے کیوں۔

اشی مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔

-----○-----

بورڈ واطبقے کا اجتماع حسن و زیبائش کی نمائش تھی۔ عجیب عجیب وضع اور ہیئت کے لوگ تھے۔ عورتیں تو یوں لگتا تھا کسی فیشن پریڈ میں آئی ہوئی ہیں۔ ننگے پیٹ، ننگی کمریں، ننگے شانے، ننگی پنڈلیاں، عریانی ہی عریانی تھی۔

ہوٹل میں دعوت و لیمہ تھی۔ نیمہ کامیکہ تو اتنا فیشن اہل نہیں تھا۔ زیادہ تر متوسط طبقے ہی کے لوگ تھے لیکن سسرال والے اونچے طبقے کے لوگ تھے۔ اونچے لوگوں سے شناسائی تھی..... دولت مندوں کا شاندار اجتماع تھا۔ عورتیں مرد ایک ہی رنگ میں رنگے تھے..... ہر کوئی دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا تھا..... رنگ و نور کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔

ریشم اور سائرہ بھی اس اجتماع میں موجود تھیں۔ سائرہ تو خاموش تماشائی بنی تھی لیکن ریشم کی زبان کہاں رکتی تھی۔ پہلے تو جدید طرز کے عجیب عجیب لباس دیکھ کر ہی اسے اپنے پرانے طرز کے کپڑوں پر غصہ آیا..... پھر سائرہ باجی کا پھیکا پھیکا چہرہ کھکا۔

”کتنے مزے کی محفل ہے۔“ اس نے کہا تو سائرہ نے پیشانی پر بل ڈال لیے۔

”خاک ہے بے شرمی اور بے غیرتی کی انتہا ہے.....“

ریشم نے ہلکا سا تہقہہ لگایا..... ”آپ کے پاس جو ایسے لباس نہیں ہیں ناں..... اس لیے چڑ رہی ہیں..... اللہ قسم مجھے تو یہ سب چیزیں اتنی اچھی لگ رہی ہیں، اتنی اچھی کہ کیا بتاؤں..... ہم نے کیا فضول سے کپڑے پہن رکھے ہیں.....“

”تم تو احساس کمتری سے مر رہی جاؤ گی.....“ سائرہ جل کر بولی۔

”یہ کمپلیکس آپ کو بھی تو ہو رہا ہے۔“ ریشم نے شوخی سے کہا۔

”اللہ نہ کرے.....“

”جھوٹ.....“

”بس چپ رہو.....“

”اچھا باجی..... چلیے چپ ہی رہتے ہیں لیکن تماشا تو دیکھیں نا۔“ اور پھر وہ سائرہ کا ہاتھ پکڑے پکڑے لوگوں کے ہجوم میں کبھی ادھر نکل گئیں، کبھی ادھر..... شور شار ہنگامے اور طوفان رنگ و بو میں پھسلتی چلی گئیں۔

”اس عورت کا میک اپ دیکھیں باجی.....“

”اس کے کانوں میں دیکھیں، کیا خوبصورت چیز پڑی ہے۔“

”وہ کتنے سٹائل سے سگریٹ پی رہے ہیں.....“

”اس کو دیکھیں..... آنکھیں کتنی خوبصورت بنائی ہیں۔“

”وہ دگ والی کتنی سمارٹ ہے۔“

”وہ جوان سی لڑکی پیٹ اور ٹاپ میں کتنی نمایاں لگ رہی ہے۔“

”ادھر دیکھیں..... ادھر..... سامنے..... کیا چیز پہن رکھی ہے۔ اس نے جیمز کے اوپر بلاؤز کی بجائے ذرا سی چولی لیکن بڑی اچھی لگ رہی ہے۔ گلے میں تو ڈائمنڈ چمک رہا ہے۔“

”یہ لونگ ڈریسز بھی کتنے خوبصورت لگتے ہیں.....“

”اللہ باجی اس عورت کو دیکھیں۔ اتنی معمر ہے لیکن کتنا فیشن کیا ہوا ہے..... باجی

یہ لوگ کتنی خوشدلی سے تہقہ لگا رہے ہیں۔ ہماری امی سے تو بڑی ہوں گی، وہ چاروں

عورتیں۔ کتنا ہنس رہی ہیں..... امی بے چاری تو اتنی مسرور ہنسی کبھی ہنسی ہی نہیں.....“

ریشم باتیں کرتی کرتی گھوم رہی تھی۔ دولت کی سہولت، آسائش اور عیش کی زندہ

تصویریں دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں معتقد اور معترف ہو رہی تھی..... اپنا موازنہ لاشعوری

طور پر ان لوگوں سے کر رہی تھی اور سائرہ کے کان کھا رہی تھی..... سائرہ ان کی کئی باتوں کی

دل ہی دل میں قائل ہونے کے باوجود حسب عادت اس کی باتوں کی مخالفت کر رہی تھی۔

اور شاید دونوں بہنوں کی تکرار بڑھ جاتی..... کسی نے ریشم کے کندھے پر ہاتھ

رکھ کر کہا۔

”ہیلو..... ریشم“

ریشم میکا کی انداز میں گھوم گئی..... اور پھر مسرت سے بولی۔ ”نچھی..... تم۔“



”کیا حال ہے؟“ نجھی نے مسرت سے کہا..... اور پھر سارہ کی طرف دیکھا۔  
”میری باجی.....“ ریشم نے تعارف کرایا۔

”اور.....“ نجھی ہنسی۔

”مس نجھی.....“ ریشم نے مسکرا کر سارہ سے کہا۔ ”میری کلاس فیلو۔“

”دوست نہیں.....؟“ نجھی نے ہنس کر کہا۔

”کیوں نہیں۔“..... ریشم نجھی سے لپٹ گئی۔

پھر دونوں باتیں کرنے لگیں۔ نعیمہ ریشم کی چچا زاد تھی اور سلیم نجھی کا ماموں زاد..... باتوں باتوں میں یہ رشتے نکل آئے۔

”اور پھر تو ہم رشتہ دار ہو گئے.....“ ریشم اور نجھی ایک بار پھر مسکراتے ہوئے لپٹ گئیں۔

”آؤ تمہیں اپنی امی سے ملاؤں..... آپا سے بھی.....“ نجھی نے کہا۔

”پہلے میری امی سے مل لو..... یہ بیٹھی ہیں.....“ ریشم نے اپنی امی کی طرف اشارہ کیا جو پھوپھو عامرہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔

دونوں امی کی طرف آگئیں۔ نجھی نے مودبانہ آداب کیا۔ امی نے اسے پیار کرتے ہوئے دعادی۔

پھر دونوں ہجوم میں غائب ہو گئیں۔ نجھی باتیں کرتے ہوئے امی کو تلاش کرنے لگی۔

امی جانے کدھر تھیں۔ صغیر احمد سامنے آگئے۔

”ابو میری دوست ریشم۔“ نجھی نے تعارف کروایا۔

ریشم نے قدرے جھک کر سلام کیا۔ صغیر احمد نے تحسین بھری نظر سے ریشم کو دیکھا۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ”تم بھی نجھی کی طرح شریرتو نہیں ہو بیٹے.....“

”کچھ زیادہ ہی.....“ نجھی ہنسی۔

”ایسے ہی کہہ رہی ہے انکل.....“ ریشم بولی۔

”ابو..... اب تو ہم دونوں رشتہ دار بھی ہو گئے۔“ نجھی نے کہا۔

”وہ کیوں کر.....“ صغیر احمد اشتیاق سے بولے۔ ریشم انہیں بہت اچھی لگی تھی۔

نجھی اپنا اور ریشم کا رشتہ نعیمہ اور سلیم کے توسط سے بتلانے لگی۔

”بڑی خوشی کی بات ہے۔“ صغیر احمد بولے اور کچھ سوچ کر کہنے لگے۔ ”اپنی امی

سے تعارف کروایا ان کا.....“

”انہیں ہی ڈھونڈ رہی ہوں۔“

”ضرور ملاؤ..... وہ بیگم شاہد کے ساتھ تھیں۔ اس طرف دہن کے پاس۔“ صغیر احمد نے مغربی گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں نعیمہ عورتوں میں گھری بیٹھی تھی۔

ریشم انہیں پہلی ہی نظر میں اتنی اچھی لگی تھی..... ایسی نایاب سی محسوس ہوئی تھی..... کہ وہ لمبے فاصلے لمحوں میں پھلانگ کر کچھ اور ہی سوچنے لگے تھے۔ اپنے خوبرو بیٹے کے لیے شاید کسی ایسی ہی لڑکی کا تصور ذہن میں لیے رہتے تھے۔

نجھی اور ریشم ہاتھ میں ہاتھ دیئے ادھر چل دیں جدھر ابو نے اشارہ کیا تھا..... صغیر احمد بھی ان کے پیچھے پیچھے آگئے۔

تعارف نجھی نے کروایا..... عذرانے ریشم کے سلام کا جواب پیار سے دیا۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے.....“ صغیر احمد نے شوق سے عذر کو دیکھا۔

عذرانے نہ چاہتے ہوئے بھی تنقیدی نظروں سے ریشم کو دیکھا۔ اس تنقید میں تحسین و آفرین بھی تھی.....

ریشم واقعی قدرت کا حسین ترین شاہکار تھی۔ خوب صورت قد، موزوں اور متناسب جسم، لمبے سیاہ بال..... صندلی رنگت اور چہرے کی حسین ساخت میں قیامت برپا کر دینے والی کالی کالی روشن روشن آنکھیں۔

عذر اور صغیر احمد بڑے پیار سے اس سے باتیں کرنے لگے۔

”آپ کے امی ابو نہیں آئے.....“ عذرانے پوچھا۔

”امی آئی ہیں..... میرے ابو فوت ہو چکے ہیں۔“ ریشم نے کچھ اداسی سے کہا۔

”اوہو.....“ عذر اور صغیر نے معذرتانہ انداز میں کہا۔

”ان کی امی سے ملیں نا.....“ نجھی بولی۔

اور پھر یہ سب محمودہ بیگم کو لوگوں کے کھولتے بل کھاتے مسرور طوفان میں تلاش کرنے لگے۔

چند لمحوں بعد عذرا بیگم، صغیر احمد اور محمودہ باتوں میں مصروف تھے۔ منجھی کی کوئی چچی اسے بلا لے گئی۔ ریشم شمع بھا بھی کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

اور

پھر

دفعۃً ہی وہ سامنے آ گیا۔

ریشم کو یوں لگا جیسے کائنات کا دھڑکتا دل ایک دم تھم گیا تھا۔ شور ہنگامہ اور لوگوں کا ہجوم رہا ہی نہیں۔ سارے ماحول میں صرف وہی رہ گیا ہے۔ وہی جو..... بظاہر عام سا ایک نوجوان تھا۔ اپالو کا مجسمہ تھا نہ حسن کا مرقع۔ بس عام سا نوجوان..... لیکن عام ہوتے ہوتے بھی منفرد تھا۔ نمایاں تھا۔ کوئی الگ تھلگ سی شے تھی۔

الگ تھلگ سی شے۔

اسی لیے تو ریشم کو ہنگامہ پر در ماحول میں صرف اسی کی ذات اور شخصیت کا احساس رہ گیا تھا۔

آج بھی وہ شوق کی اسی تندی سے ریشم کو دیکھ رہا تھا۔ اس شوق میں تقدیس و تحریم بھی تھی۔

گرنگی تو ایک دم محسوس ہو جاتی ہے۔ بھوکی نظریں اتنی پروقار اور خوبصورت کبھی نہیں ہو سکتیں۔

شمع ریشم کو اپنی کسی ملنے والی سے متعارف کروانے لگی۔ ریشم کی نظروں کا طلسم ٹوٹ گیا۔

لیکن

وہ جب تک اس ہال میں رہی..... کہیں نہ کہیں سے ان پروقار اور خوبصورت نگاہوں کی زد میں آتی رہی..... ان نگاہوں کا لذت آمیز احساس اسے گدگداتا رہا..... خوشی کی لہریں سراپا میں اٹھتی رہیں۔ وہ خواہ خواہ مسکراتی رہی..... وہ یونہی ننھے ننھے قہقہے نکھیرتی رہی۔

کتنی عجیب سی بات ہے۔ جان ہوتی ہے نہ پہچان۔ رابطہ ہوتا ہے نہ واسطہ، پھر بھی اجنبی ایک دم اپنے ہو جاتے ہیں..... ریشم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ اشی سے کیا نام بنتا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا، پھر بھی اسے تو یوں لگ رہا تھا۔ اس نوجوان سے اتنی واقف ہے۔ جتنی اپنے آپ سے بھی نہیں۔

کھانے کے دوران وہ کئی دفعہ اس کے قریب آیا اور کئی بار دور چلا گیا۔ وہ اپنے حلقے میں کافی مقبول محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کوئی بلا رہا تھا۔ کبھی کوئی باتیں کر رہا تھا۔ یہاں مردوں میں گھرا کھڑا تھا۔ وہاں عورتوں کے گھیرے میں تھا۔ ادھر لڑکیاں باتوں میں لگا رہی تھیں۔ ادھر لڑکے اس کے گرد ہو رہے تھے۔ وہ کتنا ہنسوڑ، کیسا خوش مزاج اور کتنا باتونی تھا..... ریشم کی دزدیدہ نظریں سارے جائزے لیے جا رہی تھیں۔

محفل نے تو کھانے کے بعد بھی نہ جانے کتنی دیر بجے رہنا تھا لیکن امی اور ان کی چند ساتھی عورتوں نے واپس جانے کی رٹ لگا دی۔ ریشم نے چاہا بھی کہ امی رک جائیں لیکن بات نہ بنی۔ بہت سے لوگ جا رہے تھے، انہیں بھی جانا تھا۔

جانے کو کس کا فرکا دل چاہ رہا تھا۔ ایک تو ایسی جاندار محفل..... اس پر اس اجنبی کی قربت..... لیکن ریشم کو بھی واپس ہونا پڑا..... جانے کیوں وہ آج ضد کرتے ہوئے بھی ڈری۔ سب کے ساتھ وہ ہال سے باہر نکل آئی۔

”کوئی ٹیکسی نہ لے لیں۔“ سائرہ نے کہا۔

”اے واہ کیوں کسی کی موٹر میں چلے چلتے ہیں۔ سلیم سے کہتے ہیں یا سلیمی سے۔“ پھوپھی آسیہ بولی۔

اور پھر واقعی وہ موٹر کا پوچھنے سلیم کی طرف بڑھی۔ وہ مہمانوں کو رخصت کرنے کھڑا تھا۔

ریشم بے تعلق سی کھڑی تھی۔ بار بار آنکھوں کے سامنے وہی صورت گھوم رہی تھی۔ اس کی آواز کانوں میں اتر رہی تھی.....

گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ سلیم پھوپھی آسیہ کے ساتھ ادھر ہی آ گیا۔ مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ”اس گاڑی میں بیٹھے.....“



محمودہ بیگم نے سلیم کو دعا دیتے ہوئے زیادہ دیر نہ رک سکنے کی معذرت کی۔ سائرہ سلیم سے پر تکلف دعوت کی باتیں کرنے لگی..... چند لمحوں بعد سب گاڑی میں جا بیٹھے۔ امی پھوپھی اور ان کے دو بچے پیچھے بیٹھ گئے..... اور اگلی سیٹ پر سائرہ اور ریشم بیٹھ گئیں۔ ریشم کا موڈ بگھا بگھا تھا۔

”تم رہ جاتیں۔ سلیٹی چچی نے بھی تو واپس آنا ہی تھا۔“

”آپ لوگوں کو کیوں جلدی تھی۔“ ریشم جھلائی۔

”بھئی اب اتر جاؤ۔“ پھوپھی نے کہا۔

”یہ خیال ہی نہ رہا..... ابھی تو کافی لوگ وہاں ہیں۔ سلیٹی وغیرہ کے ساتھ آ جاتیں۔“ امی نے کہا۔ لیکن ریشم کچھ ابھی سی بیٹھی رہی..... گاڑی سے باہر سلیم کھڑا آنے جانے والوں سے باتیں کر رہا تھا۔

”یہ گاڑی کون لے جا رہا ہے۔“ سلیم نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا..... اور پھر کسی سے کہا۔ ”تم چھوڑ آؤ یا ر..... بس دس منٹ کی تو بات ہے.....“

گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”آپ کہہ رہے ہیں تو.....“ لیکن وہ سلیم سے بات پوری نہ کر سکا۔ برابر کی سیٹ پر ریشم بیٹھی دیکھ کر وہ جذبوں کی کشش کا قائل ہو گیا..... ریشم کے تو جیسے من کا چور سر عام پکڑا گیا۔ چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا..... اور وہ پوری قوت سے سائرہ کو کھڑکی کی طرف دھکیلنے لگی۔

اشی نے جھوم جانے کے انداز میں سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے مخمور نگاہیں ریشم پر ڈالیں۔ وہ گاڑی سٹارٹ ہی کر رہا تھا کہ سلیم بولا۔ ”رکنا اشی۔“

”کیوں؟“ وہ بولا۔

”ڈرائیور آ گیا ہے، تم آ جاؤ۔ وہ لے جائے گا۔“ سلیم نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں ہی چھوڑ آتا ہوں۔“ اس نے شوفی سے سلیم کی طرف دیکھا اور

پھر مسکراتے ہوئے گاڑی نکال کر لے گیا۔

آ کے گزر جانے والا ہوا کا جھونکا۔

یا

وقت سے پھڑک کر پہنچ سے دور ہو جانے والا۔

ہاں..... وہ یہی تھا.....

رات کا جانے کونسا پہر تھا کہ ریشم کی آنکھ کھل گئی۔ سوتے کے دیکھے خواب جاگتی آنکھوں میں ڈھل گئے۔ وہ اس کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کے متعلق جوشی تھا اور اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہ تھا..... اتنا بیگانہ اور ایسی اپنائیت، ریشم کو تو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

دو ماہ سے زائد عرصہ ہو چکا تھا لیکن یادیں مضبوط اور تناور درخت کی جڑوں کی طرح پھیلتی جا رہی تھیں۔ وہ اس کے حواس کو اپنی گرفت میں لیے جا رہا تھا۔ لاکھ کوشش کرتی، اسے بھلا دے۔ اس کے متعلق نہ سوچے لیکن ہر بات اس کے اختیار سے دور ہو رہی تھی۔

دھیمے دھیمے آنچ کے سلگاؤ تھے۔ لذت آمیز کسک تھی..... بہت کچھ پالینے کا احساس تھا۔ یوں لگتا تھا اپنی ادھوری شخصیت کی تکمیل ہو گئی۔ پھر بھلا وہ کیونکر اس کے متعلق نہ سوچتی۔ دن ہو یا رات، اس کے ذہن کے گوشے متحرک فلم بن رہتے۔

وہ بے ہنگم ساناچ..... وہ نگاہوں کا شدید تصادم..... وہ جذبہ شوق سے بھرپور نگاہیں۔ وہ پیغام دیتی ہوئی خاموش نظریں..... وہ جھوم جانے کے انداز میں گاڑی میں بیٹھا خاموش گنگناہٹوں کا ترنم، قربت کا جاں فزا احساس۔ ریشم قاتل لمحوں کے کن کن واروں سے بچتی۔

دن بھر تو وہ اکثر اپنے آپ کو الجھائے رکھتی۔ سائرہ باجی کا مغز چاٹتی رہتی۔

سہیلیوں سے زمانے بھر کی باتیں کرتی رہتی..... لیکن رات بڑی سفاک ہوتی۔ وہ اپنے آپ سے بھی چھپنے کی کوشش میں اس کے متعلق پوری بے باکی سے سوچنے لگی۔ سوتے میں وہی خواب ہوتا اور جاگتے میں خوبصورتی سے آنکھوں میں اترتا آتا۔

اس نے بڑی بے چین سی کروٹ لی۔ برابر کے پلنگ پر سائرہ سوئی ہوئی تھی۔ ریشم کا جی چاہا باجی کو جھنجھوڑ کر جگا دے، اسے بتا دے کہ وہ اشی کے متعلق کیا کیا سوچتی ہے۔ لیکن

وہ خود ہی گھبرا گئی..... یہ سوچیں..... یہ سوچیں تو بے نقاب کرنے کی نہیں تھیں..... وہ بستر سے نکلی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

گھٹن کا احساس بڑھتا ہی گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ جنوری کی بوجھل اور بخ بستہ ہوائیں اندر در آئیں لیکن وہ اپنے پتے افکار کو لیے کھڑکی میں کھڑی رہی۔ باہر ٹھٹھرا ہوا آسمان حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ کانپتے تاروں کی لوبکھری تھی۔ چاند آخری تاریخوں کے ادھورے پن کا شکار ہو کر آسمان کے سینے میں لٹکا ہوا بے جان سی چاندنی بکھیر رہا تھا.....

پرانے درختوں کے سائے بڑے مہیب تھے۔ پھول، پودے اور چمن کی ہریالی بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ بخ بستہ ہوا جب ان سے سرسراتی گزرتی تو درخت، پودے اور پھول بڑے طلسماتی انداز میں ہلنے لگتے۔

وہ کتنی ہی دیر باہر خلاؤں میں گھورتی رہی۔ سوچتی رہی..... الجھتی رہی..... فرار کا راستہ نظر آتا تھا نہ رہائی کی صورت۔ اس نے اشی کے متعلق جاننے کی کوشش بھی کی تھی۔ نعیمہ سے خوب دوستی بنا لی تھی۔ تین چار دفعہ اس کے گھر بھی ہو آئی تھی..... لیکن حرف مدعا اپنی زبان پر کیسے لاتی۔ نعیمہ سے کیسے پوچھتی، کیا بتاتی..... اسے رازدار بناتے ہوئے بھی تو ڈر لگتا تھا۔ رازدار تو اس نے سائرہ کو بھی نہیں بنایا تھا..... سب باتیں کہہ دینے کی بھی تو نہیں ہوتیں..... اور یہاں بتا دینے کو ایک نام کے سوا تھا ہی کیا۔

جھنجھلا کر ریشم نے کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں تاریکی چھائی تھی۔ اونچے روشن دانوں سے دھندلائی سی کرنیں روشنی بکھیرنے میں ناکام تھیں۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر اپنے بستر

تک آ گئی۔ دھم سے بستر میں گری تو سائرہ نے سوتے میں بیزار سی اور کوفت دینے پر ریشم کو کوس ڈالا۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔

لیکن ریشم کی بے خواب آنکھیں اندھیرے میں جانے کیا کھوجتی رہیں۔ اسے وہ واقعہ یاد آنے لگا۔ جب اشی انہیں ویسے کے دن چھوڑنے آیا تھا..... وہ کھلی آنکھوں سے تصوراتی پیکر دیکھنے لگی۔

گاڑی چلاتے ہوئے وہ کتنا مسرور تھا۔ سلیم کے کہنے کے باوجود خود ہی گاڑی لے گیا تھا۔

”کہاں جانا ہے؟“ اس نے بڑی ملائمت سے، بڑی شائستگی سے پوچھا تھا۔

ریشم کوئی جواب نہ دے پائی تھی۔ بچیلی سیٹ پر بیٹھی پھوپھی بولی تھیں۔

”مجھے تو لوئر مال جانا ہے۔ باقی سب کو میناروں والی کوٹھی..... ان کو اتار بیٹا، ذرا مجھے آگے لے جانا..... وہاں سے کہاں تا نگہ ٹیکسی لیتی پھروں گی۔“

”کوئی بات نہیں، جہاں فرمائیے گا، لے جاؤں گا۔“ وہ شستہ لہجے میں کہہ رہا تھا اور پھر گاڑی بازاروں میں سے ہوتی ہوئی مال پر آ گئی تھی۔ اس نے پہلے پھوپھی کو اتارا اور پھر باقی سب کو میناروں والی کوٹھی لے گیا۔

سائرہ یا محمودہ بیگم نے تو کوئی خیال نہیں کیا لیکن ریشم سمجھ گئی..... کہ اتنا لمبا راستہ اس نے محض قربت کے ان لمحوں کو طوالت بخشنے کے لیے کیا ہے ورنہ آسان راستہ تھا..... انہیں اتارنے کے بعد دو فرلانگ اور جا کر پھوپھی کو اتار سکتا تھا۔

پھر..... پھر جب سب گاڑی سے اتر گئے اور امی نے اس کے سلام کے جواب میں دعا دی تھی، سائرہ نے بھی شکریے کے الفاظ کہے تھے تو وہ چپ چاپ کھڑی رہ گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا تھا، کچھ نہیں بولی تھی۔

لیکن

اس کی آنکھوں نے اللہ جانے کیا کچھ کہہ دیا تھا کہ وہ لہراتے ہوئے جھوم جانے کے انداز میں گاڑی میں جا بیٹھا تھا..... اس کی نظریں کس طرح بول رہی تھیں۔

ریشم کی آنکھیں دکھ گئیں۔ دماغ تھک گیا۔ جسم ٹوٹنے لگا۔ گھبرا کر وہ رونے لگی۔

اسے کیا ہو رہا تھا، کیا ہوتا جا رہا تھا..... اس کا انجام کیا ہوگا۔ سوچ سوچ کر وہ گھبرانے لگی۔  
کیا وہ اس نوجوان سے محبت کرنے لگی تھی.....؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

لیکن خود ہی گھبرا گئی۔ جواب نفی میں نہیں تھا۔  
وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی، گھبراتی رہی۔

پھر اپنے آپ کو سنبھالا..... محبت کا بھوت ذہن سے نکال دینے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔ اپنے آپ کو طعنے دیئے..... کہ سغلی ذہن کی لڑکیوں کی طرح وہ نوجوان مرد کو دیکھ کر سمجھ گئی..... عامیانہ جذباتی اور چھپوری قسم کی لڑکی بن گئی تھی..... اتنی بے باک، ایسی نڈر ہو گئی تھی..... کہ چپکے چپکے کسی غیر مرد کے متعلق اتنا کچھ سوچتی رہتی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو خوب کوسا..... خوب برا بھلا کہا..... اشی کو بھی کوسنے دیئے..... بدوعائیں دیں.....

لیکن وہ تو کمال ڈھٹائی سے ذہن سے چپک گیا تھا۔ ساری کوششیں رائیگاں تھیں۔ سارے حربے ناکام تھے..... جب ریشم نے آنکھوں پر بازو رکھ کر سو جانے کا مصمم ارادہ کیا..... تو..... تو وہ..... وہ اپنے وجود کی ساری جاذبیت اور شخصیت کے سارے وقار کے ساتھ ان آنکھوں میں مقید ہو گیا۔

-----○-----

”امی۔“  
”ہوں۔“  
”آپ بھی سارہ باجی کی شادی کریں نا۔“  
”اللہ تیرا منہ مبارک کرے۔ شاید اب ہو ہی جائے۔“  
”سچ۔“

ریشم نے حسب عادت ماں کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر انہیں دبوچ لیا اور گال پر پیار کرتے ہوئے بولی..... ”سچ امی.....“

”امید تو بندھی ہے۔“ محمودہ بیگم نے اس کی ہاتھیں گلے سے نکالتے ہوئے کہا۔  
سارہ باورچی خانے میں تھی۔ خالد ایک ہفتے کی چھٹی آیا ہوا تھا۔ سارہ بھائی کے لیے اس کی من پسند ڈش تیار کر رہی تھی۔ سامنے ہی برآمدے میں چوبی تخت پر محمودہ بیگم بیٹھی تھیں۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ وہیں بیٹھی تسبیح کے دانے رول کر رہی تھیں۔ ریشم کی دوست کے بھائی کی شادی ہونی تھی۔ امی کو پوری روئیداد سننے کے بعد ایک ایسی کی اس نے امی سے سارہ کی شادی کا کہہ دیا تھا۔

محمودہ بھی اس موضوع پر بات کرنے والی تھیں۔ ریشم نے چھیڑا تو بتانے لگیں۔  
نعیمہ کی شادی پر ہی آسیہ پھوپھی نے ذکر کیا تھا۔ ان کی ملنے والی تھیں صفیہ بیگم جو اپنے بیٹے کے لیے رشتے دیکھ رہی تھیں۔ شادی پر پسند تو انہیں ریشم آئی تھی لیکن آسیہ نے کمال دکھایا تھا۔ سارہ کے لیے انہیں رضامند کر لیا.....

اب وہ کسی دن باقاعدہ رشتہ لے کر آنے والی تھیں۔

”کیسے لوگ ہیں.....؟“ ریشم نے ساری روئیداد سننے کے بعد کہا۔

”یہ تو دیکھنے سے ہی پتہ چلے گا۔“

”لوکا کیا کرتا ہے؟“

”کسی فرم میں ملازم ہے۔“

”انجینئر نہ ڈاکٹر..... نہ فوجی افسر.....“ ریشم نے منہ بنایا..... پھر سنجیدگی سے

بولی۔ ”تنخواہ کتنی ہے؟“

”پانچ سو.....“ محمودہ نے کہا۔

”کل.....؟“ ریشم نے اچھل کر کہا۔

”تو اور کیا پانچ ہزار ہو.....“ محمودہ چڑ گئی۔

”ضرور ہو.....“ ریشم لپٹ گئی۔

”ہونہہ۔“ محمودہ بولی۔ ”تیرا تو دماغ عرش پر ہی رہتا ہے۔“

”امی جانی..... آپ خفا کیوں ہونے لگیں..... اتنی تھوڑی آمدنی والے کے

ساتھ سارہ باجی کو بیاہ کر آپ ظلم کریں گی.....“

”تو زیادہ آمدنی والا کہاں سے لاؤں.....؟“

”لانا کہاں سے ہے، اپنے خاندان میں ہی ہیں۔ کاشف بھائی کتنے امیر ہیں۔

صلو بھیا میجر ہیں۔ ناصر انجینئر ہیں۔ ان میں سے کسی.....“

”ہم لوگوں کی راہ ہی تو دیکھ رہے ہیں.....“ محمودہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

”وہ نہیں دیکھ رہے تو آپ ہی دیکھئے..... مطلب آپ کا ہے۔ بات آپ کو کرنی

چاہیے۔ آخر کیا کمی ہے سارہ باجی میں..... صورت، شکل، اخلاق کردار..... خاندان۔ کس

سے کم ہیں۔ نیمہ باجی ہماری ہی تو چچا زاد ہیں..... ان کی اتنے اچھے گھرانے میں شادی ہو

سکتی ہے تو سارہ باجی کی کیوں نہیں..... اور پھر کاشف، صلو اور ناصر بھائی غیر تھوڑے ہی

ہیں۔“

”پڑ پڑ باتیں کئے جاؤ گی.....“ محمودہ بیگم نے اسے ٹوکا۔ ”ان لوگوں کے نام

ذہن سے نکال دے۔“

”کیوں؟.....“

”ریشم! سیدھی مت ہانکا کر.....“

”مجھے تو آپ لوگوں کی باتیں کبھی سمجھ نہ آئیں گی۔“ وہ اٹھ بیٹھی۔ ”امی

جانی..... ضرورت آپ کو ہے، اس لیے بات آپ کیجئے..... کتنے اچھے اچھے رشتے موجود

ہیں..... آخر کیوں نہ کریں گے۔ آپ پوچھ تو دیکھئے.....“

”پگلی.....“

”کیوں امی.....“

”کبھی ایسا بھی ہوا ہے.....“

”نہیں ہوا تو اب ہو جائے۔ کیا حرج ہے.....“

”خواب نہیں دیکھا کرتے بیٹی..... وہ بڑے لوگ ہیں.....“

”ہم کس سے کم ہیں..... صرف دولت ہی نہیں ہے نا ان کے برابر.....“

”یہی تو بات ہے بیٹی.....“ محمودہ بیگم نے اداس چہرے سے بیٹی کو دیکھا۔

”دولت ہی کا تو سارا چکر ہے..... نیمہ کا اتنی اچھی جگہ رشتہ ہو گیا..... اس لیے کہ ان کے پاس

دولت تھی۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارا.....“ وہ ایک دم جھجک کر رکی، پھر بولی۔

”سارہ باجی کا رشتہ اونچی جگہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

”یہاں بھی ہو جائے تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گی۔“ محمودہ بیگم نے بڑے

دکھ سے کہا..... اور تسبیح کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ریشم اٹھ کر اندر چلی گئی۔

کیا دولت اتنی اہم چیز تھی..... یہ سوال اس کے ذہن میں کلبلارہا تھا۔

دولت کی افادیت کی وہ قائل ہو گئی۔

پھوپھی آسیہ کی کوششوں سے رشتہ آ ہی گیا۔ وہ لوگ آئے۔ تین چار

عورتیں..... دو ایک مرد، دو تین بچے.....

ان کی آمد سے پہلے سارہ اور ریشم نے مل کر گھر کو خوب صاف کیا۔ ڈرائنگ روم

کی پرانی پرانی چیزوں کو بھی سنوارا..... موٹے موٹے صوفوں پر سفید چادریں ڈال

دیں..... کشنوں کے نئے غلاف چڑھائے..... پردے دھلائے۔ قالین جھاڑے، پیتل اور کانسی کے پرانے مجسموں کو صاف کیا۔

سارہ سارا کام بڑے جذبے اور لگن سے کرتی رہی..... خوشی کا احساس اس کے سراپا سے پھوٹا پڑتا تھا..... لیکن ریشم جیسے بگڑی بگڑی تھی۔ اسے یہ رشتہ سرے سے پسند ہی نہ آیا تھا۔ بھلا اس دور میں پانچ سو روپے بھی کچھ وقعت رکھتے ہیں۔

وہ بار بار سارہ اور نعیمہ کا موازنہ کرتی۔ سارہ ہر لحاظ سے نعیمہ پر فوقیت رکھتی تھی..... بلکہ دونوں کا کچھ مقابلہ ہی نہ تھا..... پھر..... صرف دولت نہ ہونے کی وجہ سے اتنا فرق آ رہا تھا۔

تیاری تو پھر بھی ریشم نے خوشی ناخوشی کے ملے جلے جذبات سے کر لی تھی لیکن جب وہ لوگ آئے تو اس کا دل بالکل ہی بجھ گیا۔

متوسط طبقے کی ان عورتوں کا اونچے اور بورژوا لوگوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا..... اسے بار بار نعیمہ کے ولیہ پر دیکھی الٹا مارا ڈرن لڑکیاں..... فربہ فربہ ہنستی مسکراتی قلقل قہقہے لگاتی عورتیں یاد آ گئیں..... انگلیوں میں چمکتی ڈائمنڈ کی موٹی موٹی انگوٹھیاں..... شاندار لباس..... بے فکری کے قہقہے..... ان لوگوں میں سارہ کا رشتہ کیوں نہ ہو پایا..... ریشم کو ذہنی کوفت ہوتی رہی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد محمودہ بیگم آسیہ پھوپھی سے سر جوڑے پروگرام بناتی رہیں۔ سارہ بھی شاکر بہ تقدیر قسم کی خوش تھی۔

لیکن ریشم سوچوں میں ڈوبی تھی۔ اگلے ہفتے لڑکے والوں کے ہاں یہ لوگ مدعو تھے..... ریشم بھی امی کے ساتھ گئی..... شہر کے ایک محلہ میں ان کا دو منزلہ مکان تھا..... جس میں لڑکے کے دو بڑے بھائی بھی مع اپنی بیوی بچوں کے رہتے تھے۔

درمیانے درجے کے معقول سے لوگ تھے لیکن معقول کا جو معیار ریشم کے ذہن میں تھا، اس کے تو قریب بھی نہ چھٹک سکتے تھے۔

وہ جتنی دیر بھی وہاں بیٹھی..... گرم صم بیٹھی رہی..... چھوٹے چھوٹے بند بند کمروں میں گھٹن تھی یا اس کے اندر ہی گھٹن کا احساس پھیل رہا تھا..... اس سے وہاں بیٹھنا

بھی دو بھر ہو گیا تھا۔

بار بار اسے نعیمہ کا گھریا یاد آ رہا تھا..... اتنی شاندار کوٹھی تھی۔ لمبی سی موٹر..... اور نوکروں کی ایک بڑی فوج..... نعیمہ تو خیر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو تھی۔ وہ ریفیہ..... کس گنتی میں تھی جسے اتنا اچھا شوہر اور ایسا بڑا گھر ملا تھا۔

گھوم پھر کر اس کا ذہن دولت کی طرف گھوم رہا تھا۔ اس کی افادیت اور اہمیت کی وہ اور زیادہ قائل ہو رہی تھی۔

قائل تو سبھی ہوتے ہیں لیکن بے باکی اور جرأت سے کسی چیز کا اعتراف کرنا ہمت کا کام ہے۔ ریشم کی سوچیں انفرادی تھیں..... اس نے کبھی دولت سے نفرت نہیں کی۔ کبھی دولت مندوں کو برا بھلا نہیں کہا۔ پیسے کی آسائش، سہولت اور آسودگی کو حقیقت مان کر اس نے ہمیشہ ان سے پیار کیا۔ دولت حاصل کرنے کے وسائل کے بارے میں اس نے اکثر غور کیا۔ الٹی باتیں بھی سوچیں، سیدھی بھی۔

رات جب محمودہ بیگم نے بات طے کر دینے کا فیصلہ ریشم اور خالد کو سنایا تو خالد نے مطمئن ہو کر صا کہہ دی لیکن ریشم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”امی آپ بھی تو کمال کرتی ہیں..... کہاں رشتہ طے کر رہی ہیں باجی کا..... مجھے تو بچ پوچھیں نہ گھر پسند آیا..... اور نہ وہ لوگ۔“

”کیوں؟“ خالد نے حیرانگی سے پوچھا۔

”بس۔“ ریشم نے جواب دیا۔

”یہ لڑکی تو بنے بنائے معاملے کو بگاڑ کر رکھ دے گی۔“ محمودہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا..... ”اللہ جانے دماغ عرش پر ہی کیوں رہتا ہے۔ اپنے حالات نہیں دیکھتی۔ خدا کا شکر ہے جو وہ لوگ مان گئے..... مجھے تو دن رات اسی کا فکر کھائے جاتا تھا.....“

محمودہ بیگم جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ ریشم منہ بنائے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ کمرے میں سارہ کے پاس راہی اور نجو بیٹھی تھیں..... ثریا آ پا بھی تھیں اور فرحت خالد بھی..... سبھی سارہ کو چھیڑ رہی تھیں اور سارہ..... لال بھسوکا چہرہ لیے ان کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو رہی تھی..... زندگی کا یہ نیا تجربہ خاصا حسین تھا۔

ریشم ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا جی کچھ اچھا نہیں تھا۔ بیزار ہو رہی تھی..... جی چاہتا تھا ہنسی مذاق کرنے والے اس ٹولے سے لڑ پڑے..... اسے تو سائرہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی خوش ہونے والا رشتہ تھا۔

”تھک گئی ہو ریشم۔“ نجو نے اسے چپ بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

”ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں.....“ رابی اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”کیسا گھربار ہے۔“

لڑکا کیسا ہے؟“

ریشم نے ناک چڑھایا..... سائرہ ہنس پڑی..... دل بجھنے کی بجائے اسے ریشم کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آ گئی..... ہنسی اس کے من کے اندر نور کی پھوار بن کر پھوٹ رہی تھی۔

”کیسے لوگ ہیں؟“ فرحت نے پوچھا۔

”بس عام سے۔“ ریشم نے جواب دیا۔

”بھئی ہم کون سے خاص ہیں.....“ رابی ہنسی..... ”کیوں سائرہ.....“

”اور کیا..... جیسے ہم ہیں، ویسے وہ.....“ سائرہ بولی..... ”رشتہ ایسا ہی اچھا ہوتا ہے۔ طبقاتی فرق سے ذہنی ہم آہنگی ہو ہی نہیں سکتی..... میں تو بھئی سچی بات ہے، خوش ہوں..... دولت ان کے پاس نہیں ہے..... لیکن.....“

”سارا معاملہ تو یہیں چو پٹ ہے۔“ ریشم نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”لو یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔“ ثریا آپا نے گال پر انگلی رکھ کر کہا۔

”بات کیوں نہیں.....“ ریشم ان کے پاس پلنگ پر آ بیٹھی۔

اور

پھر

اسی موضوع پر گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔ ثریا اور رابی سائرہ کی ہم خیال تھیں۔ نجو ریشم کی طرفدار اور فرحت بین بین۔ کبھی ایک کی دلیل کی قائل ہوتی، کبھی دوسری کی۔

”مانا کہ دولت بڑی اہم چیز ہے لیکن میں کبھی بھی نہ مانوں گی کہ زندگی کے لیے یہ بنیادی چیز ہے۔ سکون اور اطمینان اس کے بغیر ہی ملتا ہے..... میں نے بہت دیکھے ہیں امیر لوگ۔“ اور ریشم سائرہ کی اس دلیل پر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

”کیا باتیں کرتی ہیں سائرہ باجی..... میں کہتی ہوں، جھوٹ نہ بولا کریں.....“ ریشم نے کہا۔

”تو کیا امیروں کو دکھ نہیں ہوتے؟ ان کی زندگی پرسکون ہوتی ہے.....؟“ رابی نے چمک کر کہا۔ ”ریشم مت بھولو کہ بڑوں کے دکھ اور فکر بھی بڑے ہوتے ہیں۔“

”رابی میں جانتی ہوں..... لیکن ان کے غم و فکر بھی ان کی طرح شاندار قسم ہی کے ہوتے ہیں۔ دولا کھ کی جگہ ڈھائی لاکھ۔ منافع ہونا چاہیے تھا..... یہ فکر ہوتا ہے۔ چھٹیوں میں پیسے نہ جاسکے..... امریکہ کا ویزا نہ ملا..... ہانگ کانگ کی سیر کے لیے میاں نہ لے گئے۔ اس قسم کے فکر اور غم ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے رابی..... ٹاٹھ باٹھ والے لوگوں کے فکر بھی ٹھاٹھ باٹھ کے ہی ہوتے ہیں..... اور پیسے کے بغیر.....“

ریشم بولتی چلی گئی..... دل میں شائد سائرہ اور رابی قائل بھی ہوئیں۔ ثریا نے بھی اعتراف کیا لیکن بحث برائے بحث الجھتی ہی رہی۔ خوب گرما گرم باتیں ہوئیں۔

زور و شور کی بحث سن کر خالد اور محمود بھی اندر آ گئے۔ امی کے ڈانٹنے پر لڑکیاں چپ ہو گئیں۔

انہیں ضد، تکرار، بحث کبھی اچھی نہ لگی تھیں۔

-----○-----



کے بغیر ہی سہی۔“

ریشم تو قدرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس بھیڑ بھاڑ میں گھسنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ لوگوں کا مارے گھبراہٹ کے برا حال تھا..... افراتفری مچی تھی..... اندر والے شور مچا رہے تھے۔ باہر والے گلا پھاڑ رہے تھے۔ قلیوں کا ہنگامہ تھا۔ خواہجے، ریڑھی والوں کی اپنی ہی پکار تھی۔ اخبار رسالے والے جھپٹ رہے تھے..... پان سگریٹ والے موقع سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔

اسی کمپارٹمنٹ کے ساتھ اے سی کا ڈبہ لگا تھا۔

دونوں کا فرق ریشم کے ذہن میں تلاطم مچا رہا تھا۔ اے سی کے ڈبے میں شور و غل تھا نہ افراتفری۔ سفید سفید پردوں والی کھڑکیاں تھیں۔ جن کے پردے اٹھے تھے۔ ریشم ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی جو بڑے اطمینان سے موٹی موٹی نرم نرم سیٹوں میں دھنسنے بیٹھے تھے۔ کوئی اطمینان سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ کوئی مزے سے سگریٹ پی رہا تھا..... پرسکون چہروں والی عورتیں تھیں۔ خوب صورت اور صاف ستھرے چہرے والے بچے تھے۔

”کتنے مزے کا سفر تھا ان لوگوں کا.....“ ریشم نے سوچا اور پھر لوڑکلاس کی طرف اس کی نظر گئی..... دھکم پیل اب بھی تھی لیکن ریلا کچھ تھم گیا تھا۔ امی بھی ہینڈل پکڑے دروازے میں جا کھڑی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے ریشم کے لیے جگہ بناتے ہوئے وہ اسے پکار رہی تھیں۔

”جلدی کرو ریشم..... ادھر آ جاؤ..... ادھر..... جلدی جلدی..... گاڑی چھوٹنے والی ہے۔ بیک مجھے پکڑا دو..... آؤ بھی..... منہ کیا دیکھ رہی ہو..... وقت ہے ہی نہیں..... جلدی کرو۔“ محمودہ بیگم گھبراہٹ اور الجھن میں جیسے چیخ رہی تھیں۔

امی کے اس طرح شور مچانے پر ریشم کو دل ہی دل میں کتنی شرم آئی..... لیکن کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں تھا..... وہ آگے بڑھی اور کسی نہ کسی طرح جگہ بناتی گاڑی میں سوار ہو ہی گئی۔ قہر درویش برجان درویش والی بات تھی۔

کمپارٹمنٹ کے اندر تو اور بھی افراتفری تھی۔ جن لوگوں نے سیٹیں بک کر وار کھی تھیں، اپنے اپنے کنکٹ نمبر دیکھ کر پہلے سے براجمان ہونے والوں کو اٹھنے پر مجبور کر رہے

ریشم امی کے ساتھ سٹیشن پہنچی تو گاڑی سٹیشن چھوڑنے کا وسل دے رہی تھی۔ سوار ہونے اور اترنے والوں میں معرکہ پڑ رہا تھا..... پنڈی کو جانے والی ریل کار اس وقت موزوں ترین گاڑی تھی۔ ریشم کو امی کے ساتھ اسی میں سوار ہونا تھا..... کالا بڑا سائیک بمشکل اٹھائے، وہ لوگوں کے ہجوم میں گھبرائی گھبرائی اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ اسے کسی اترنے والے کا سوٹ کیس کندھے پر لگا۔ دوسری طرف سے کسی سوار ہونے والے نے دھکیلا..... ریشم کا دوپٹہ کندھے سے کھسک گیا اور دائیں ہاتھ کھڑی معمر عورت کھینچ نہ لیتی تو دوپٹہ جانے کس کس کے قدموں تلے روندنا جاتا۔ ریشم بڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی۔ دوپٹہ لے کر شکریہ بھی نہ کہہ سکی۔ کس قدر گھبراہٹ طاری تھی اس پر۔

”بڑی بھیڑ ہے آج تو.....“ محمودہ بیگم نے گھبرا کر کہا۔ ”کسی طرح سوار تو ہو جائیں۔“

”اس گاڑی میں اسی طرح رش ہوتا ہے بہن.....“ ایک عورت بولی۔ ”سیٹیں تو بک ہوں گی آپ کی۔“

”وہ کہاں۔“ محمودہ بیگم نے آگے کھسکتے ہوئے کہا۔ ”سیٹیں تو ملی نہیں۔ جانا ضروری ہے اس لیے ایسے ہی ٹکٹ لے لیے.....“

”ہفتہ ہفتہ پہلے بنگ ہو جاتی ہے۔“ دوسری عورت نے کہا۔ ”بنگ کے بغیر تو بڑی مشکل ہوتی ہے۔“

”گاڑی آرام دہ ہے..... جاتی بھی تیز ہے۔ چھوٹے سیٹینوں پر رکتی بھی نہیں..... کرایہ بھی لوڑ کا کم ہے.....“ اندر گھستے ہوئے ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔ ”بنگ

تھے۔ سیٹوں پر قبضہ جمالینے والے دستبرداری پر تیار نہ تھے۔ تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں تو دھونس دھاندلی کا مظاہرہ تھا۔ کہیں کوئی شرافت سے ادلہ بدلی کر رہا تھا۔

قلی سامان پھینک کر پیسوں کا مطالبہ کرتے ہوئے جیسے لڑ رہے تھے۔ بچے بھیڑ میں پھنسے ہوئے تھے۔ عورتیں پھنسی کھڑی تھیں۔

ریشم امی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی..... ارد گرد لوگ کھڑے تھے۔ اس نے پشت کھڑکی کی دیوار کے ساتھ لگالی۔ ڈبے پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی۔ کہیں جگہ ملنے کا امکان نہ تھا۔

”توبہ توبہ..... کیا برا حال ہے اس گاڑی میں تو.....“ محمودہ بیگم نے اپنی چادر برابر کرتے ہوئے کہا۔

”گاڑی چل پڑی..... حد ہو گئی..... اتنا رش.....“

”اس گاڑی میں نہیں۔ اس ڈبے میں کہئے امی۔“ ریشم نے کہا۔ ”برابر والے ڈبے کو دیکھئے نا۔“

”وہاں جگہ ہے؟“ امی نے پوچھا۔

”بہت۔“

”تو ادھر کیوں نہ بیٹھ گئے۔ پہلے بتائیں۔“

”وہ اے سی ہے امی..... اس کا کرایہ..... امیروں کے بس کا روگ ہے۔“

”اوہ۔“

”اتنے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں وہ سب۔ ایک یہاں ہیں کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں۔ ابھی تک لوگ لڑ جھگڑ رہے ہیں.....“

”ہمیں تو کھڑے کھڑے ہی جانا پڑے گا.....“

”آمار تو ایسے ہی ہیں.....“

”شاید کسی سٹیشن پر جگہ بن جائے.....“

”مشکل..... یہ جو سیٹوں کے درمیان لوگ کھڑے، ہمارے لیے ہی تو جگہ چھوڑیں گے۔“

گاڑی نے اپنی رفتار پکڑ لی تھی..... اڑی چلی جا رہی تھی۔ لوگ بھی اب قدرے پرسکون ہو گئے تھے..... چہروں پر ناچتا وحشیانہ پن اب ختم ہو چکا تھا۔ لڑائی میں لوگوں کے چہرے کیسے عجیب و غریب زاویے بناتے ہیں۔ اچھی بھلی شکلیں خراب ہو جاتی ہیں۔ آنکھیں ابلتی ہوئی، نتھنے پھڑکتے ہوئے، باچھیں پھیلی ہوئیں..... کرننگی ہی کرننگی نظر آتی ہے چہروں پر..... خوفناک سے ہو جاتے ہیں۔

ریشم کے ذہن میں موازنہ لہرا رہا تھا۔ اے سی میں بیٹھے لوگ سارے کے سارے خوبصورت ہی تو نہیں تھے اور اس ڈبے کے کبھی لوگ بد صورت بھی نہ تھے لیکن کتنا فرق تھا دونوں کلاسوں میں..... وہ ہمیشہ کہتی تھی حسن اطمینان، آسودگی اور خوشی کا دوسرا نام ہے۔ آج وہ اپنے اس نظریے کو تجربے کی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ کاش سائرہ باجی ساتھ ہوتی تو اپنے نظریے کی حقیقت کا اس سے اعتراف کروا سکتی..... مانتی ہی نہیں وہ اس کی باتیں..... حالانکہ ہمیشہ سچی باتیں ہی وہ کیا کرتی تھی۔

پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے کا سفر کرنا کھڑے کھڑے کتنا تو مشکل تھا۔ ریشم نے ایک لوہے کے صندوق پر امی کو بٹھا دیا..... اس پر بھی پہلے سے لوگ قابض تھے لیکن ریشم نے ملائمت سے امی کے لیے سفارش کی تو جگہ مل گئی۔

وہ خود ٹیک لگا کر امی کے قریب کھڑی ہو گئی۔

کبھی وہ دروازے سے باہر نظریں جمادیتی۔ تیزی سے الٹی سمت دوڑتے بھاگتے مناظر دلچسپی کا باعث تھے..... کھیت، پودے، جانور سبھی جیسے الٹی سمت دوڑے جا رہے تھے۔

اور

کبھی وہ طائرانہ سی نظر ڈبے میں براجمان لوگوں پر ڈالتی..... سیٹوں پر بیٹھے لوگ گاڑی کی تیز رفتاری سے دھیرے دھیرے اچھلتے بڑے مضحکہ خیز لگتے تھے۔ دائیں بائیں جھومتے بھی لگ رہے تھے۔

چہرے پر خوشگوار تاثر لیے وہ ایک موٹی توند والے آدمی کو دیکھ رہی تھی جس کا پیٹ الگ چھلک رہا تھا اور جسم الگ۔ گاڑی سے جیسے لوری مل رہی تھی۔ وہ اونگھ رہا تھا..... نیند کا



جھونکا شدید ہوتا تو اس کا سر دوسرے ساتھی کے کندھے پر جا لگتا..... اور جب وہ بڑا کر سر کو اٹھاتے ہوئے جھٹکتا تو ریشم کے لب متبسم ہو جاتے۔

وقت گزاری کو بڑا ہی دلچسپ مشغلہ تھا اور شاید ریشم کا تبسم قہقہہ بن جاتا لیکن اس کی نظریں برابر والی سیٹ کی طرف ہو گئیں۔ کوئی عورت اسے ہاتھ کے اشارے سے بلارہی تھی۔ چہرہ مانوس تھا لیکن ریشم ایک دم نہ پہچان سکی۔ وہ برابر مسکراتے ہوئے اسے اپنی طرف بلارہی تھی۔

ریشم امی کو کہہ کر جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھی۔ سیٹ تک پہنچنے میں خاصی دشواری تھی۔ بہر حال وہ پہنچ گئی۔

بلانے والی چوبیس پچیس سالہ خاتون تھی..... اس نے ایک طرف کھسکتے ہوئے ریشم کے لیے جگہ بنائی..... ”تم ریشم ہی ہونا، سائرہ کی بہن.....“

”جی۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”مجھے پہچانا نہیں.....“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی آپ.....“ ریشم ہچکچائی۔ غور سے اسے دیکھا۔ ذہن میں ایک دم ہی اس کا

نام آ گیا۔ ”آپ عائشہ باجی نہیں ہیں.....؟“

وہ مسکرائی..... ”پہچان لیا؟“

”لیکن آپ.....“

”بہت بدل گئی ہوں..... میں نا، یہی کہنا چاہتی ہو۔“

”جی.....“

”بس دیکھ لو.....“

ریشم حیران حیران اسے دیکھنے لگی۔

عائشہ سائرہ کی سہیلی تھی۔ خوب گوری چٹی۔ تکیے نقش و نگار والی سارٹ سی لڑکی۔ پانچ سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کا ہنگامہ ریشم کو خوب اچھی طرح یاد تھا..... عائشہ کے والدین اس کی شادی پر رضامند نہ تھے۔ عائشہ کی پسند کا معاملہ تھا۔ والدین نے بڑا سر پٹھا۔ بہتیرا سمجھایا..... سہیلیوں سے کہلوا یا۔ حتیٰ کہ منت سماجت بھی کی

لیکن عائشہ کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔ محبت کی فردوسی رعنائیوں میں گم تھی۔ گرد و پیش کا ہوش ہی نہ تھا۔ ریشم کو یاد تھا کہ سائرہ نے بھی اس کے والدین کے ایما پر اسے سمجھانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس کی امی نے بھی کوشش کی تھی۔ زندگی کی حقیقت تسلیم کروانا چاہی تھی لیکن دل کے معاملے بھلا تجربے کی آنکھوں سے کہاں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لڑکے میں بے شک کوئی برائی نہ تھی لیکن خلیق اور عائشہ کا جو طبقاتی فرق تھا، جہاندیدہ نظریں دیکھ سکتی تھیں۔ عائشہ کے والدین خاصے امیر تھے لیکن خلیق کی مالی حیثیت مستحکم نہ تھی۔ اس پر بھرے پرے خاندان کا بوجھ..... پیٹ کا دوزخ محبت کی پھلوا ری کو بھی بھسم کر ڈالتا ہے۔ دور رس نظریں اسی لیے تو مخالفت پر اتر آئی تھیں۔

لیکن جوانی کی ہٹ کے سامنے بزرگی نے جھکنا قبول کر لیا تھا۔ شادی ہو گئی تھی..... مجبوری تھی ورنہ اکھڑا اور نا سمجھ جوانی خدا جانے کیا نادانی کر بیٹھتی۔

لیکن

اب وہی عائشہ جو سارٹ اور دلکش سی لڑکی تھی، اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی لگ رہی تھی۔ چہرہ نکھرا ہوا بالکل نہیں تھا۔ آنکھوں کے گرد نہ معلوم سے حلقے تھے اور سرخ و سفید رنگت دھندلائی ہوئی تھی۔ گالوں پر کالے کالے پھیلے پھیلے داغ نمایاں تو نہیں تھے، پھر بھی دکھائی دے رہے تھے..... چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ دو ماہ کی بچی گود میں تھی اور چھوٹے چھوٹے تینوں بچے کندھوں، بغلوں اور گھٹنوں پر کبھی گر رہے تھے، کبھی چڑھ اتر رہے تھے۔ کبھی شور مچا رہے تھے اور کبھی رونے کا کورس کر رہے تھے۔ بے چاری سٹپٹائی ہوئی تھی۔

”سائرہ کی شادی تو نہیں ہوئی ابھی؟“ اس نے بچی کو پھسکتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں.....“

”اچھا ہی ہے۔ ان جنجالوں میں تو نہیں پڑی ابھی..... میں تو سخت پشیمان

ہوں.....“

”نہیں باجی..... یوں تو نہ کہئے۔“

”دیکھ لو میرا حال..... ساری مصیبتیں عورت ہی کے لیے ہوتی ہیں۔ بچے بھی پیدا

کرو۔ سنبھالو بھی۔ گھر بار کی دیکھ بھال بھی کرو، سسرال والوں کے قدموں میں بھی

رہو..... خاوند کی خدمت گزاری بھی کرو.....“

عائشہ بڑے بچھے بچھے لہجے اور اداس آواز میں بات کرنے لگی۔ ریشم کو اس کی روئیدار سن کر دکھ ہونے لگا۔ آمدنی کم بچے زیادہ..... گھرداری..... بڑے سے کہنے کے اخراجات..... بیچاری خدا جانے کیسے گزر کر رہی تھی۔ ماں باپ سے بھی تو کھل کر نہ مانگ سکتی تھی۔ خود کردہ راعلاج نیست والی بات تھی۔

”بھائی جان آپ کا خیال نہیں رکھتے.....“ ریشم کو دکھ ہوا تھا..... وہ پوچھ بیٹھی۔

”خیال کیا رکھیں۔ الجھنیں اور مسئلے تھوڑے پال رکھے ہیں انہوں نے..... عشق و شوق شادی تک ہی ہوتا ہے۔ شادی کے بعد عام زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ قدموں میں آسمانوں کی وسعتیں اور بلندیاں جھکا کر رکھ دینے والا محبوب جب شوہر بن جاتا ہے تو اس کی انا اور وقار کچھ زیادہ محبوب ہو جاتے ہیں..... ہونہہ.....“ عائشہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔

ریشم اس کا منہ تک رہی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ادھیڑ عمر عورت بھی عائشہ کی باتوں کی تائید کرنے لگی لیکن کھڑکی سے لگی بیٹھی نوجوان لڑکی بے حد جذباتی انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کے دلائل سے وہ قطعاً مرعوب نہ تھی۔

”عشق و محبت جوانی کی نادانی کا دوسرا نام ہے۔“ عائشہ تلخ لہجے میں بولی۔

”زندگی میں تلخیاں زیادہ ہی ہوتی ہیں لیکن محبت کے جنون میں سوائے محبوب کے ہم کسی اور چیز کے متعلق نہیں سوچتے..... سنہری سپنے بنتے رہتے ہیں۔ فردوسی رعنائیوں میں گم رہتے ہیں۔ حالانکہ زندگی ایک حقیقت ہے اور حقیقت تلخیوں، ترشیوں اور شیرینیوں کا مجموعہ ہے۔ تلخیاں، ترشیاں زیادہ اور شیرینی کم.....“

عائشہ بولے جا رہی تھی۔ دکھ کی تیز دھار ریشم کو اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا بھائی جان آپ کو اب اس طرح نہیں چاہتے.....“ ریشم نے جذباتی ہو کر دھیمے لہجے میں کہا۔

”ریشم..... تم نہیں سمجھ سکتیں۔ چاہت کا جو تصور شادی سے پہلے لڑکی کے ذہن میں ہوتا ہے۔ وہ بعد میں نہیں مل سکتا۔ مجبوریاں..... دشواریاں..... رشتے ناٹے..... مسائل

الجھنیں بہت کچھ پیدا ہو جاتا ہے۔ تصوراتی خاکے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ عملی زندگی میں ان تصوراتی خاکوں کی کوئی جگہ نہیں ہوتی.....“

”بات یہ ہے بیٹی کہ.....“ وہ معمر عورت بولی۔ ”لڑکی اپنے انہی تصوراتی خاکوں کی عملی شکل دیکھنا چاہتی ہے..... جب نہیں مل سکتی تو خلاء پیدا ہو جاتا ہے۔ مزاج میں خلفشار اور ذہن میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں لڑکی کے لیے حالات سے مصالحت کرنا دشوار ہو جاتا ہے..... مرد اس معاملے میں اگر عورت کا معاون رہے تو صورتحال اتنی نہیں بگڑتی۔ لیکن عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مرد کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے..... وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں اس سے برتر ہوں..... اس برتری کو تقویت اس چیز سے بھی ملتی ہے کہ لڑکی ہر مخالفت کے باوجود اسے اپنا چکی ہوتی ہے..... اس لیے اپنے کچی کرچی خوابوں اور ٹوٹے پھوٹے تصورات کا دکھ عورت کو اکیلے ہی سہنا پڑتا ہے۔ انتہا تو ہے..... کہ مرد اس دکھ کے سہنے کو بھی برداشت نہیں کر سکتا..... تو تو میں میں کی اسی لیے تو نوبت آتی ہے.....“

”میں تو دبائی دوں گی کہ کوئی پسند کی شادی نہ کرے۔“ عائشہ نے زہرناک سی مسکراہٹ سے کہا۔

”تو گویا آپ محبت کی قائل ہی نہیں۔“ نوجوان لڑکی نے تیزی سے کہا۔ ”محبت کوئی چیز نہ ہوئی۔“

”محبت ضرور ہے لیکن میں تو یہ کہتی ہوں کہ محبت ہو تو شادی نہ کی جائے۔“ عائشہ نے جلے دل سے کہا۔ ”اسے ستاؤ اور پرستش تک ہی رہنا چاہیے۔“

”ضروری نہیں، میں نے محبت کی بڑی کامیاب شادیاں دیکھی ہیں.....“ وہ لڑکی چمک کر بولی۔ ”میرے کزن کی محبت کی شادی ہوئی تھی۔ سات آٹھ سال ہو گئے بیوی کو، اب بھی محبوبہ ہی سمجھتے ہیں۔“

”ناممکن۔“ عائشہ نے کہا۔ ”محبوبہ بیوی بن جائے تو مرد بھی شوہر بن جاتا ہے اور شوہر چاہے آج کا ہو یا صدیوں پہلے کا، اپنی ذات میں سوائے برتری کے احساس کو ختم نہیں کر سکتا۔“

گر ماگرم بحث ہو رہی تھی..... اگلی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے لوگ بھی کچھ کچھ دلچسپی

لیتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

جہلم کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو بحث بھی رک گئی۔ پھر مسافروں میں ہلچل مچ گئی..... ایک سواری اترنے سے امی کو بھی برابر والی سیٹ مل گئی۔

باقی راستہ امی اور عائشہ کی باتوں میں کٹا۔

ریشم چپ ہی رہی..... لیکن اس چپ کے در پردہ بڑی بے چین ہلچل تھی۔



گاڑیوں، ٹیکسیوں، رکشوں اور تانگوں کی گتھم گتھا قطاریں بہت دور تک چلی گئی تھیں..... پھانک بند تھا۔ گاڑی گزرنے والی تھی لیکن آج جانے کیا بات ہو گئی۔ گاڑی آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ لیول کراسنگ کی اس مصیبت کو کوسٹے لوگ بیزار ہو رہے تھے۔

دس بج چکے تھے۔ پنڈی کی فضا میں بڑے نکھرے ہوئے دن نے آنکھ کھولی تھی۔ مارچ کا آغاز تھا..... سبزہ، ہریالی اور پھولوں کے رنگ و بودل فریب تھے۔ نیلے آسمان پر بے داغ آفتاب چمک رہا تھا۔ گاڑی گزرنے کے انتظار میں رکنے والوں میں اشی بھی تھا۔ چار دن پہلے وہ اپنے کسی انٹرویو کے سلسلے میں اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ آج واپس گھر جا رہا تھا..... کسی دوست کی گاڑی لایا ہوا تھا۔ آج شام واپس پہنچنا تھا۔ وہ جلد واپس پہنچنا چاہتا تھا لیکن پہلے ہی مرحلے پر یوں رکنا بیزار کن تھا۔

وہ گاڑی سے نکل کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ گاڑیوں، ٹیکسیوں اور رکشوں کی قطار میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں سے تواب واپس مڑنا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ درخت تلے کھڑے ہو کر اس نے اس لمبی قطار پر نظر ڈالی۔

..... جیسے نظریں انک ہی گئیں۔

خوشی کی ایک لہر اس کے سراپا میں برقی رو کی طرح دوڑ گئی..... بے اختیارانہ وہ ادھر کھنچا۔ تیسری قطار کی پانچویں ٹیکسی میں اسے وہ چہرہ نظر آ گیا تھا جسے دیکھنے کی تڑپ اس کی زندگی کا نصب العین بن چکی تھی لیکن جسے دیکھ لینے کا یقین اسے رہا ہی نہ تھا۔ تین ماہ گزر چکے تھے۔ کوشش بسیار کے باوجود وہ اسے دیکھ نہ پایا تھا۔

کسی مقناطیسی کشش کے تحت وہ ٹیکسیوں، رکشوں کے آگے پیچھے ہوتا ادھر آ گیا۔ ٹیکسی میں وہی لڑکی تھی۔ برابر میں اس کی امی بیٹھی تھی۔

اشی کو یوں لگا جیسے گھور اندھیروں میں مہتاب کی نورانی کرنیں پھوٹ پڑی ہوں..... راہوں کی بھول بھلیوں سے نکل کر ایک دم سیدھے ساٹ راستے پر آ گیا ہو..... کئی لمحے تو اسے اپنی بصارت پر بھی یقین نہ آیا۔

بار بار دیکھا۔

غور سے دیکھا۔

اسے پہچان لینا کیا مشکل تھا..... وہ تو اس کے ذہن کا سب سے اجاگر نقش تھا۔ دیکھ تو غور سے اس لیے رہا تھا کہ اتنے خوبصورت اتفاق سے آنکھوں کو یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ اس نے پیازی رنگ کے سادہ سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دوپٹہ کندھوں سے پھسلتا ہوا سینے تک آ گیا تھا..... موسم بہار کے کسی شگفتہ پھول سے بھی زیادہ تازہ دم نظر آ رہی تھی..... امی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

اشی ٹیکسی کے قریب آ گیا۔

اس نے جانے کسی بات پر تہقہہ لگایا لیکن تہقہہ ادھورا ہی رہ گیا۔ کھڑکی میں جھکتے ہوئے اشی کو دیکھ کر وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

”آپ.....“ اس کے منہ سے صرف یہی نکلا۔

”کون.....“ برابر بیٹھی محمودہ بیگم نے پوچھا لیکن استفسار کا جواب پانے سے پہلے ہی اشی نے انہیں سلام کیا۔

محمودہ بیگم کو صورت تو مانوس سی لگی لیکن ایک دم پہچان نہ سکیں اور ان کے چہرے کے اجنبی تاثرات دیکھتے ہوئے اشی نے خود ہی وضاحت کر دی۔ ”میں سلیم کا پھوپھی زاد ہوں..... آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں..... ویسے کے دن میں آپ کو گھر چھوڑنے گیا تھا۔“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

”اچھا اچھا..... ہاں.....“ محمودہ بیگم اپنا نیت سے مسکرائیں۔ ”اب یاد آیا۔“ اور پھر قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ ”یہاں کیسے آئے.....؟“

”میرا انٹرویو تھا.....“ اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

پرے بیٹھی ریشم کا دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ صندلی رنگت گرمائی جا رہی

تھی۔ حسین آنکھوں کے سیاہ اندھیرے چمک اٹھے تھے۔

”آپ کب آئیں پنڈی.....“ اس نے محمودہ بیگم کے ہوں کہنے پر پوچھا۔

”تین دن رہ کر آج واپس جا رہے ہیں۔“

”لاہور؟“

”ہاں۔ یہ موپھانک بند ہے۔ کہیں ہماری گاڑی ہی نہ چھوٹ جائے۔“

”آپ ٹرین سے جا رہی ہیں.....؟“

”یہ جو ساڑھے دس جاتی ہے۔ اسی پر جانا ہے..... ادھر پھانک ہے کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہا..... گاڑی سے رہ گئے تو مشکل ہو جائے گی.....“

”میں لاہور ہی جا رہا ہوں۔“ اشی نے بڑے پرامید انداز میں قدرے جھکتے ہوئے کہا۔ ریشم نے ایک لمحہ کو اس کی طرف دیکھا۔ نگاہوں میں طوفان شوق لیے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”اسی گاڑی سے؟“ محمودہ بیگم نے پوچھا۔

”جی موٹر میں.....“ اشی نے جواب دیا۔

اور

پھر لمحاتی کشمکش کے بعد جھجک پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”گاڑی خالی ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں..... ٹرین سے پہلے پہنچ جائیں گے.....“

محمودہ بیگم ہچکچائیں اور ریشم کا تو جانو دل ہی تھم گیا۔

وہ بڑی محبت سے اصرار کرنے لگا۔

”کیوں ریشم؟“ امی نے بیٹی کی طرف دیکھا۔

اور اشی کے لبوں پر بڑی خوبصورتی سے لفظ ریشم پھیل گیا۔ اس نے سر قدرے جھکاتے ہوئے بڑے غور سے اس لڑکی کو دیکھا جس کا نام اپنے وجود ہی کی طرح تھا۔ بعض لوگ

نام رکھنے کے معاملے میں کتنے صداقت پسند ہوتے ہیں..... اشی کو یہی احساس ہو رہا تھا۔

ماں بیٹی میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ اشی کچھ نہیں بولا۔ نگاہوں کی دعوت بھلا بے اثر

ہو سکتی تھی؟

”ناحق تکلیف دینے والی بات ہے بیٹے۔“ محمودہ بیگم رضا مندی کا اظہار ڈھکے چھپے انداز میں کرنے لگیں۔

”تکلیف کس بات کی خالہ جان..... گاڑی تو ویسے بھی جارہی ہے۔ آپ لوگ ساتھ ہوں گے تو راستہ اچھا کٹ جائے گا۔ میں اکیلے میں بہت بور ہو رہا تھا..... آئیے.....“

اس نے ریشم کی طرف ملتجیانہ دیکھا۔

ریشم خوشی کے پھوٹتے سوتے لبوں میں دبائے کچھ لبائی۔

”چلو پھر.....“ محمودہ بیگم نے اس سے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے امی کو اترنے کا اشارہ کیا۔  
اشی کی خوشیاں بیکٹے لگیں۔

جلدی جلدی اس نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا۔ پھر محمودہ بیگم کا سوٹ کیس اٹھایا اور اپنی گاڑی کی طرف سے تیزی سے چل پڑا..... جگہ بناتے ہوئے ریشم اور محمودہ اس طرف آگئیں۔

اشی نے سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے فرنٹ سیٹ کا دروازہ محمودہ بیگم کے لیے کھول دیا..... ان کے بیٹھنے کے بعد اشی نے پچھلی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے ریشم کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی۔

”کتنا حسین اتفاق ہے۔“ اشی نے شوخی سے سرگوشی کی۔ ریشم کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک پھیل گئی۔ وہ ٹرین کے انتظار میں باہر ہی کھڑا رہا..... وہ کتنا خوش تھا۔ اس کی بہکی بہکی حرکات اس خوشی کی آئینہ دار تھیں۔

ٹرین گزرنے کے بعد ٹریفک کھل گئی۔ اشی اپنی سیٹ پر آ بیٹھا..... گاڑیاں رینگنے لگیں، وہ بھی رینگنے والوں کی قطار میں شامل تھا۔

محمودہ بیگم خوب باتیں کرتی رہیں..... اشی کا حسب نسب، اس کا خاندان۔ اس کے ننھیال ددھیال سبھی کا پوچھتی رہیں اور پھر خوشی تو انہیں اس بات سے ہوئی کہ ان کے میکے سے بھی اشی کی نانی کی قریبی رشتہ داری نکل آئی..... محمودہ بیگم رشتے ناطے ملانے لگیں۔

ریشم کو بھی خوشی خوشی بتایا اور اشی کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ”پھر اپنے ہی بچے ہو۔“

”جی بالکل بالکل۔ آپ ایسا سمجھتی ہیں..... میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور بہانے بہانے رخ موڑ کر ریشم کو بھی دیکھ لیا..... ریشم کے گال تپتے لگے۔

گاڑی جی ٹی روڈ پر اڑی جا رہی تھی۔ محمودہ بیگم کی باتوں کا سناک جیسے ختم ہو گیا تھا۔ چپ چاپ سامنے شیشے پر نظریں جمائے وہ بیٹھی رہیں۔ کبھی کبھی کوئی بات کر لیتیں۔ دو گھنٹے کا سفر بھی طے نہ ہوا تھا کہ محمودہ بیگم کی طبیعت خراب ہونے لگی۔

”بیٹا روکنا ذرا..... میرا تو دل خراب ہو رہا ہے۔ ہمیشہ پٹرول سے میرا جی خراب ہو جاتا ہے۔ چکر محسوس ہو رہے ہیں.....“

سڑک کنارے اشی نے گاڑی روک دی۔ جہلم کا پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ محمودہ بیگم ایک پتھر پر جا بیٹھیں۔

”آپ باہر نہیں آئیں گی۔“ اشی نے ریشم سے پوچھا۔  
اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اشی اگلی سیٹ پر دروازہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ریشم سے باتیں کرنے کو اس کا جی چل رہا تھا۔

”آپ چپ کیوں ہیں.....؟“  
ریشم اداۓ دلربائی سے مسکرا کر رہ گئی..... اس کی آنکھوں میں بڑی حسین چمک تھی۔  
”آپ کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان نکل گیا تھا..... اشی نے ریشم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”جی؟“ حیرت زدہ سی وہ آنکھیں پھیلائے دیکھنے لگی۔  
اشی ریشم کی حسین آنکھوں کی ساری وحشتیں آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے بولا۔ ”ریشم..... میں نے آپ کو کتنا تلاش کیا.....“

”جی۔“ وہ ششدر رہ گئی۔  
”بے وقوفوں کی طرح ڈھونڈتا پھرا.....“ وہ سرمئی سڑک کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ریشم کا دل تو جیسے تھم جانے کو تھا۔ کتنی بے تکلفی اور کیسی بے باکی سے وہ باتیں کر رہا تھا۔  
 ”بالکل احمقوں کی طرح ڈھونڈتا پھرا۔ سڑکوں پر دیکھا۔ بازاروں میں ڈھونڈا۔  
 کالجوں کے چکر کاٹے۔ کتنی ہی دفعہ نغمہ بھابی کے ہاں گیا۔۔۔۔۔ آج۔۔۔۔۔ آپ اتفاقاً مل گئیں۔۔۔۔۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ اس خوشی سے میں مر ہی نہ جاؤں۔۔۔۔۔“ اس نے دروازے کو تھامے نظریں دور سے آنے والے ٹرک پر جمائے جمائے کہا۔  
 ریشم کے ہاتھ پاؤں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ دل تھا کہ تھم جانے کو دھڑک رہا تھا۔۔۔۔۔ آنکھیں اس کے بے باک اظہار پر پھٹ جانے کی حد تک کھل گئی تھیں۔  
 ”میں اپنی خوش بختی پر نازاں ہوں ریشم۔۔۔۔۔“ وہ پھر اسی انداز میں کھڑے کھڑے بولا۔

ریشم پر گھبراہٹ بے شک مسلط تھی لیکن ایک انجانی سی خوشی رگ و پے میں لہریں لے رہی تھی۔

تو

کیا؟

وہ بھی اس کی طرح مہینوں سے انتظار کے جان لیوا عذاب سے دوچار تھا۔  
 اشی شاید کچھ اور کہنے کو تھا۔

کہ ریشم نے محمودہ بیگم کی طرف دیکھا۔ ”امی جانی اب آ بھی جائیے۔۔۔۔۔“  
 ”بڑی ظالم ہیں آپ۔۔۔۔۔“ اشی نے جلدی سے کہا۔ اور پھر محمودہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”خالہ جان کچھ ٹھیک ہوئی طبیعت؟“  
 ”ہاں چکر تو اب نہیں آ رہے لیکن جی متلا رہا ہے۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولیں۔

”ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔ تازہ ہوا آپ کے لیے مفید ہے۔“ وہ بولا۔

”تمہیں دیر تو نہ ہو جائے گی۔۔۔۔۔“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں خالہ جان۔۔۔۔۔ گھنٹہ لیٹ ہو گئے۔۔۔۔۔ تو کیا فرق پڑ جائے گا۔۔۔۔۔“ وہ مسکرایا اور پھر اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کھلے دروازے پر جھک کر ریشم کی طرف نیم وا آنکھوں سے

دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جی تو چاہتا ہے عمر یہیں تمام ہو جائے۔۔۔۔۔ کس کافر کا دل یہاں سے ملنے کو چاہ رہا ہے۔“

ریشم حیار بار نظروں کو گراتے اٹھاتے پلکوں کی چلن سے اسے دیکھ کر مسکرا دی۔  
 ”اچھا بھئی، سیدھی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔“ اشی اپنی گھڑی سے کھیلنے لگا۔  
 ”ہوں ٹھیک۔۔۔۔۔“ ریشم کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر بولا۔  
 ”صرف مسکرانے سے کام نہیں چلے گا۔ باتیں بھی تو کیجئے۔۔۔۔۔“ وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

”اچھا یہ بتائیں آپ پنڈی کہاں آئی تھیں۔۔۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”ماموں جان کے ہاں۔۔۔۔۔“ ریشم نے سادگی سے جواب دیا۔  
 ”میرا انٹرویو کے سلسلے میں آنا ہوا۔۔۔۔۔ کل فارغ ہو گیا تھا۔ سوچتا ہوں کل ہی چلا جاتا تو کتنی بد نصیبی ہوتی۔۔۔۔۔“ وہ بڑی مخمور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
 ریشم نے گھبرا کر پہلو بدلا۔

”میں مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔۔۔۔۔ ”لیکن پاس ہونے کی امید کم ہی نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے یہ انٹرویو دے دیا۔۔۔۔۔“  
 وہ چپ رہی۔

”ریشم۔۔۔۔۔ اگر میں فیل ہو گیا تو سارا الزام آپ کے سر ہوگا۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”جی۔۔۔۔۔؟“ ریشم حیرت زدہ تھی۔  
 ”اونچا سنتی ہیں یا سمجھ نہیں پاتیں۔۔۔۔۔ میں فیل ہو گیا تو سارا الزام آپ پر ہوگا۔۔۔۔۔ سن رہی ہیں آپ۔۔۔۔۔“

”مجھ پر؟“

”جی، آپ پر۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ اس کی ذمہ دار ہیں۔“



”وہ کس طرح۔“

”اس طرح کہ آپ نے میرا چین حرام کر دیا تھا۔ میں ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا۔ جب کتاب لے کر بیٹھتا..... آپ بڑی بے باکی سے سامنے آ بیٹھتیں..... آپ ہی سے باتیں کرتا رہتا۔ پڑھائی خاک بھی نہ ہوتی.....“

ریشم بڑے حسین انداز سے مسکرا دی۔

وہ گھبرائی گھبرائی حسین مسکراہٹ کے قاتل وار سے بچ نہ سکا۔ دل تھام کر رہ گیا..... پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا..... اور پھر رخ موڑتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔ ”آپ نے بھی میرے متعلق کبھی سوچا؟“

ریشم کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے دل میں چھپے چور کو اس نے چھاپہ مار کر اچانک پکڑ لیا ہو۔

بڑی بے چارگی سے اس نے اشی کو دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں..... اپنے دونوں ہاتھوں کو وہ اضطرابی کے عالم میں مسل رہی تھی۔

اشی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سامنے والے آئینے میں ریشم کے عکس کو دیکھتے ہوئے اصرار سے بولا۔ ”بتائیے نا.....؟“

آئینے میں ریشم کی سحر کار آنکھوں نے اشی کی آنکھوں میں فسوں پھونکا۔ لب قدرے وا کرتے ہوئے وہ مسکرائی.....

اور

پھر شرما کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

”شکر ہے مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔“ اشی خوشی سے لہراتے ہوئے گنگنایا..... اور پھر دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میرے مولا تو واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ میری خوشیوں کو دوام بخشا.....“

ریشم کو ہنسی آ گئی۔

یہ سفر بڑا خوشگوار رہا..... راستے میں تکلف کی تکلیف دہ رکاوٹیں آپوں آپ ختم ہو گئیں۔ دو جگہ چائے کے لیے رکے..... اور اشی کے اصرار پر کھانا گوجرانوالہ میں کھایا۔ جگہ

جگہ قیام اس کی مسرتوں میں گراں بہا اضافہ تھا۔  
لیکن

لاہور جوں جوں قریب آتا گیا، اشی کی شوخیوں میں کمی آتی گئی۔ وہ چپ چپ تھا۔ یہی حال ریشم کا تھا۔ جذبوں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ذہنی کیفیت کو بخوبی جانتے تھے۔

اشی دونوں کو اتار کر گھر واپس جانا چاہتا تھا لیکن محمودہ بیگم نے بڑے پیار و اصرار سے چائے کے لیے روک لیا..... ریشم نے بھی چائے کے لیے اصرار کیا۔ یہ دعوت وہ رد نہ کر سکا اور پھر وہیں شام تک بیٹھا رہا..... سائرہ سے خوب گپ شپ رہی..... امی نے جو رشتہ داری نکالی تھی۔ سائرہ کو بھی بتا دیا تھا۔

اشی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ پھر یہاں آنے کی امید بندھ گئی۔

-----○-----

”سارہ باجی یہ کیا بات ہوئی۔ میں اکیلی کیسے گھر جاؤں گی۔“ ریشم نے بہن کو کندھے سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”تم بھی ہمارے ساتھ چلو نا۔“ سارہ کی بجائے نگہت بولی۔ ”اتنا ہی کیا..... گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں کیا ہو جائے گا۔ اللہ قسم باجی مجھے کالج کا بہت سا کام کرنا ہے اور مجھے پتہ ہے، آپ کے ہاں چلے گئے تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تو کیا شام ڈھلے تک بھی چھٹکارا ہونے کا نہیں.....“ وہ بولی۔

”ہائے ریشم.....“ نگہت مسکرائی۔ ”میری زبان پر یقین نہیں.....“  
 ”یہ بات نہیں نگہو باجی..... مجھے پتہ ہے آپ اور سارہ باجی جب مل بیٹھیں تو وقت کا احساس نہیں رہتا.....“ ریشم نے معذرتانہ انداز میں کہا۔  
 ”تو پھر تم چلی جاؤ.....“ سارہ بولی۔ ”وہ سامنے ہی تو بس سٹاپ ہے۔ تمہارے سامنے میں نے کتنی منت سماجت کی ہے۔ نگہت مانتی ہی نہیں۔“

”نگہت باجی آپ ہمارے ہاں چلیں۔“ ریشم نے تجویز پیش کی۔  
 ”میرا گھر یہاں سے بہت قریب ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو آنا چاہیے۔“ نگہت نے اصرار کیا۔

”بس ٹھیک ہے۔“ سارہ نے کہا۔ ”چلو تمہیں بس سٹاپ تک چھوڑ آتے ہیں۔ گھر کے سامنے ہی تو رکتی ہے بس..... پھر جیسے یہ پہلی بار ہی ہو..... پہلے تو کبھی گئیں آئیں نہیں نا اکیلی۔“

ریشم سارہ کو گھور کر دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔ امی نے ڈانٹا تو.....“

”امی کیوں ڈانٹیں گی۔ نگہت کا بھلا انہیں پتہ نہیں۔“ سارہ نے کہا۔  
 ”میں سارہ کو خود چھوڑ جاؤں گی ریشم، خالہ جان سے معذرت بھی مانگ لوں گی۔ میں تو اب بھی کہوں گی۔ تم بھی ساتھ چلو.....“ نگہت کچھ خفیف سی نظر آ رہی تھی۔  
 ”ہائے اللہ۔“ ریشم جھلائی۔

”بس جاؤ اب، بس آنے والی ہوگی۔“ سارہ نے نگہت کا دل رکھنے کو کہا۔  
 ”چلو ہم بس تک پہنچا آتے ہیں۔“ نگہت نے کہا۔  
 ”شکریہ باجی..... میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔“ ریشم نے کہا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے جلدی سے مڑ گئی۔

سارہ کی منگنی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لینے دینے کے کپڑے تیار کرنا تھے۔ کچھ دوپٹے کم تھے۔ سارہ اور ریشم بازار سے لینے آئی تھیں..... بازار ہی میں نگہت مل گئی..... سارہ کی عزیز ترین دوست۔ اس کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ دونوں سہیلیاں کافی عرصے بعد ملی تھیں۔ نگہت کا اصرار تھا کہ گھر چل کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ سارہ بھی مان گئی تھی..... لیکن ریشم کی طبیعت الجھی ہوئی تھی۔

ریشم دوپٹوں کا لفافہ اٹھائے بس سٹاپ کی طرف جانے لگی۔  
 چارنچ چکے تھے۔ بازار کی گہما گہمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ خریداری ہو رہی تھی۔ دکانوں میں رونق بڑھ گئی تھی۔

”ہیلو ریشم۔“ کاسمیٹک کی ایک بہت بڑی دکان سے نکلتے ہوئے نجھی نے ریشم کو دیکھتے ہی پکارا۔

”نجھی۔“ ریشم کے قدم رک گئے۔ نجھی اس کے قریب آ گئی۔ دو تین لفافے اس کے ہاتھ میں تھے۔

”کیا خریدا.....“ ریشم نے پوچھا۔  
 ”چھوٹی موٹی بہت سی چیزیں ہیں..... شمو باجی کی شادی ہو رہی ہے۔“  
 ”میری باجی کی منگنی ہے..... ان کے لیے دوپٹے خریدنا تھے۔“  
 ”اکیلی آئی ہو۔“



”نہیں تو۔ سارہ باجی بھی تھیں۔ انہیں ایک پرانی دوست مل گئی۔ زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئی.....“

”اب اکیلے جاؤ گی.....“

”کوئی بات نہیں۔ بس ہمارے گھر کے عین سامنے رکتی ہے۔“

”ہائے نہیں..... چلو میرے ساتھ..... تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔“

”نہیں نجھی..... میری خاطر تم اتنا لمبا چکر کاٹو گی۔“

”کیا فرق پڑے گا..... آؤ.....“

ریشم نے انکار کرنا چاہا لیکن نجھی بڑے پیار سے اصرار کرنے لگی۔ ”آؤ بھی۔“

بھائی جان انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں میں گاڑی میں بٹھا آئی تھی.....“

”تم جاؤ نجھی..... ایمان سے میں بڑے آرام سے چلی جاؤں گی۔“

”کلف کر رہی ہو۔ بھئی اب تو ہماری رشتہ داری بھی ہے۔ ذرا سا چکر کاٹ لیں

گے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔“

ریشم تذبذب میں تھی۔

”چلو بنو نہیں زیادہ.....“ نجھی اسے کندھے سے پکڑتے ہوئے مسکرائی۔ ”چلو

آؤ۔ جوان جہاں لڑکی اور اکیلے جائے گی۔ بری بات۔ زمانہ بہت خراب ہے.....“

ریشم بھی مسکرا دی۔ ”اماں بی کے مشورے کا شکریہ..... لیکن میں جاؤں گی پھر بھی

تمہارے ساتھ نہیں.....“

”کیوں؟“

”زمانہ بہت خراب ہے اور غیر مردوں کے ساتھ گاڑیوں میں جانا.....“

”بکنہیں..... میرے بھائی جان تمہارے بھی تو بھائی ہیں..... اب ہم بالکل ہی

غیر بھی تو نہیں۔ تم ہماری بھابھی کی بہن ہو..... میں تمہاری بہن کی نند..... سمجھیں۔“

دونوں مسکرانے لگیں۔

نجھی اسے ساتھ گھسیٹ لائی..... وہ اس طرف آئی جدھر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اپنی

گاڑی کے قریب آ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا..... ”لو اب بھائی جان خدا جانے کدھر چلے گئے۔“

”میں آ گیا۔“ پیچھے سے آواز آئی۔

ریشم نے پلٹ کر دیکھا۔ حیرت و مسرت سے اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ

گئی۔ اشی کھڑا مخمور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“ نجھی نے پوچھا۔

”یہیں تھا.....“

”کھولے گاڑی.....“

”لیجئے جناب.....“ وہ گاڑی کھولتے ہوئے مسکرایا۔ ”یہ ساتھ کسے پکڑ لائیں؟“

”میری دوست.....“ نجھی نے تعارف کروانے کو کہا۔

”ریشم۔“ اشی نے جلدی سے اس کی بات مکمل کر دی۔

نجھی نے حیران ہو کر اشی کو دیکھا اور پھر ریشم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جو بڑے

دلفریب انداز میں قدرے رخ موڑے مسکرا رہی تھی۔

”آپ انہیں جانتے ہیں بھائی جان؟“ حیرت زدہ نظروں سے نجھی نے بھائی

سے پوچھا۔

”برسوں، صدیوں سے، زمانوں سے۔“ اشی نے شوخی سے کہا۔

”تو بہ تو بہ.....“ ریشم کا چہرہ گل گوں ہو گیا۔ ”جھوٹ کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔“

”جھوٹ نہیں ہے نجھی۔“

اشی نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا..... نجھی ابھی تک

حیران تھی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے برابر میں ریشم کے لیے جگہ بنائی اور پھر اشی کی

طرف دیکھا جس کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

”آپ انہیں کیسے جانتے ہیں بھائی جان۔“ نجھی نے حیرت کا بدستور اظہار

کرتے ہوئے کہا۔

”کس کو؟“ اشی نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا۔

”ریشم کو۔“ نجھی بولی۔

”میں نہیں جانتا کسی کو بھی کون ریشم، کون سلک۔“ اشی گاڑی اشارت

”یہ کیسے جانتا تم نے؟“

”ایسے کہ آپ دونوں کافی بے تکلف لگتے ہیں۔“

”بے تکلف انسان پہلی ملاقات ہی میں ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیے تو ہزاروں بار ملنے کے باوجود بھی نہیں ہوتا۔“

”میں نہیں مانتی آپ کی بات۔“

”نہ مانو۔۔۔ سچی بات کبھی کسی نے مانی بھی ہے۔“

”نچھی کی بات اشی سے نہ بنی تو وہ ریشم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ریشم نے لباتے ہوئے اسے بتایا کہ نعیمہ باجی کی شادی پر اس نے دیکھا اشی کو۔۔۔ اور پھر کہا۔ ”ولیمہ کے دن آپ ہمیں گھر پہنچانے آئے تھے۔“

”پرانا خادم ہوں۔۔۔ اشی ہنسا۔

ریشم اور نچھی مسکرانے لگیں۔

”اچھا ابھی اب جانا کہاں ہے۔ ان کے ہاں یا اپنے۔“ اشی نے بڑی سڑک پر آتے ہوئے پوچھا۔

”پہلے مجھے چھوڑنا ہے نچھی۔۔۔۔۔“ ریشم نے جلدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ اشی بولا۔ ”نچھی ان کے ہاں چائے بڑی مزیدار ہوتی ہے۔“

”تو گویا آپ ان کے ہاں چائے بھی پی چکے ہیں۔۔۔۔۔“ نچھی سر ہلاتے ہوئے شوخی سے بولی۔

”تو بہ ہے نچھی۔ کیا تو والوں کا سالجہ ہے تمہارا۔۔۔۔۔ چائے ہی پی ہے خون تو نہیں پیا۔“ اشی نے معصوم سا چہرہ بناتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تو کہو کدھر جانا ہے پہلے۔“

”کسی ریسٹورنٹ میں۔۔۔۔۔“ نچھی بولی۔

”یہ۔۔۔۔۔ بات ہوئی نا۔“ اشی جوش مسرت سے بولا۔

”نہیں۔ نچھی۔۔۔۔۔ میں نے گھر پہنچنا ہے۔۔۔۔۔ پہلے مجھے گھر پہنچا دو۔“ ریشم گھبرا کر بولی۔

”چائے نہیں پیو گی۔“ نچھی نے پوچھا۔ ”ذرا بھائی جان کی جیب پر ڈاکہ ڈالیں گے۔“

کرتے ہوئے بولا۔

”ہائے اللہ۔“ نچھی بولی۔ ریشم چپ چاپ مسکرانے لگی۔

”نچھی بار بار پوچھنے لگی۔۔۔۔۔ اور اشی اسے ستانے چڑانے لگا۔

”بھئی ان سے واقفیت کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔۔۔۔۔ ہوئی تھی۔“ کئی لمحوں کی چھیڑ چھاڑ کے بعد اشی نے کہا۔ ”میں پنڈی سے آ رہا تھا۔ انہوں نے لفٹ مانگی۔۔۔۔۔ مجھے ترس آ گیا۔ بٹھالیا ساتھ۔۔۔۔۔“

”ہائے نچھی۔۔۔۔۔ کتنا جھوٹ بولتے ہیں یہ۔۔۔۔۔“ ریشم نے نچھی کی بغل میں سکر تے ہوئے کہا۔

”کیا جھوٹ ہے جی۔۔۔۔۔“ آگے کو جھکتے ہوئے اشی نے گردن کو خم دے کر ریشم کو دیکھا۔۔۔۔۔ ”آپ آئی نہیں میرے ساتھ پنڈی سے۔“

”آئی تھی۔۔۔۔۔“ ریشم نے جواب دیا۔

”پھر کیا جھوٹ کہا میں نے۔“ اشی نے اسی انداز میں بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کب منت کی تھی لفٹ کے لیے ہم نے۔۔۔۔۔“ ریشم نے روٹھے روٹھے لہجے میں کہا۔

”تو چلیے۔ آپ نے نہیں، میں نے منت کی تھی۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔“ اشی مسکرایا۔ ”بات تو ایک ہی ہوئی۔“

”ایک کیونکر ہوئی؟“ وہ بولی۔

”بڑے شان ہیں جناب کے۔“ اشی نے کندھے اچکائے۔

”کیوں نہ ہوں۔“ اس کی آواز میں شوخی تھی۔

”نچھی اب تک دونوں کے درمیان چپ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ نوک جھونک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھائی جان آپ جھوٹ کہتے ہیں۔“

”کیا؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہی کہ آپ کی واقفیت چند دن پہلے ہوئی۔“

نہیں کر پاتے۔“ وہ بولا۔

”بد ذوق ہوتے ہیں.....“ نجھی نے ریشم کو گدگدایا۔ وہ منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔  
باقی راستہ خوشگوار کٹا۔ اشی اور نجھی چائے کے لیے رک گئے۔ محمودہ بیگم نے  
دونوں بھائی، بہنوں کو خوب پیار کیا۔ نجھی کی امی اور ابو سے تو وہ پہلے ہی مل چکی تھیں۔ یہ جان  
کر کہ اشی ان کا بیٹا ہے، انہیں اور بھی خوشی ہوئی۔



”نہیں..... نہیں.....“ ریشم نے گھبرا کر کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی.....“

”کیوں.....“ نجھی نے پوچھا۔

”گھر پہ بتایا ہوا نہیں۔ ویسے بھی.....“ وہ یہی کہہ پائی۔

”ٹھیک ہے۔“ اشی بولا..... ”ایک شرط پر.....“

”وہ کیا۔“ ریشم کے چپ رہنے پر نجھی نے پوچھا۔

”چائے پلانا ہوگی۔“ اشی نے کہا۔

”پلا دوں گی.....“ ریشم بولی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

”اتنی بیزاری سے پلانا ہے تو معاف ہی فرمائیے۔“ اشی نے کہا۔ ریشم اور نجھی

مسکرائے لگیں۔

”ٹھیک ہے بھائی جان..... ہم بھی نہیں پیئیں گے..... پہلے آفر ہماری طرف

سے ہوئی جو ان صاحبہ نے رد کر دی۔ اب ہم کیوں پیئیں گے ان کے ہاں کی

چائے.....“ نجھی نے بھائی کی طرف داری کی۔

”بالکل بالکل.....“ اشی بولا۔

”نہیں پنی تو نہ پینا۔“ ریشم نے نجھی کے ٹھوکا دیا۔ ”بس مجھے جلدی سے گھر پہنچا دو۔“

”اے.....“ اشی شوخی سے بولا۔

”جی نہیں میرے۔“ ریشم جھلا کر بولی۔

”بہت بہتر۔ ہم بھی نجھی انہیں سڑک پر ہی بیچ آئیں گے۔“ اشی نے مذاق کے

موڈ میں کہا۔

”یہیں بیچ دیں۔“ ریشم برا مان گئی۔

”اوہو.....“ اشی گڑبڑا سا گیا۔ نجھی ہنسنے لگی۔

پھر سارا راستہ نجھی اور اشی ہنسی کی باتیں کرتے رہے لیکن ریشم چپ بیٹھی رہی۔

”معاملہ چو پٹ ہو گیا نجھی۔“ اشی بولا۔

”کیوں؟“ نجھی نے کہا۔

”بعض لوگ بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ذرا سا مذاق بھی برداشت

”چپکے چپکے ہی میدان مار لیا۔“  
 ”کیا۔“  
 ”ہو نہیں۔“

”شمو تمہاری اسی عادت سے مجھے چڑ ہے۔ پہیلیاں نہ بوجھوایا کرو۔“  
 ”اجی صاحب، سچی نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔“

”کیا بتایا ہے۔“  
 ”وہ ریشم.....“  
 ”اچھا اچھا.....“

اشی نے کتاب میز پر پھینک دی..... اور کرسی موڑ کر شمو کی طرف رخ کر لیا۔ وہ بڑے پراسرار طریق سے مسکرا رہی تھی۔

”کیا بتایا سچی نے۔“  
 ”سب کچھ.....“  
 ”یعنی.....“  
 ”یعنی.....“

دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اشی اپنے کمرے میں مصروف تھا کہ شمو دبے قدموں اندر آ گئی۔ سچی نے اپنی دوست ریشم کے متعلق اسے بتایا تھا اور اشی کی باتیں بھی چٹھارے لے لے کر سنائی تھیں۔

ریشم سے وہ بھی سلیم کی شادی پر مل چکی تھی۔ ملاقات سرسری طور پر ہوئی تھی اور شاید

اس لڑکی کو وہ بھول جاتی لیکن ابو امی جب بھی اس کے لیے کسی انتخاب کی بات کرتے۔ ریشم کا ذکر ضرور ہوتا..... صغیر احمد کو تو وہ اتنی پسند تھی کہ ابھی سے اٹھا کر گھر لے آتے۔

لیکن عذرا جلدی نہ کرنا چاہتی تھیں۔ پسند انہیں بھی ریشم بہت آئی تھی۔ شکل و صورت کے علاوہ بول چال سے بھی انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ لڑکی ہمہ صفت موصوف ہے۔ پھر محمودہ بیگم سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ٹھہری ہوئی جہانیدہ محمودہ بیگم کی شخصیت سے وہ بڑی متاثر ہوئی تھی۔ ادھر ادھر سے اس گھر آنے کا پتہ چلا تھا۔ میناروں والی کونٹھی کے مکینوں اور ان کی شان گزشتہ کو بھلا کون نہیں جانتا تھا۔ عذرا نے بھی ریشم کو بہو بنانے کی نیت کر لی تھی لیکن وہ جلدی کی قائل نہ تھیں۔ ایک تو ابھی شمو کی شادی کرنا تھی۔ دوسرے اشی تو ابھی عارضی ملازمت کر رہا تھا۔ مقابلے کا امتحان دے کر وہ جب تک کسی اچھے عہدے پر فائز نہ ہو جاتا، وہ رشتہ مانگنے کی قائل نہ تھیں۔

گھر میں اکثر اس کا چرچا ہوتا تھا۔ کئی دفعہ اشی کے سامنے بھی تذکرہ ہوا لیکن اس نے دلچسپی ظاہر نہ کی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ جس بت کا فر نے اس کی راتوں کی نیند چھین رکھی ہے، یہ ذکر خیر اسی کا ہے۔

شمو اشی کے پلنگ پر بیٹھ گئی..... اشی کے چہرے پر بڑے ہی خوبصورت تاثرات تھے۔ وہ شونی سے شمو کو گھور رہا تھا جو آنکھیں پھیلا پھیلا کر شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ سچی ایک دم فضول ہے۔“ اشی نے کہا۔ ”غلط سلط باتیں کر دیتی ہے۔“

”غلط سلط.....؟“

”تو اور.....؟“

”یعنی..... جناب کو وہ لڑکی پسند نہیں۔“

”اوں ہوں۔ پسند کرنے کی چیز ہی نہیں.....“

”ہائے ہائے..... صدقے گئی.....“

”تم خود کچھ لینا.....“

”جناب میں نے دیکھی ہوئی ہے.....“

”سچ.....“

”ہاں.....“

”کیسی ہے.....؟“

”یہ ابو اور امی سے پوچھیں.....“

”ابو اور امی سے.....“

”ہاں.....“

”وہ کیوں.....“

”وہ اس لیے..... کہ..... دونوں..... ریشم کو..... جناب کے لیے پسند کر چکے

ہیں۔“

”سچ.....“ اشی کرسی سے اچھل پڑا..... خوشی و مسرت سے وہ سرشار نظر آنے لگا۔

”واقعی شمو.....؟“ وہ بے پایاں خوشی کے بے صبر اظہار کے بعد بے یقینی سے

بولا۔

”بہک کیوں رہے ہو.....؟“ شمو مسکرائی۔

”بات ہی ایسی ہے.....“ وہ قدرے سنجیدگی سے بولا..... ”مجھے یقین ہی نہیں

آ رہا۔ امی، ابو کو کیسے علم ہو گیا..... کہ.....“

”کہ تمہیں بھی وہ لڑکی پسند ہے۔“ شمو نے ہنستے ہوئے اس کی بات پوری کر

دی۔ اشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ محض اتفاق ہے اشی..... قسمت کے دھنی ہو..... جو امی ابو بھی اسی لڑکی کے

انتخاب کے بارے میں سوچتے ہیں جسے تم بھی پسند کرتے ہو..... انہوں نے ریشم کو سلیم بھائی

کی شادی پر دیکھا تھا.....“ شمو بھی سنجیدہ نظر آنے لگی۔ ”لیکن ایک بات ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”امی فی الحال کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”بھئی جب تک تم امتحان پاس کر کے کہیں نوکری نہیں کر لیتے۔ باعزت روزگار

نہیں پالیتے۔ امی کوئی بات منہ سے نکالنے کی حامی ہی نہیں.....“

”اتنا لمبا عرصہ.....؟“

”تو کیا ہوا.....“

”اور جو کوئی دوسرا سے لے اڑا تو.....“

”ہاں..... یہ بات سوچنے کی ضرور ہے۔ ایسی نایاب سی شے پر تو اللہ جانے کتنے

لوگوں کی نظر ہوگی.....“

”تو پھر.....؟“

وہ اتنا مضطرب ہوا کہ شمو کو ہنسی آ گئی۔ اشی چڑ گیا۔ شمو اسے ڈانٹ پلانے لگی.....

”تو وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ اب تک تو تمہیں یہ امتحان پاس بھی کر لینا چاہئے تھا.....

میری نصیحتوں سے تو برا مان جایا کرتے، اب قدر آئے گی.....“

وہ بولتی گئی۔ اشی بے قراری سے کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ اس کی لمبی چوڑی تقریر

سننے کے بعد بیزار سے بولا۔ ”بس باتیں بنائے جاؤ گی۔“

”تو اور کیا کروں؟“

”کوئی ترکیب سوچو۔“

”مشکل ہے۔“

اشی نے منہ بنا لیا۔ شمو مسکرائے لگی۔ چند لمحے دونوں چپ رہے۔ پھر شمو اٹھتے

ہوئے بولی۔ ”اپنا پورا ادھیان پڑھائی کی طرف مبذول کرو میاں.....“

”اب بہت کیا؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

”منے بھیا۔“ شمو نے پیار سے اشی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار سے

کہا۔ ”فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیسے؟“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کوئی ترکیب لڑائیں.....“ وہ بولی۔

”میری اچھی بہن.....“ اشی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”ہائے اللہ، میرا کندھا توڑ ڈالا۔ کیا ہتھوڑے سا ہاتھ ہے.....“ شمو کندھا

دباتے ہوئے بولی.....

”پھر سوچو نا کوئی ترکیب.....“

”سوچ لی۔“

”کیا؟“

”ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ آنا جانا ہو جائے۔ بے تکلفی ہو۔ پیار محبت بڑھے۔ پھر اپنا مدعا بیان کر دیا جائے کہ ہمارے لڑکے کے برسرِ روزگار ہونے تک ریشم بی بی کے جملہ حقوق بحق کسی اور کے محفوظ نہ کئے جائیں.....“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اشی بھی مسکرانے لگا۔

ہنسنے بولنے کی آوازیں سن کر نجی بھی کمرے میں آ گئی..... اشی سے ڈر بھی رہی تھی۔ کہیں شمو کو سب کچھ بتانے پر شامت ہی نہ لے آئے لیکن اشی کو مسرور دیکھ کر وہ بھی دونوں کی باتوں میں شریک ہو گئی۔

تینوں بہن بھائی بے تکلف دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔ شمو اشی سے صرف ایک سال بڑی تھی۔ نجی تین چار سال چھوٹی لیکن سب بہن بھائی آپس میں بے تکلف تھے۔ یہ بے تکلفی بدتمیزی کی حد تک کبھی نہ بڑھ پائی تھی۔ ہاں دوستی کی حدود میں ضرور آتی تھی۔

تینوں کے سنجیدہ صلاح مشورے سے بالآخر یہ طے پایا کہ ریشم، سائرہ اور ان کی امی کو اپنے ہاں مدعو کیا جائے۔ ملنے ملانے سے تکلف کی دیواریں نہیں گی اور دونوں خاندان ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے.....

”اس اتوار کو بلا لیں۔“ شمو نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“ اشی بولا۔ ”اتوار ٹھیک رہے گا۔ سب کو چھٹی ہوگی۔“

”نہیں.....“ نجی کو کچھ یاد آیا۔ ”اس اتوار کو نہیں.....“

”کیوں؟“ شمو بولی۔

”اس اتوار کو ہماری دوست زریں کی سالگرہ ہے۔ ریشم بھی مدعو ہے۔“ نجی نے

کہا۔ ”تو پھر کوئی اور دن رکھ لو..... پیر منگل سہی.....“ اشی بے تاب تھا۔

”پیر منگل نہیں، اگلا اتوار ٹھیک رہے گا.....“ شمو نے فیصلہ دیا۔

”اتنا لیٹ.....“ اشی بے صبری سے بولا۔

شمو اور نجی دونوں ہنس پڑیں۔ وہ خفیف سا نظر آنے لگا۔

اچھی خاصی بحث کے بعد اتوار کے بجائے جمعہ کو دعوت کا فیصلہ ہوا۔

”امی سے بھی تو پوچھ لیں۔“ شمو نے کہا۔

”انہیں کیا اعتراض ہوگا۔“ نجی بولی۔ ”ابو کنی دفعہ ریشم کا پوچھ چکے ہیں.....“

”بس ٹھیک ہے.....“ شمو نے نجی کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”تو پھر لکھو دعوت نامہ.....“ اشی نے میز کی طرف اسے کھینچتے ہوئے کہا۔

”اللہ تو بہ..... کل لکھ دوں گی۔ ابھی تو کافی دن ہیں۔“ شمو ہنستے ہوئے بولی۔

”دعوت نامہ لے جائے گا کون۔“ اشی نے کہا۔

”تم.....“ شمو نے شوخی سے اسے دیکھا۔

”تو پھر ابھی لکھ دو نا۔ میں صبح دے آؤں گا۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے خوشی سے بولا۔

”اے نہیں جناب۔“ شمو نے اس کا کان پکڑ کر کہا۔ ”تمہاری ضرورت نہیں۔“

نجی ریشم کو دے دے گی۔ بس کام ہو گیا۔“

نجی منہ پر ہاتھ رکھ کر روکنے لگی۔ اتنی مضحکہ خیز شکل جو اشی بنا رہا تھا۔ شمو نے بھی

تو اس کی خوشی پر پانی پھیر دیا تھا۔

پھر بھی اشی خوش تھا..... بے انتہا خوش۔

-----○-----

زریں کی سالگرہ ریشم کے لیے اچھا خاصا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اتنی امیر کبیر سہیلی کے ہاں جانا کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ اچھا لباس اور اچھا تحفہ دونوں ہی ضروری تھے۔ لباس کا مسئلہ تو حل کر ہی چکی تھی۔ امی جانی کے پاس کپڑے تو تھے ہی۔ سلانا کون سا مشکل تھا لیکن تحفہ.....؟ ریشم سوچ سوچ کر بھی فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ اسے کیا چیز دے..... روز اس کے ساتھ گاڑی میں آنا جانا نہ ہوتا تو شاید بات کچھ اور ہوتی..... لیکن اب.....

”سارہ باجی آپ بتائیں نا کیا تحفہ دوں اسے؟“ بہت دنوں کی سوچ کے بعد جب کسی فیصلے پر وہ نہ پہنچ سکی تو سارہ سے مشورہ کیا۔

”اتنی چیزیں بتائیں۔ اب تمہارا دماغ ہی ساتویں آسمان پر ہو تو میں کیا کروں۔“

”اللہ باجی ذرا سوچئے تو سہی، تحفہ دینا کسے ہے۔“

”تمہیں اپنی حیثیت دیکھنا ہے، زریں کی نہیں۔“

”پھر وہی بات..... کتنی بار آپ کو کہہ چکی ہوں۔ زریں کے ساتھ آتی جاتی ہوں۔ اس کی گاڑی استعمال کرتی ہوں.....“

”تو کرایہ چکانا ہے۔“

”ریشم ہنس پڑی.....“ باجی آپ کی باتیں بھی خوب ہیں۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔“

”چلو کرایہ نہ سہی، احسان سہی.....“

”یہ بات نہیں.....“

”تو پھر اس کی گاڑی میں آنا ہی چھوڑ دو۔“

”واہ..... کیوں چھوڑ دوں..... جان کو ذرا آرام آیا ہے نا..... بسوں سے جان

چھوٹی ہے۔ یہ شان سے آتے جاتے ہیں مابدولت۔“

ریشم نے سینے پر ہاتھ مار کر فخر سے گردن اکڑائی۔ سارہ نے منہ چڑایا۔

”سارہ باجی آپ کیا جانیں، کتنا لطف آتا ہے ایسی ریشمی ریشمی گاڑی میں بیٹھ کر۔ سیٹیں اتنی نرم ہیں کہ جسم دھنس جاتا ہے ان میں۔ دھچکا تو کبھی لگا ہی نہیں۔ ماں کی گود کی طرح نرم نرم گاڑی۔ آہا کیا کہنے۔“

”مجھے تمہاری یہ عادتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ سارہ ناگواری سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ تو ہمیشہ یہی کہیں گی۔“

”ٹھیک کہتی ہوں۔ اپنی انا بھی کوئی چیز ہے۔ وقار بھی کوئی شے ہے۔“

”سب بے معنی چیزیں ہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں، جہاں سے فائدہ اٹھایا جاسکے، اٹھانا چاہیے۔ زریں بھی ہماری ہی طرح کی لڑکی ہے۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ اکیلی اتنی بڑی گاڑی میں آئے جائے اور ہم بسوں میں خوار ہوتے پھریں۔ خدا کی قسم وہ مجھے آفر نہ بھی کرتی تو میں نے زبردستی آنا جانا شروع کر دینا تھا۔“

”بڑے فخر کی بات کر رہی ہونا۔“

”منہ کیوں چڑاتی ہیں۔ فخر کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ جو چاہیں۔ کہتی رہیں میرے تو بس اپنے اصول ہیں۔ میں تو اس بات کی حامی ہوں کہ وقت کی گرفت میں نہیں آؤ۔

وقت کو اپنی گرفت میں کر لو۔ جو حق بنتا ہے اسے ضرور وصول کرو۔ نہیں ملتا تو چھین لو۔“

ریشم نے ہاتھ سے چھین لینے کا اتنا برقی سا اشارہ کیا کہ سارہ کو ہنسی آ گئی۔ پیار سے

”ریشم کی لمبی چٹیا کو پکڑ کر اس کا سر ہلاتے ہوئے بولی۔“ زریں کی موٹر پر تمہارا حق کیونکر بن گیا۔“

”کیوں نہیں بن گیا۔ وہ بھی میرے برابر کی لڑکی ہے۔ وہ موٹر میں جاسکتی ہے تو میں کیوں نہیں جاسکتی۔“

”تم تو زری پاگل ہو۔“

ریشم چڑ گئی۔ دونوں بہنوں میں معمول کے مطابق بحث ہونے لگی۔ جس کی

نوبت اونچی اونچی آوازوں میں گلا پھاڑنے تک آ پہنچی۔ محمودہ بیگم کو اندر آ کر دونوں کو ڈانٹنا



پڑا۔ دونوں بہنیں چپ تو ہو گئیں لیکن کھا جانے والی نظروں سے ایک دوسری کو دیکھتی رہیں۔  
ڈانٹ ڈپٹ کے بعد جب محمودہ بیگم نے جھگڑے کا سبب پوچھا تو ریشم پھر وہی  
تخفے کا ذکر لے بیٹھی۔

”کوئی چیز دے دو۔ تم نے اپنی حیثیت کا ہی تحفہ دینا ہے نا۔“ سارہ نے چڑایا۔  
”اب اپنی حیثیت اتنی کم بھی نہیں سارہ باجی اور پھر کم از کم تحفے کے انتخاب کے  
لیے مجھے زریں کی حیثیت بھی دیکھنا ہے۔“  
”قیص کا کپڑا لے لو۔“ محمودہ بیگم بولی۔

”واہ امی۔ اس کے پاس قیصوں کی کیا کمی ہے۔ اتنا اتنا قیمتی کپڑا پہنتی ہے کہ کیا  
بتاؤں۔“

”ہینڈ بیگ لے لو۔“

”اس کے پاس چمڑے کے انتہائی نفیس باہر کے ہینڈ بیگ ہیں۔“

محمودہ بیگم نے کئی چیزوں کے نام لیے لیکن ریشم ہر چیز کے متعلق یہی کہتی رہی کہ  
اس کے پاس اس سے کہیں بڑھیا چیزیں موجود ہیں۔ سارہ چپ چاپ سنتی رہی۔ آخر نہ رہ  
سکی، بولی۔ ”امی اسے احساس کمتری ہے۔ اب زریں کروڑ پتی کی بیٹی ہے تو ہمیں کیا۔ ہم  
نے تو اپنا آپ دیکھنا ہے۔ یہ تو تحفے کا معاملہ ہی طے نہیں کر پائی۔ ابھی تو پارٹی میں پہننے کے  
لباس کا مسئلہ ہوگا۔“

”ضرور ہوگا۔“ ریشم تنک کر بولی اور پھر جھوم کر ماں کے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے  
حسب عادت خوشامدی انداز میں بولی۔ ”آپ کے پاس ایک تیز جامنی رنگ کا کپڑا ہے۔“  
”دیکھا۔“ سارہ نے گھورا۔

”امی جانی۔ وہ کپڑا میں لے لوں گی۔ اتنا خوبصورت لباس بناؤں گی۔ اتنا  
خوبصورت کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔“ ریشم نے ماں کے گال سے اپنا گال  
لگاتے ہوئے کہا۔

”امی آپ نے اسے بہت سرچڑھا رکھا ہے۔ کوئی پارٹی ہو، کوئی شادی ہو۔ بی بنو  
کو نئے کپڑے چاہئیں۔“ سارہ بولی۔

”آپ کیوں جلتی ہیں۔“ ریشم مسکرائی۔  
”ٹھیک کہتی ہے ریشم۔“ امی نے اس کے بازو گلے سے نکالتے ہوئے کہا۔  
”پارٹی ہی ہے نا، نعیم کی شادی والے کپڑے پہن لو۔“  
”اوں ہوں۔“ ریشم نے سر ادا دھر ہلایا۔ ”تیز جامنی کپڑا۔ خوبصورت سالباس  
واہ واہ۔ واہ واہ۔“

”نہیں ملے گا۔“ ریشم کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سارہ بولی۔  
”ضرور ملے گا۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔  
”ریشم۔ تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو۔“ سارہ نے طنز کیا۔  
”جو کچھ ہوں۔“

”جو کچھ ہو، وہی سمجھو تو رونا کس بات کا ہے۔“

”جی جناب۔ میں اپنے آپ کو ریشم ہی سمجھتی ہوں۔ ریشم جو میناروں والی کوٹھی  
کے فرید الدین کی پوتی ہے۔ امیر ترین آدمی کی پوتی۔“

”یہی تو تمہاری بے وقوفی ہے۔ لڑکیوں میں جانے کیا ڈینگیں مارتی رہتی ہوگی۔“  
”کبھی غلط بات نہیں کی میں نے۔“  
دونوں پھر الجھنے کے موڈ میں تھیں کہ محمودہ بیگم نے بچاؤ کر دیا۔  
”تو پھر ہو گئی بات امی جانی۔“

”کیا؟“

”جامنی کپڑے والی۔“

”زبان سے ایک دفعہ بات نکل جائے تو پھر ٹلو گی تم تھوڑا ہی۔“

”میں سود دفعہ سوچ کر زبان سے بات نکالتی ہوں۔“

”ہائے ہائے۔“ سارہ نے طنز یہ انداز میں کہتے ہوئے ریشم کو چڑایا۔

”بس سارہ باجی۔ لڑائی ختم۔۔۔۔۔ آپ میرے کپڑے تیار کر دیں۔۔۔۔۔ خوبصورت

ساؤیز ائن بنائیں۔۔۔۔۔ شلووار قیص اچھی رہے گی یا کوئی اور ڈریس؟“

”مجھے نہیں پتہ۔“ سارہ بیزار سی بولی۔۔۔۔۔ ریشم کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ

امی سے ہٹ کر سارہ کی طرف آگئی..... اس کے پہلو میں گدگدی کرنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سارہ ہنستے ہوئے پرے ہٹ گئی۔

محمودہ بیگم دونوں کو مسکراتے دیکھ کر اٹھ گئیں..... اور دونوں بہنیں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ ریشم کی باتیں پھر لباس پر آرہی تھیں۔

”ریشو..... وہی کپڑے پہن لینا۔“

”کون سے؟“

”نعیمہ کے ویسے والے۔“

”اوں ہوں..... بالکل بھی نہیں.....“

”ہر پارٹی میں تجھے نیا لباس چاہیے؟“

”بالکل.....“

”اچھا جی.....“

”ہاں جی.....“

”فضول لڑکی..... زریں کی پارٹی کے بعد شجی کے ہاں دعوت ہے۔ اس دن بھی

تم کہو گی، نئے کپڑے ہی پہنوں.....“

”بالکل.....“ ریشم نے مخمور نگاہوں سے بہن کو دیکھا اور پھر جانے کیا سوچ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ ہنسی شبنمی پھوار کی طرح اس کے خوبصورت چہرے پر پھیل گئی..... اس کی آنکھوں کا شوخ خمار اور بڑھ گیا۔ اور وہ ایک تو بہ شکن انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ریشم نے کپڑے بھی تیار کروا لیے اور تحفہ بھی امی سے لے لیا۔ دادا کے وقت کی ایک نایاب سی منٹش پلیٹ اس نے امی کے پاس دیکھی ہوئی تھی۔ اسی کے لیے ضد کی۔

اور

ریشم کی ضد پوری نہ ہو، یہ کہاں کا دستور ہے.....

اتوار کی صبح ریشم نے اپنا خوبصورت تیار شدہ لباس بڑی محنت سے استری کر کے

ہیگر میں لٹکا دیا۔

”جاؤ گی کیسے..... زریں کا گھر تو شہر کے آخری سرے پر ہے۔“ سارہ نے

اسے تیار ہوتے دیکھ کر پوچھا.....

”وہ مجھے لینے آئے گی..... دو بجے کے قریب..... اور واپس پہنچانے کا بھی وہی بندوبست کرے گی۔ آپ بے فکر رہیں.....“ ریشم نے پاؤں میں پہننے کے لیے چپل صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”نئے جوڑے کے ساتھ پرانے چپل.....“ وہ خود ہی بڑبڑائی۔

”ایسے پرانے بھی نہیں.....“ سارہ نے کہا۔

”اللہ باجی، زریں کے پاس کیسے کیسے جوڑے ہیں..... کیا بتاؤں..... کمبخت تین تین چار چار جوڑے اکٹھے ہی خرید لیتی ہے.....“

”اس کی کیا بات..... امیر لڑکی ہے.....“

”یہی تو میں سوچتی رہتی ہوں..... ہم امیر کیوں نہیں.....“

سارہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”بحث نہ کرنے لگنا۔ آرام سے تیاری کرو۔“

ریشم منہ بنا کر چپلوں کو صاف کرنے لگی۔

دو بجے کے قریب گاڑی آگئی۔ ریشم زریں کے ہاں چل دی۔ کپڑے ہیگر میں

لٹکائے گاڑی میں رکھ لیے۔ زریں اسے خود لینے آئی تھی۔

زریں کا گھر تھا یا کوئی شاندار محل، ریشم پہلی بار وہاں آئی تھی..... زریں کو اس نے امیر لڑکی ضرور سمجھا تھا لیکن اس کے گھر کے ٹھاٹھ باٹھا ایسے ہوں گے، اسے اندازہ نہ تھا۔

اتنی بڑی جہازی سائز کوٹھی..... ہر کمرہ شاندار..... سبے سجائے ہال..... بل

کھاتے برآمدے۔ سنگ مرمر کے مجسمے..... وسیع و عریض چمن بارہ دریاں..... یہ کوٹھی تو نعیمہ کی کوٹھی سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

ریشم کو تو یوں لگ رہا تھا جیسے جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہو یا کسی طلسماتی ماحول

میں آئی ہو۔

زریں اسے کمرے میں لے آئی۔ گرمی کوئی اتنی زیادہ تو نہ تھی پھر بھی ایئر کنڈیشنر

چل رہا تھا۔ کمرے کی فضا میں ہلکی ہلکی خنکی، اکتوبر کی ٹھنڈی شاموں کی فضا میں بکھر رہی تھی۔

کمرہ کیا تھا چھوٹی سی خوبصورت جنت تھی۔ پورا فرش خوش نما قالین سے ڈھکا تھا۔ بیرونی شیشے کی دیوار کے سامنے ریشمی پردے تھے۔ ایک طرف نوم کا نرم نرم بیڈ تھا جس کا تکیہ لکڑی کی کھدائی کے کام کا بنا ہوا تھا۔ برابر میں رکھی سائڈ ٹیبل پر پردوں کی مناسبت سے ہلکے سبز رنگ کے شیڈوں والے پیارے پیارے لیپ تھے۔ سندھی کام کا رنگ برنگ بیڈ کور کمرے کی زیبائش میں ایک حسین اضافہ تھا۔ ایک طرف بیڈ ہی کی طرح کا صوفہ تھا۔ درمیانی میز بھی اسی لکڑی کی تھی۔ پتھر کے انتہائی نفیس گل دان میں موسمی پتوں میں مصنوعی پتوں اس انداز میں لگے تھے کہ اصل کا گمان ہوتا تھا۔ لکڑی کی دیواروں پر کہیں کہیں نہ بصرہ ت پینٹنگز..... آرائشی چیزیں اور ننھی منی گڑیاں لٹکی تھیں۔

ڈریسنگ روم اور غسل خانہ برابر میں تھا۔ زریں کے ملبوسات اور آرائش وزینائش کی چیزیں ریشم نے قہر سے دیکھیں۔ ایسے ایسے نایاب سینٹ، قیمتی لپ اسٹکس، ہینڈ لوشن، فاؤنڈیشن کریمز..... مصنوعی پلکیں۔ آنکھوں کے شیڈ کے لوازمات۔ کیا کچھ نہیں تھا۔

ریشم کمرے کی زیبائش ہی دیکھ رہی تھی کہ گہرے سانولے رنگ کی نوخیزی ملازمہ ٹرائی گھینٹے اندر آ گئی۔ کچھ پھل، چاکلیٹ اور مشروب ٹرائی میں بڑے قرینے سے رکھے تھے۔ کانچ کا نازک سا جگ، اسی کی طرح گلاس، فرنیچر کی چوکور چوکور ٹیبلوں والی برف سے بھری شیشے کی مٹی سی بالٹی..... جس میں چاندی کی چٹی بھی رکھی تھی۔ سکوائش کی بوتل بھی تھی۔

زریں نے سکوائش گلاس میں انڈیلا، پھر پانی ڈال..... چٹی سے برف کی دو ٹکڑیاں گلاس میں رکھیں۔

”چینی پسند کرو گی۔“ اس نے چاندی کے چمچ سے چینی دان سے شکر نکالی۔  
 ”شکریہ۔“ ریشم نے مسکراتے ہوئے گلاس تھام لیا..... زریں اپنے لیے سکوائش بنانے لگی۔

اور

گھونٹ گھونٹ شربت حلق میں اتارتے ہوئے ریشم ہونٹوں میں تبسم دبانے لگی۔ اسے اپنے ہاں سکوائش بنانے کا خیال آ رہا تھا۔ جگ میں پانی ڈالا۔ مٹھی بھر چینی بڑے

چمچ سے ملائی اور پھر برائے نام سکوائش انڈیلا۔ دسترخوان میں ٹھپ ٹھپ کوٹی ہوئی برف جگ میں الٹی..... شربت تیار..... سکوائش یہاں بھی وہی تھا لیکن جس انداز اور طریق سے پیش کیا گیا تھا، ذائقہ ہی اور محسوس ہو رہا تھا..... ذائقہ الگ محسوس ہوتا بھی کیونکہ نہیں اپنے ہاں تو دس بار شربت بننے پر بھی بوتل ختم ہو جائے تو امی پیچھے پڑ جاتیں..... کہ اتنی جلدی ختم ہو گئی بوتل..... اور یہاں زریں نے چار گلاس بنا کر بوتل آدھی کر ڈالی تھی۔

ریشم کے خیالات کا بہاؤ اسے جانے کہاں لے جاتا کہ کمرے میں زریں کی بھابھی آ گئی۔ موٹنی سی صورت والی بڑی سمارٹ سی بھابھی..... اسے سمیر ڈریسر کے ہاں بال بنوانے جانا تھا..... اپنی بچی کا فراک بھی درزی سے لانا تھا۔ بال زریں نے سیٹ کروانے تھے۔

”چلو تم بھی ہمارے ساتھ۔“ زریں نے ریشم سے کہا لیکن ریشم نے معذرت کر دی۔ اس کا دل تو زریں کے خوبصورت بیڈ پر لیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں نرم نرم بستر پر لیٹ کر وہ آسائش کا نیا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔

”چلیے بھابھی۔ ریشم یہیں آرام کرے۔ کیا گرمی میں جائے گی۔ کیوں ریشم۔“ زریں مسکرائی اور ریشم کے دل کی دعا جیسے اللہ میاں نے سن لی۔

دونوں کے جاتے ہی ملازمہ ٹرائی گھسیٹ لے گئی اور ریشم دھم سے بستر پر جا پڑی۔ اللہ ایسا نرم نرم بستر..... ہلکی ہلکی خنکی سانولی شاخوں کا سا بانگین کمرے کی فضا میں رچا ہوا تھا۔

ریشم زریں کی مالی حیثیت کے متعلق سوچنے لگی۔ اتنی خوبصورت کوٹھی۔ باغوں میں گھری ہوئی، سوئمنگ پول، جھوٹی ہوئی ایزی چیئرز، شیشے کی دیواروں کے ساتھ لٹکے ہوئے سوئمنگ کاسٹیومز، کیا شان تھی.....

یہ سب شان پیسے ہی کی تھی نا.....

ریشم کے ذہن میں پیسے کی اہمیت اور افادیت کے کئی نئے باب کھل کھل گئے اور یونہی سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھیں موند گئیں۔

شہزاد نے پہلے آہستہ سے یہ نام لیا۔ پھر قدرے اونچی آواز میں دہرایا اور تیسری بار دروازے پر آہستہ سے دستک دیتے ہوئے پکارا۔  
 اور پیشتر اس کے کہ وہ دروازہ زور سے دھکیل دیتا۔ برآمدے سے گزرتی بھاری بھر کم ملازمہ بولی۔ ”زریں بی بی اندر نہیں ہیں صاحب۔“  
 ”تو کہاں ہیں؟“ شہزاد ہاتھ میں پکڑے بڑے سے ڈبے سمیت ملازمہ کی طرف گھوم گیا۔  
 ”بال بنوانے گئی ہیں۔“ ملازمہ پھل والی ٹوکری سامنے والے کمرے میں لے جاتے ہوئے بولی۔  
 شہزاد نے دروازہ دھکیلا اور بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ ڈبہ اس نے میز پر رکھ دیا۔ یہ غالباً زریں کے لیے کوئی تحفہ تھا۔  
 ڈبہ رکھ کر مڑتے ہوئے اس کی نگاہ اچانک بیڈ پر پڑی۔  
 وہ ٹھٹک کر دیکھنے لگا۔ اسے ملازمہ کی غلط بیانی پر کوفت بھی ہوئی۔ زریں کمرے میں سوئی تھی اور اس نے کہہ دیا کہ بال بنوانے گئی ہے۔  
 لیکن دوسرے ہی لمحے کوفت نئی کوفت سے دو چار تھی۔ نظروں نے اجنبی وجود کا احساس کر لیا۔ یہ زریں نہ تھی۔

وہ غور سے دیکھنے لگا۔ کوئی کروٹ کے بل سویا ہوا تھا۔ بالوں کی لمبی چوٹی نکلنے سے ہوتی پشت سے پھڑتی بیڈ پر کالے ناگ کی طرح دم سادھے پڑی تھی۔ جسم کے خوبصورت کٹ بڑے نمایاں تھے۔ پاؤں کے گلابی گلابی تلوے نظر آ رہے تھے اور شلوار کے بے ترتیب پائینچوں سے پنڈلیوں کا ننگا پن سونے والے کے وجود میں ایک حسین اور جذبات انگیز اضافہ تھا۔

شہزاد چند لمحے ساکت سا ادھر ہی دیکھتا رہا۔  
 پھر اس نے چاہا کہ کمرے سے فوراً نکل جائے۔  
 جانے کون اس انداز سے سو رہا تھا کہ نیند کے ہوش بھی اڑائے جا رہا تھا۔  
 لیکن وہ باہر نہیں جاسکا۔  
 اس اجنبی وجود کو بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے قدم بڑے محتاط انداز سے اٹھے۔ جھجکتے جھجکتے دبے دبے پاؤں رکھتا۔ وہ قدرے جھکا جھکا بیڈ کے دوسری طرف آ گیا۔  
 حسن اپنی تمام تر بیدار سحر کاریوں سے بے خبر سو رہا تھا۔  
 شہزاد مہوت سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔  
 یہ صورت انجانی تھی۔  
 یہ شکل اجنبی تھی۔  
 لیکن شہزاد اپنائیت کے احساس سے مغلوب۔ بے خود ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ لمحہ صدیوں کی مسافتیں پھلانگ چکا تھا۔

شہزاد زریں کا چچا زاد تھا۔ اپنے باپ کی سونا اگلی زمینوں کا واحد مالک۔ بہت بڑے منافع بخش برنس کا مالک۔ زریں سے بھی کہیں بڑی اور خوبصورت کوٹھی کا مکین۔ خوش شکل، خوش ادا۔ دوستوں کے حلقوں میں انتہائی مقبول۔ بیاہی بن بیاہی عورتوں کا آئیڈیل۔ اپنی اس خوبی کا احساس اسے کلب جا کر یا اونچے درجے کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر خوب ہوتا تھا۔ برنس کے سلسلے میں یورپ اور امریکہ کے ٹور لگتے ہی رہتے تھے۔ وہاں بھی وہ عورتوں کے حلقے میں بہت مقبول تھا۔ ملکی اور غیر ملکی بے شمار جوانیاں اس سے داد عیش لے چکی تھیں۔ ایسی عورتوں کا بہلانا اور عیش کے لیے ہموار کرنا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔

ماں نے اپنے اکلوتے بچے کو زریں سے منسوب کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا اور شہزاد نے بھی ماں کی خواہش پر سر تسلیم خم کر رکھا تھا۔ اپنی ساری کرداری، بے راہ رویوں کے باوجود وہ شادی کی تقدیس کا قائل تھا۔ زریں کو ہمیشہ ہی سے قابل احترام سمجھا تھا۔

لیکن احترام اپنی حدود سے کبھی بھی تجاوز نہ کر سکا۔ اس کی وجہ زریں کی سردمہری تھی۔ اسے شہزاد نا پسند نہیں تھا لیکن اس کے افعال اس کی نظروں میں بڑے گھناؤنے تھے۔ لڑکیوں کے قصے تو اس کے لیے جواہیت رکھتے تھے، وہ اپنی ہی جگہ تھے ہی، اسے شراب سے نفرت تھی اور وہ جانتی تھی کہ شہزاد اس ام النجاشٹ کو جس طرح لگا چکا تھا، وہ چاہے بھی تو اس سے دامن نہیں چھڑا سکے گا۔

زریں خود انتہائی شریف اور پاکباز لڑکی تھی۔ اس کے ذہن میں جیون ساتھی کا جو تصور تھا، وہ کسی طور شہزاد سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ دولت کی اہمیت اس کی نظروں میں کچھ نہ تھی۔

زریں ابھی زیر تعلیم تھی اور شہزاد بھی ابھی ان بندشوں سے آزاد رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اس لیے بات کسی سنگین موڑ پر نہیں پہنچی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ لوگوں نے رشتہ طے سمجھ رکھا تھا۔

شہزاد کوئی لمحے سانس روکے ریشم کو دیکھنے کے بعد اس وقت چونکا جب برآمدے میں کھٹ کھٹ کرتی ہیلو کی آواز آئی۔ شاید زریں وغیرہ واپس آ گئی تھیں۔

وہ جلدی سے دوسرے دروازے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب وہ اندر گیا تھا تو اس کے خیالوں میں زریں کا قابل احترام وجود جکڑا تھا۔

لیکن جب باہر آیا تو جیسے دنیا ہی بدل چکی تھی۔ بے خبر سونے والی حسین لڑکی دل و دماغ پر حاوی تھی۔

نوجوان لڑکی۔ اس کے لیے کوئی نئی شے نہ تھی۔ نہ ہی حسن اس کے لیے انوکھا تجربہ تھا لیکن لمحے کے وارچا نک ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بچانہ سکا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب تک اسی چہرے کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا اور سینکڑوں چہرے اسی چہرے کو پہچاننے کے لیے آزمائے تھے۔

سالگرہ کا جشن بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ شہر کے چوٹی کے لوگوں کا اجتماع تھا۔

دنیا جہاں کا فیشن یہاں دیکھا جاسکتا تھا۔ دولت کی گویا نمائش یہاں ہی لگی تھی۔ عورتیں تو عورتیں یہاں تو مرد تک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں نظر آ رہے تھے۔

ریشم بہت خوش تھی۔ ایسی محفلوں کی پیاس تو جیسے اس کی روح میں اتری ہوئی تھی۔ نچھو بھی آ گئی تھی۔ وہ اسے ساتھ لیے لیے کبھی ایک صوفے پر جا بیٹھتی۔ کبھی دوسرے پر۔ مہمانوں سے یوں بے تکلف ہو رہی تھی جیسے پہلی بار نہ ملی ہو۔ کئی بار مل چکی ہو۔ مسز اعظم اور مسٹر شیروانی سے تو وہ خوب کھل کر باتیں کر رہی تھی۔

”بیچھے رہنے والا بیچھے ہی رہ جاتا ہے۔“ ریشم نے اس کے پہلو میں ٹھوکا دیا۔ نچھو اپنی جھجک پر قابو نہ پاسکی۔

ریشم کو کسی نے شہزاد کے متعلق بتایا۔ ”زریں کا منگیتر۔“ ریشم نے زیر لب دہرایا اور پھر وہ نچھو کو کھینچتے کھینچتے شہزاد کے قریب چلی آئی۔ شہزاد اسے اپنے جذبے کی کشش سمجھا۔ زریں کی بھابھی نے تعارف کروایا۔

اور

پھر

ریشم شہزاد کو زریں کو منگیتر جان کر اس سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ اس کی باتوں میں رشتے کے ناطے سے چھیڑ چھاڑ کا عنصر بھی شامل تھا۔

ریشم شہزاد کی نگاہوں کی تپش محسوس کئے بغیر اس کی بولتی ہوئی خاموشی کو سننے بغیر اس سے باتیں کر رہی تھی۔

چائے کے دوران بھی دو ایک بار ریشم شہزاد کے قریب گئی اور پھر کوئی جملہ، کوئی بات اس کے ہونٹوں سے ایسی ضرور پھسل گئی جس پر وہ خود ہی بے اختیار نہ ہنس پڑی اور یہ ہنسی، یہ دلنشیں گونج شہزاد کی روح کے پرت کھولتی چلی گئی۔

فنکشن دکش تھا۔ شہزاد نے پیانو پر جو غزل سنائی۔ اس سے فنکشن کی دلاویزی میں اضافہ ہو گیا۔ گا بھی تو جیسے وہ بے خودی کے عالم میں رہا تھا۔

ریشم نے تو محسوس نہیں کیا۔ ہاں اکثر دیکھنے والوں نے شہزاد کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو ہر بار انہیں ریشم پر ہی مرکوز پایا۔

ریشم دیکھنے کی شے ہی تو تھی۔

شام گہری اتر رہی تھی۔ جب گہما گہمی کا تسلط ٹوٹنے لگا۔ لوگ واپس جانے لگے۔ زریں اس کی امی اور بھابھی رسی تکلفات ادا کرتے ہوئے مہمانوں کو رخصت کرنے لگے۔ ”میں کیسے جاؤں گی۔“ بیرونی برآمدے میں آتے ہوئے ریشم نے کہا۔ ”میرے ساتھ۔“ چھوٹے شوخ سی نظروں سے ریشم کو دیکھا۔ ”بھائی جان لینے آئیں گے۔“

ریشم کا چہرہ چمک اٹھا۔

”نہیں صاحب۔“ زریں نے جلدی سے کہا۔ ”ریشم کو لائی میں تھی، چھوڑنے بھی میں ہی جاؤں گی۔“

”مابدولت کی خدمات حاضر ہیں۔“ شہزاد نے کہا۔ وہ کھڑا جیسے انہی کی باتیں سن رہا تھا۔

زریں تو پھر مہمانوں کی طرف گھوم گئی۔ شہزاد ریشم اور نجی سے باتیں کرنے لگا۔ ”زریں مہمانوں سے فارغ ہو لیں، پھر ہم دونوں آپ کو چھوڑ آئیں گے۔“ شہزاد نے چشم شوق سے مہمانوں کو دیکھا۔

اور

ریشم ”ہم دونوں“ کے الفاظ پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”کیوں؟“ شہزاد ہمہ تن شوق تھا۔

”کچھ نہیں۔“ ریشم مسکرائی۔ ”ہم دونوں کا صیغہ ذرا۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر بڑے حسین انداز میں ہنس دی۔ نجی مسکرا رہی تھی اور شہزاد ہنسی کی شبنمی پھوار کا لطف لے رہا تھا۔

زریں کے منگیتور ریشم اشاروں کنایوں سے چھیڑ چھیڑ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ ”زریں کی شادی کب ہو رہی ہے۔“ اس نے اسی چھیڑ چھاڑ میں آنکھیں نہچاتے ہوئے شہزاد سے پوچھا۔

اور بیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ نجی بولی۔ ”بھائی جان آگئے۔“

شہزاد اور ریشم نے بیک وقت پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف دیکھا۔ ریشم تو اشی کو دیکھ کر گلناری ہو گئی۔ اس کی پیننی سیاہ آنکھیں خیرہ کن چمک سے بھر گئیں۔ اشی کی نگاہیں بارگاہ حسن میں سجدہ ریز ہوئیں اور پھر مسکراتے ہوئے وہ ان سب کی طرف آ گیا۔

زریں بھی ادھر آ گئی۔ نجی نے تعارف کا مرحلہ طے کروایا۔

”میری دوست زریں۔ اور اشی۔ بھائی۔“

”شہزاد“ اشی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے خود ہی شہزاد بولا۔

رسی تکلفاتی گفتگو کے بعد زریں نے اشی کو اندر چل کر بیٹھنے کی دعوت دی۔

”بہت بہت شکریہ۔“ اشی نے کہا۔ ”پھر کبھی سہی۔ اب تو اجازت دیجئے۔“

”میرے ساتھ ریشم کو بھی۔“ نجی نے ریشم کا ہاتھ پکڑا۔

”انہیں کیوں؟“ زریں سے پہلے شہزاد بولا اور جس انداز میں بولا اشی کو اچھانہ

لگا۔

”ہمارے ساتھ جائیں گی۔ ہم راستے میں ڈراپ کر دیں گے۔“ نجی بولی۔

”واہ واہ۔ ڈراپ اور۔ اور راستے میں۔“ زریں بولی۔ ”تمہارا گھر کدھر اور میرا

کدھر۔ میں نے کہا نا، انہیں چھوڑ آؤں گی۔“

”بالکل بالکل۔“ شہزاد بولا۔ ”ہم دونوں۔ دیکھئے ریشم ہنسے گا نہیں۔“

”نہیں ہنستی۔“ ریشم کی ہنسی پھوار چھوٹنے لگی۔

”ذرا یہ جمع کا صیغہ۔ اگر آپ وضاحت کر دیں تو اچھا ہوگا۔“

”آپ بڑی شریر ہیں۔“ شہزاد نے ریشم کو شوق بھری شوخ نظروں سے دیکھا اور

یہ شوخ سی چھیڑ چھاڑ اشی کو ڈس گئی۔ شہزاد کی آنکھوں کا اشتیاق اس نے پہلے لمحے ہی محسوس کر لیا تھا اور یہی بات اسے اچھی نہ لگی تھی۔ یہ محبت کی فطری تنگ نظری تھی یا چھٹی حس کا

خبرداری کا الارم۔ اشی کو اپنے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہونے لگیں۔

چند لمحے وہ بمشکل کھڑا رہا۔ ریشم اب بھی شوخ جملے کہہ کر شہزاد کو چھیڑ رہی تھی اور

شہزاد جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر صرف اسے ہی تنکے جانے کو آنکھیں وا کئے کھڑا تھا۔



پھر ریشم کی کسی بات پر شہزاد جھوم کر رہ گیا۔ اشی کا من اندر ہی اندر کھول گیا۔  
 ”چلو بچی۔“ اشی نے جیسے پتھر دے مارا۔ ریشم حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ ایک ایسی لڑکی اس کا چہرہ بدلنے کیوں لگا تھا۔ لہجے میں اتنی تلخی اس کے لیے نئی تھی۔  
 وہ کچھ سوچ بھی نہ پائی تھی کہ بچی نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چلنے کو کہا۔  
 ریشم نے زریں اور شہزاد کی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں۔ آپ خواہ مخواہ اتنا لمبا چکر کاٹیں گے۔“ زریں بولی۔

”میری گاڑی کھڑی ہے۔“ شہزاد نے اپنی لمبی سی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”ابھی چھوڑ آتے ہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں، کیوں ریشم؟“

ریشم شش و پنج میں پڑ گئی۔ کبھی شہزاد کو دیکھا اور کبھی اشی کو۔

اشی کا موڈ بگڑ گیا۔ ریشم کا شش و پنج میں پڑ جانا اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے بچی کو کندھے سے پکڑ کر گاڑی کی طرف کرتے ہوئے بے دلی سے زریں اور شہزاد کو خدا حافظ کہا۔ ریشم کی طرف دیکھا نہیں، منہ پھلائے تیزی سے قدم اٹھائے اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

زریں تو مہمانوں کی طرف گھوم گئی۔

شہزاد بھی بلال کے بلانے پر مڑ گیا۔

لمحے کی نزاکت و ہلاکت کو بھانپتے ہوئے ریشم جلدی سے گاڑی کے قریب آئی۔

”ٹھہریے میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“

اشی نے پوری قوت سے دروازہ بند کرتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ ”آپ کو

پہنچانے کے لیے بڑے بڑے لوگ موجود ہیں۔“

ریشم شش و پنج رہ گئی۔

اور وہ گاڑی نکال کر لے گیا۔

راستے میں تو بچی کچھ نہیں بولی۔ بڑے بھائی کا رعب مانع رہا۔ غصیلہ لہجہ اس سے چھپا تو نہیں تھا۔

ہاں گھر پہنچتے ہی اس نے کہا۔ ”آپ نے اچھا نہیں کیا بھائی جان!“

”کیا؟“ اشی بچھے بچھے چہرے سے اداس لہجے میں بولا۔

”ریشم۔“

”اس کا نام نہ لو۔“

”کیوں؟“

”میری مرضی۔“

وہ تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بچی نے منہ بنا کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔ شمو بھی ادھر آ گئی۔ بچی سے پارٹی کی باتیں سننے کو کبھی بہنیں بے تاب تھیں۔

”بڑے آئے۔“ بچی نے تنک کر کہا۔

”کون؟“ شمو نے پوچھا۔

اور بچی نے برآمدے میں کھڑے کھڑے ساری بات بہن کو بتادی۔

”موڈ بگڑا کیوں؟“ شمو نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”بس۔“ بچی ریشم کی توہین پر کٹی جا رہی تھی۔

”کوئی بات تو ہوئی ہوگی۔“

”نہیں باجی۔“ اور پھر اس نے اپنے اصرار اور شہزاد کی تکرار کا سرسری سا ذکر کیا۔

”تو ہوئی نا بات۔“

”کیا؟“



”ریشم کو پس و پیش نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”واہ اتنی سی بات۔“

”تم نہیں جانتیں نجھی۔ اشی کا موڈ اسی لیے بگڑا ہوگا۔“

”کچھ اخلاقی قاعدے بھی تو ہوتے ہیں ناں۔ وہ آئی بھی اور جناب اسے چھوڑ

آئے۔ بڑی توہین ہوئی ہے اس کی۔ میں تو کل کالج میں اس سے نظر ہی نہ ملا سکوں گی۔“

”معافی مانگ لینا۔ واہ قصور بھائی جان کا اور معافی مانگوں میں۔“

”تو پھر جانے دو۔ اشی جانے اور ریشم۔“ شمو نے کہتے ہوئے اس کا کندھا دبایا

اور پھر بڑے مسرور لہجے میں بولی۔ ”تم سناؤ پارٹی کیسی رہی۔“

”بہت شاندار۔“

”کتنے لوگ ہوں گے۔“

”تین سو تو یقیناً ہوں گے۔“

”یہ برتھ ڈے پارٹی تھی، زریں کی شادی تو پھر.....“

”ماشاء اللہ کیا شاندار ہوگی۔“

دونوں بہنیں پارٹی ہی کی باتیں کرتی اندر آ گئیں۔ جہاں چھوٹی بہنیں بھی جیسے

نجھی کے لیے چشم براہ تھی۔

”نجھی مزے لے لے کر پارٹی کے قصے سنانے لگی۔“

اشی کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ رات کھانا کھائے بغیر ہی وہ سو جانے کو تھا کہ شمو اس

کے کمرے میں آ پہنچی۔ ”نجھی بھی پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔“

”کیا بات ہے اشی۔“ شمو نے ادھر ادھر کی مارنے کے بعد براہ راست اشی

سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ پریشان لگتے ہو۔“

”پریشانی کس بات کی۔“

”کسی بات کی بھی ہو سکتی ہے۔“

”مثلاً.....“

”مثلاً یہی کہ.....“ شمو نجھی کو دیکھ کر شوخی سے ہنسی۔ ”کیوں نجھی۔ مثلاً یہی

کہ..... ریشم نے اشی صاحب کے ساتھ آنے میں پس و پیش سے کام لیا اور اشی صاحب

شہزاد کو دیکھ کر بھنا گئے۔“

اشی کو شوخی قطعاً نہیں بھائی۔ اس نے گھور کر نجھی کو دیکھا اور پھر غصے سے کتاب

میز پر پٹختے ہوئے اٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگا۔

”اشی تم نے بہت برا کیا۔“ شمو نے اس کی بے تابی دیکھ کر قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ وہ سختی اور تیزی سے جیسے غرایا۔

”ریشم کو چھوڑ آئے۔ حالانکہ وہ.....“ شمو کی بات ادھوری ہی رہی۔ اشی بولا۔

”وہ آنا ہی کب چاہتی تھی۔“

”غلط۔“ نجھی نے جلدی سے کہا۔

”تم چپ رہو۔“ وہ جیسے اس پر جھپٹنے کو تھا۔

”بھی تم تو سنجیدہ ہوتے جا رہے ہو۔“ شمو نے کندھے اچکائے۔ پھر لہجے میں

ملائمت لاتے ہوئے بولی۔ ”بڑے جذباتی ہواشی۔ معمولی سی بات کو یوں بڑھاؤ تو معاملہ

ہو چکا طے۔ ریشم کا قصور بھی کیا۔ جب زریں اسے گھر سے لے کر گئی تھی تو چھوڑنے میں بھی

وہ حق بجانب تھی۔ شہزاد نے اگر اپنی خدمات پیش کیں تو یہ اخلاقی تقاضا تھا۔ آخر وہ زریں کا

مگتیر ہے۔ اسے.....“

”زریں کا مگتیر.....“ اشی کو جیسے حوصلہ ساملا۔

”ہاں۔ اس کا کزن بھی ہے، مگتیر بھی۔“ نجھی بولی۔ ”خاصا شائستہ آدمی ہے۔“

ریشم زریں ہی کے لیے تو اسے چھیڑ رہی تھی۔

کہر کے بادل چھٹ جانے سے جیسے فضا مصفا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اشی کا چہرہ

بھی ہو گیا۔ اپنی جلد بازی پر متاسف سا نظر آنے لگا اور جب شمو اور نجھی نے مل کر اسے

خوب ہدف ملامت بنایا تو وہ بہنوں کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور مسکراتے

ہوئے بولا۔

”بس اب معاف بھی کر دو۔“

”معافی ہم سے کیسی؟“ شمو اترائی۔

”اور کس سے.....“ وہ شوخ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جس کی توہین کی ہے۔“ شمو نے کہا۔

”اچھا بھئی۔ اس سے بھی مانگ لیں گے۔ بس۔“

”ٹھیک ہے۔ اتوار کو ان لوگوں کی اپنے ہاں دعوت ہے نا۔ سب سے پہلا کام تم

ریشم سے معافی مانگنے کا کرو گے۔“

”بہت بہتر سرکار۔ کچھ اور بھی کہنا ہے یا بس۔“

”بس۔“

”تو پھر آپ دونوں تشریف لے جائیے باورچی خانے میں اور مابدولت کے

لیے کھانا گرم کر کے لے آئیے۔“

”واہ وا۔“

”اللہ قسم شمو زوروں کی بھوک لگی ہے۔“

”تمہاری سزا ہے بھوکے سو جاؤ۔“

”ایک اکلوتا بھائی اور بھوکا سو جائے، کیسے گوارا ہوگا آپ لوگوں کو؟“

اشی نے اتنے پیارے انداز میں کہا کہ شمو نے اس کے گال پر پیار سے تھپڑ

لگایا اور پھر نجھی سے کھانا گرم کرنے کا کہتے ہوئے اشی سے اس کی پڑھائی کے متعلق

پوچھنے لگی۔

اشی کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا۔

لیکن

ریشم کی طبیعت پر اگندہ تھی۔

اسے زریں اور شہزاد چھوڑ گئے تھے۔ سائرہ باجی نے پہلا سوال ہی پارٹی کی

دلچسپیوں کا کیا تھا۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ کسی سوال کا جواب دے۔ مختصر اُ، بے کیف

سے جواب دے کر اس نے پیچھا چھڑا لیا۔

سائرہ باجی سے تو اس نے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ بڑے قصے سنانے تھے۔

رات بھر اس کا مغز چاٹنا تھا۔

لیکن اس نے بجھے بجھے لہجے میں چند باتیں کیں۔ عشرت ناز کے متعلق بھی کچھ

نہیں کہا جس کے بارے میں وہ سائرہ باجی سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ یہ شاعرہ جب کالج

میں آتی تھی تو کتنی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ اس کی باتیں سننے کو سبھی ہمہ تن گوش تھے۔ بہت

اہم شخصیت بن جاتی تھی لیکن اس پارٹی میں وہ کیسی بے جگہ لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ

پارٹی میں سب لوگ پیسے کی زبان بولتے تھے۔ پیسے کی زبان سمجھتے تھے۔ ادب کی زبان کا

وہاں کیا کام تھا۔ اسی لیے تو کوئی اسے لفٹ نہیں دے رہا تھا۔

اور ثمنینہ کے متعلق بھی تو اس نے سائرہ باجی کو بتانا تھا۔ ثمنینہ! جس کی چھ ماہ پہلے

شادی ہوئی تھی۔ پارٹی میں وہ جس انداز سے آئی تھی، ریشم دنگ رہ گئی۔

چھ ماہ پہلے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہو گئی تھی۔ اس نے انکار کر دیا

تھا۔ سلیپنگ پلز کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ علی سے اس کا رومانس تھا لیکن شادی رحمان

سے ہو گئی۔ ریشم اور سائرہ اس کی شادی میں شریک ہوئی تھیں۔ سب کی طرح ان کا بھی یہ

خیال تھا کہ ثمنینہ مرنے بھی گئی تو بی بی کا شکار ضرور ہو جائے گی۔ اس کی شادی بربادی ہو گئی لیکن

پارٹی میں انتہائی موڈ، تہقہ بکھیرتی، نیم عریاں لباس کی جھلملاہٹ سے نگاہیں خیرہ کرتی۔

موٹے موٹے ڈائمنڈوں کی نمائش کرتی ثمنینہ کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی تھی اور اس نے سوچا

تھا کہ دولت محبت پر حاوی ہو سکتی ہے۔ اس ثمنینہ کے متعلق تو اس نے سائرہ باجی کو بہت کچھ

بتانے کا سوچا تھا لیکن وہ دلچسپی کی کوئی بات نہ کر سکی۔

تھک جانے کا بہانہ کر کے وہ جلدی سے بستر میں گھس گئی۔

یہ دوسری بات ہے کہ وہ ٹھیک طرح سے سونہ سکی۔

اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ لمحے کے ہلاکت آفریں دار کا نشانہ وہ بنی ہے کہ اشی۔

پہلے محمودہ بیگم اتریں۔

اس کے بعد سائرہ۔

عذرانے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔

اور ادھورے سے سلام دعا کے ساتھ شمو اور نجھی نے بیک وقت پوچھا۔

”ریشم کہاں ہے؟“

”وہ نہیں آئی۔“ سائرہ نے کہا۔

”کیوں؟“ نجھی نے جلدی سے پوچھا۔

”یونہی۔“ وہ مسکرا دی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ سائرہ کے ہاتھ تھامے تھامے شمو نے شاکی انداز میں کہا۔

”اس کی طبیعت کچھ اچھی نہ تھی۔ کالج کا کام بھی تھا۔“ دونوں بہنوں کی بے تابی

دیکھتے ہوئے محمودہ بیگم نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

”جھوٹ موٹ طبیعت خراب کر لی۔“ نجھی نے برا سا منہ بناتے ہوئے

کہا۔ ”کل تو اچھی بھلی تھی۔“

”آج بھی ہے تو اچھی بھلی.....“ سائرہ ہنس دی۔ ”بس ذرا موڈ بگڑ گیا۔“

”دونوں بہنوں میں لڑائی ہو گئی ہوگی۔“ عذرا بیگم مسکرائیں۔ ”اپنے ہاں بھی یہی

حال ہے۔ اوپر تلے کی بہنیں تو ہوتی ایسی ہیں۔“

عذرا جانتی تھی نہ محمودہ۔ اس لیے مفروضوں کی بات کر رہی تھیں۔ ہاں اشی کو کھٹک

گئی تھی اور نجھی، شمو نے بھی قیافہ لگا لیا تھا۔

ریشم کے نہ آنے کی وجہ پچھلی اتوار زریں کے ہاں ہونے والا ناخوشگوار واقعہ ہی

تھا۔

اشی بالکل چپ کھڑا تھا۔ محمودہ بیگم نے اسے کندھا تھپتھا کر پیار دیا تھا اور سائرہ

بھی بڑے تپاک سے ملی تھی لیکن وہ تو جیسے اس سارے تردد کو ہی فضول سمجھ بیٹھا تھا۔ اہتمام

ریشم ہی کے لیے تو تھا۔ وہ نہ آئی تو جیسے محفل کے جلتے چراغ ہی بجھ گئے۔ چار سو ویرانی ہی

ویرانی محسوس ہونے لگی۔

نجھی اور شمو تو باورچی خانے میں گھسی رہیں۔ چھوٹی بہنوں شگو اور آصی نے مل کر گھر کو خوب صاف کیا۔ اشی عثمان بیکری سے چائے کے لوازمات خود لے کر آیا تھا۔ سب کی حرکات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے کسی بہت بڑی اور اہم شخصیت کے استقبال کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

نجھی نے شامی کباب بنائے تھے۔ شمو نے چاٹ تیار کی تھی۔ دونوں بار بار خود چکھ کر اور ایک دوسری کو چکھا کر ذائقے کا پوچھ رہی تھیں۔ اطمینان تو ہو ہی نہیں رہا تھا۔ حالانکہ نجھی شامی کباب بنانے کی ماہر تھی اور شمو کے ہاتھ کی چاٹ کھانے والے چٹخارے لیا کرتے تھے۔

جوں جوں مہمانوں کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اہل خانہ کی ہلچل بڑھتی جا رہی تھی۔ اشی کی بے تابی تو دید کے قابل تھی۔ بہکی بہکی حرکات دید کے قابل تھیں۔ کبھی شگو کے سر پر تھپڑ لگا رہا تھا۔ کبھی شمو اور نجھی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ آصی کا ناک تو اتنے زور سے مروڑا تھا کہ وہ چیخ اٹھی تھی۔

صغیر احمد نے بھی آج جلدی دفتر سے لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ عذرا بیگم برآمدے میں کھڑی انہی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

چاروں بیٹیاں کام سے فارغ ہو کر کپڑے تبدیل کر رہی تھیں۔ چار بچے مہمانوں نے آنا تھا اور اب چار بچے ہی والے تھے۔

رکشا باہر رکنے کی آواز پر لپک جھپک چاروں برآمدے میں آ گئیں۔ اشی بھی جذبہ شوق دل میں چھپائے ان کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔

رکشا مہمانوں ہی کو لایا تھا۔

سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

لیکن اشی باہر ہی رہا۔ خوشیوں کے بے دردی سے نچے چہرے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ انتظار ٹوٹ جانے پر اضطراب کی ایک نئی کیفیت سے دو چار وہ چمن میں کبھی رک کر اور کبھی ٹبل کر سوچوں کو دھکیل رہا تھا۔ متضاد خیالات اس کے ذہن کو گھیرے تھے۔ کبھی تو اتنا غصہ آتا کہ ریشم کے ساتھ لگاؤ کے ریشمی ریشمی بندھنوں کو توڑنا بالکل اجنبی ہو جانے کو جی چاہتا اور کبھی اپنی زیادتی سے سہم کر ریشم کے قدموں میں جھک کر معذرت کر لینے کا خیال آتا۔

اپنے آپ میں الجھا شاید وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتا۔ شو باہر آ گئی۔

”وہ تم سے ناراض ہے اشی۔ اسی لیے نہیں آئی۔ تم نے بھی تو اس دن حد کر دی تھی۔ لڑکیاں قدرتی حساس ہوتی ہیں۔ سارہ کی باتوں سے میں نے تو یہی اخذ کیا ہے۔ بہت بری بات ہے۔“

وہ سر جھکائے بوٹ کی ٹو سے گھاس مسلتا رہا۔ شو چلی گئی تو اس نے بھی تذبذب کی حدیں پھلانگ لیں۔

چند لمحوں بعد وہ سکوتر ہوا میں اڑائے میناروں والی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔

گرمی کا آغاز خاصا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ پچھلے پہر کی دھوپ میں بھی خوب تندی تھی۔ ہواؤں کے جھکڑ نہ ہوتے تو موسم خوب تپ جاتا۔ موسم کی تپش تو جوتھی سوتھی، اشی کے افکار کی تپش اس کے چہرے کی چمکتی سرخی سے خوب عیاں تھی۔ پیشانی پر آئے پسینے کے قطرے اس نے اٹلے ہاتھ سے کئی بار صاف کئے۔

اور رومال سے پیشانی پونچھتا ہی وہ ریشم کے گھر میں داخل ہوا سکوتر کی آواز شاید ریشم تک نہیں پہنچی تھی۔ اسی لیے تو وہ سینے پر ٹرانزسٹر رکھے صوفے پر پاؤں رکھے لیٹی تھی اور کوئی سوگوار سی دھن تھی جس کی لے کے ساتھ ہتی چلی جا رہی تھی۔

اشی نے دروازے پر آہستگی سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ وہ برآمدے میں آ گیا اور ڈرائنگ روم کے ادھ کھلے دروازے کے قریب رک گیا۔

اندر سے سوگوار دھن کی آواز کسی نہ کسی فرد کی موجودگی کا احساس دلانے کو کافی تھی۔

اشی نے آہستگی سے دروازہ بجایا۔

”کون؟“ دفعتاً نغمہ رک گیا اور ریشم کی لوج دار آواز آئی۔

”اشی۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور من کی ہلچل دبائے کوٹھیاں کھولنے اور بند کرنے لگا۔

ریشم متوقع نہیں تھی۔ اسی لیے اس نام پر بھونچکی سی رہ گئی۔ اس سے تو دوبارہ کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

حیران، ششدر، متعجب۔ وہ ایک ہاتھ ٹرانزسٹر پر رکھے صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ریشم۔“ اشی نے پھر پکارا۔

جواب پھر بھی نہیں ملا۔

”میں اندر آ سکتا ہوں؟“ وہ بے تابی سے بولا۔

”جی؟“ ریشم کی آواز اور لہجے میں استعجابی کیفیت محسوس کرنے کے باوجود اشی

پٹ دھکیل کر اندر آ گیا۔

ریشم سر اسیسنگی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اشی نے بے صبری سے اسے سر تاپا دیکھا۔

ریشم نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ صادق جذبے خود ہی بول اٹھتے تھے۔ یہ پابندی قبول کرتے ہیں نہ قید۔ شاید یہی بات تھی جو ریشم اپنے آپ پر قابو پانے کے باوجود نگاہوں کے خیر مقدمی بے صبری اور والہانہ پن کو روک نہ سکی۔

حسین آنکھوں کی خیرہ کن چمک جب دعوت بن جائے تو کون کافر اسے رد کر سکتا ہے۔ اشی کمرے میں آتے ہی کچھ ڈانوا ڈول تھا بھی تو نظروں کے اس مستحکم سہارے سے حوصلہ پا گیا۔

لبوں پر ہلکا سا تبسم لیے وہ آگے بڑھا۔ ”ریشم۔“ اس نے بڑے پیار سے پکارا۔

وہ چپ رہی۔

”آپ آئی کیوں نہیں ہمارے ہاں؟“ اشی اس کے بالمقابل کھڑا بڑی بے تابی

سے پوچھ رہا تھا۔

ریشم نے نگاہیں اٹھائیں۔ اک بھر پور نظر اشی پر ڈالی۔

”نہیں آئی تو کیا فرق پڑا؟“ اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

”ریشم۔ آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسی انجان کیوں بن رہی ہیں؟“ وہ

بے چین ہو گیا۔

”آپ کی تقلید کر رہی ہوں۔“ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اس کی حاضر جوابی پر اشی کا کھلکھلا کر ہنسنے کو جی چاہا لیکن ریشم منہ موڑ کر جانے کو

قدم اٹھا رہی تھی۔ اشی لپک کر اس کے سامنے آ گیا۔

”سزا دے کر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔“

”میں کیوں سزا دینے لگی؟“ لہجے کا ٹھنڈا پن بھی کٹا رہا تھا۔

”آپ جانتی ہیں کہ اپنے ہاں دعوت کا اہتمام صرف آپ کی خاطر تھا۔ آپ نے

نہ آ کر میری خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔ بتائیے یہ سزا نہیں تو اور کیا ہے۔“ اشی بڑے جذباتی

لہجے میں بولا۔

ریشم نے بیگانہ سی نظروں سے اسے دیکھا۔

”خدا قسم آپ نے آج سارا پروگرام خراب کر دیا۔ کتنی شدید خواہش تھی آپ

شاید یقین نہ کریں۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”آپ آ جاتیں تو.....“

”کیوں آتی؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”اوہو۔“ اشی مسکرایا۔ ”ابھی غصہ باقی ہے کیا۔ معاف نہیں کریں گی۔ دیکھئے

ریشم مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ اس دن واقعی مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی۔ خدا جانے

کیوں؟“

”جی ہاں۔ کچھ ہی زیادتی ہوئی تھی۔“ ریشم کی حسین آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”اچھا ابھی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ معاف کر دیں نا۔“ وہ بڑے پیار سے اسے دیکھنے

لگا۔

”ہٹئے۔“ ریشم نے رخ پھیر لیا۔

وہ گھوم کر پھر اس کے سامنے آ گیا۔ خوبصورت سیاہ آنکھوں میں جھلملاتی شفاف

شفاف سی نمی کتنی حسین لگ رہی تھی۔ اشی ان آنکھوں میں ڈوب جانے کا متمنی تھا۔

لیکن ریشم روٹھی ہوئی تھی۔ اس دن کا سارا غصہ آج بھڑک اٹھا تھا۔

”ریشم۔“ اشی چھوٹی سی میز پر پاؤں رکھ کر گھٹنے پر اپنی کہنی ٹکائے بولا۔

”معاف کر دو نا۔“

ریشم نے جیسے سنا ہی نہیں۔ سر جھکائے پلکیں جھپکاتی کھڑی رہی۔ اشی اس کے

چہرے کے حسین خدو خال کو ایک ٹک ٹکے گیا۔

چند لمبے یونی گزر گئے۔

پھر

ریشم نے جھکا ہوا سرا اٹھایا۔

”آپ تشریف لے جائیے۔“

”چلا جاؤں؟“ اشی اس کے عین سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

ریشم چپ رہی۔

”معاف کر دیں تو ابھی چلا جاؤں گا۔ یونی بگڑی رہیں تو بخدا عمر بھر یہیں کھڑا

رہوں گا۔“ وہ تنک کر کھڑا ہو گیا۔

”بولیے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے جھک کر ریشم کی آنکھوں میں

جھانکنے کی کوشش کی۔ ریشم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”ریشم مجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے۔ معافی مانگ رہا ہوں۔ آپ اگر گھر میں

چھوٹی ہونے کی وجہ سے ضدی ہیں تو میں بھی اکلوتا ہونے کی وجہ سے اپنی منوانے کا عادی۔

ہاں آپ نہیں مانیں گی تو جاؤں گا میں بھی نہیں۔ چاہے آپ کی امی آ جائیں، باجی یا کوئی

اور۔“ اشی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اٹل لہجے میں کہا۔

”ہائے اللہ۔“ ریشم ذرا نرم پڑ گئی۔ اس کے نم آلود ہونٹوں میں ہنسی کرن بن

کر پھوٹنے کو تھی۔ اشی نے کرنوں کا اجالا محسوس کر لیا۔ وہ کچھ اور بے باک کچھ اور نڈر

ہو گیا۔

لہجے صاحب بندہ یوں معافی کا طلبگار ہے..... اشی نے زور سے دونوں ہاتھ

ملائے اور باندھنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ ”معاف کر دیں جناب۔ آئندہ ایسا جرم کبھی سرزد نہیں ہوگا۔“

اشی نے ہاتھ اس کے چہرے کے سامنے کرنے کو بڑھائے۔

”ہائے۔“ ریشم نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اس کے بڑھتے ہاتھ پیچھے ہٹانا چاہے لیکن وہ ہاتھ نہیں ہٹے۔

ہاں برقی تیزی سے اس کا اپنا ہاتھ ان دو مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آ گیا۔ ریشم کچھ اس طرح بوکھلائی کہ ہاتھ کھینچنے کا ہوش رہا نہ ہمت۔ اسے تو یوں لگا جیسے کئی سو کلو واٹ بجلی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے اور شدید ترین جھٹکوں سے وہ حواس کھو رہی ہے۔ گر رہی ہے۔ مر رہی ہے۔

شاید وہ گرنے ہی کو تھی کہ اشی نے بازو بڑھا کر اسے تھام لیا۔ دوسرے لمحے وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔

لمس کا یہ تجربہ دونوں ہی کے لیے انوکھا اور نیا تھا۔

ریشم بے سدھ تھی۔

تو

اشی بے خود۔

یہ سب کچھ شاید سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہوا لیکن یہ ہزارواں حصہ ہزاروں سالوں پر محیط تھا۔ غصہ رہا تھا نہ خفگی۔ اپنائیت کا بھرپور احساس چھا گیا تھا۔ فاصلے مٹ گئے تھے۔ دوریاں ختم ہو گئی تھیں۔ جنم جنم کا ساتھ تھا۔ ان کہی کہانی کہہ ڈالی گئی تھی۔ خاموشیوں نے تکلم کا روپ دھارا تھا۔ ساتھ جینے ساتھ مرنے کا عہد و پیمان خاموشی ہی میں ہو گیا تھا۔

کیف و سرور کا یہ جاودانی لمحہ ٹوٹا تو دونوں الگ ہو گئے۔ اشی نے کچھ کہا نہ ریشم کچھ بولی۔ کہتا بھی کوئی کیا۔ دامن کی وسعتوں سے کہیں زیادہ مل گیا تھا۔ سیری اور سیرابی کی کیفیت دونوں پر طاری تھی۔

چند لمحے مترنم سی خاموشی میں گزر گئے۔

اشی مخمور نگاہیں ریشم کے حسین پیکر پر جمائے ساکت سا کھڑا رہا۔

اور

جب ان نگاہوں کی حدت چلی تو ریشم لجا گئی۔ اپنے متمتاتے چہرے اور انگارہ انگارہ آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے وہ تو لہراتی بل کھاتی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

اشی وقت کے حسین التفات پر مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

-----○-----

رات کا سنہری شباب مخمور ہواؤں کی چھیڑ سے بڑا ہیجان خیز تھا۔ فضا میں نغمہ گئی تھی اور چمن کی سوئی ہوئی بہار چاندنی کی چادر میں بے سدھ پڑی تھی۔

آج نعیمہ کے ہاں بڑا شاندار فنکشن تھا۔ چوٹی کے دو فنکار مدعو تھے اور رات بھر موسیقی کا جادو جگانے کا پروگرام تھا۔ ساز و آواز کے رسیا جمع تھے۔ ڈرائنگ روم کا مغربی پن آج مشرقی انداز میں بدلا ہوا تھا۔ بڑے بڑے گاؤں کے دیواروں کے ساتھ لگے تھے۔ نرم نرم گدوں پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ شمعیں روشن تھیں۔ چھت میں لٹکے فانوسوں کی روشنیاں بھی خوابناک تھیں۔ خوشبودار اندھیروں میں شمعیں اور فانوس بڑی رومان پرور روشنی بکھیر رہے تھے۔

مچلتے سروں پر آواز کا جادو چل رہا تھا۔ اہل ذوق جھوم رہے تھے۔ کبھی تو دم بخود سی خاموشی داد بن جاتی اور حاضرین کی واہ واہ فنکاروں کی حوصلہ افزائی کا موجب بنتی۔

نعیمہ اور سلیم کے قریبی دوست اور خاندانی عزیز آئے ہوئے تھے۔ اشی کا پورا خاندان مدعو تھا لیکن صرف اشی اور شمو صغیر احمد کے ساتھ آئے تھے۔ ریشم کی امی تو ایسی محفلوں کی شیدائی نہ تھیں۔ سارہ اور ریشم کی خاطر انہیں بھی آنا پڑا تھا۔

سارہ تو سر کی دیوانی تھی۔ لگا و ریشم کو بھی تھا لیکن آج تو اسے سر کی کشش نے کھینچا تھا نہ نعیمہ کے اصرار نے۔ وہ توجذبوں کی لگن اسے کھینچ لائی تھی۔ جانتی تھی کہ اشی بھی آ رہا ہے۔

گانے کا سحر سننے والوں کے حواس کو پوری طرح مسحور کر رہا تھا۔ سارہ نعیمہ اور شمع بھابھی کے ساتھ گانا سننے میں مگن تھی۔ ریشم دروازے کے قریب بیٹھی تھی۔

”صاحب جی آپ کو بلا رہے ہیں۔“ گھر کی ملازمہ نے قدرے جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”کون صاحب۔“ ریشم نے پوچھا۔

”یوسف صاحب۔“ خادمہ نے خاندان کے ایک معمر آدمی کا نام لیا۔

”مجھے؟“ ریشم حیران سی ہوئی۔ پھر آہستگی سے جگہ بناتے باہر نکل گئی۔ برآمدہ برقی روشنیوں سے معمور تھا۔ ریشم نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ واپس لوٹنے کو تھی کہ اسے برآمدہ کے آخری گوشے میں محرابی دروں میں جھولتی بیلوں کے قریب کوئی کھڑا نظر آیا۔

وہ ادھر گئی۔

وہاں یوسف صاحب تو نہ تھے۔ ہاں اشی ضرور کھڑا تھا۔

”آپ؟“ ریشم ایک لمحہ کو بوکھلائی۔

”جی میں۔“ وہ شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”یہاں آپ کیا کر رہے ہیں۔“ ریشم نے نگاہ شوق اس پر ڈالی۔ کریم کلر شلوار قمیص میں وہ کتنا وجیہ لگ رہا تھا۔

”تمہارا انتظار۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

ریشم کا چہرہ گل گوں ہو گیا۔ حسین آنکھیں کھولتے بند کرتے اس نے اشی کو دیکھا۔

”اندر تو میرا دم گھٹنے لگا تھا۔“ اشی مخمور لہجے میں بولا۔

ریشم نے پھلی حیران آنکھوں سے اسے دیکھا۔ پھر بولی۔ ”موسیقی سے کوئی لگاؤ نہیں۔“ ”ہے۔“ وہ بولا۔

”تو پھر اندر دم کیوں گھٹنے لگا تھا؟“ ریشم نے بدستور حیرت زدہ آواز میں پوچھا۔

”نشست کا انتظام ٹھیک نہیں۔“ وہ شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“ وہ کچھ نہیں سمجھی۔

”بھئی عورتوں اور مردوں کے درمیان خط تنبیخ جو کھینچ دیا گیا۔ یہ کیا محفل

ہوئی۔“ اشی کی نگاہیں مخمور تھیں۔ وہ ہنسی ہونٹوں میں دبائے ریشم کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔



”آئیے جناب۔ ابھی سے خدمات کے لیے وقف کر لیا ہے۔“

قدم اٹھتے اٹھتے جیسے بہکنے لگے۔ ریشم نے حیا بار نظروں سے اشی کو گھورا۔

اور پھر دونوں آگے پیچھے چمن میں اتر گئے۔

انکل یوسف کہیں ہوتے تو ملتے بھی۔ ریشم کو جہاں کہیں ہیولا نظر آیا۔ ادھر گئی۔

اشی گنگنائی شوخیوں کو آنکھوں میں چھپائے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

ریشم نے اکتا کر چاروں طرف ایک بھر پور نظر ڈالی۔ ”اللہ جانے کہاں گئے۔“

میں تو جاتی ہوں۔“

لیکن پیشتر اس کے کہ وہ قدم اٹھاتی۔ اشی کا ہاتھ اس کی گداز کلائی کے پھسلنے گھماؤ

پر سختی سے جماتا تھا۔

ریشم پٹنگئی۔ اشی نے ہنستے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچا۔

”چھوڑیئے نا۔“ ریشم گھبرا گئی۔

”او چھوڑ دیا۔“ اشی نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ ریشم گھبراہٹ پر قابو

پانے کی کوشش کرتے ہوئے قدم اٹھانے لگی لیکن چند قدموں پر ہی اشی نے اسے روک لیا۔

”انکل یوسف کو نہیں ڈھونڈو گی۔“ وہ اس کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔

ریشم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ہنسی اس کے ہونٹوں میں مچل رہی تھی۔

شوخی مچلتی ہنسی سے ریشم معاملے کی نوعیت کچھ سمجھی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

”ریشم۔“ وہ اس کے دوپٹے کا کونا پکڑتے ہوئے بولا۔

”جی۔“

”کیا تم واقعی اتنی معصوم ہو یا بن رہی ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”اب بھی سمجھ رہی ہو کہ انکل یوسف نے تمہیں بلایا ہے۔“

”تو..... تو کیا آپ؟“

اشی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”اس بہانے کی کیا ضرورت تھی۔“ ریشم نے ناراض ہونے کی کوشش کی۔

”تو آپ کیا چاہتے تھے؟“ ریشم بھی شوخی ہو گئی۔ ”نشستوں کا کیا انتظام

ہوتا؟“

”سب گڈنڈ بیٹھے۔“ اشی نے ہاتھ سے شریر سا اشارہ کیا۔

”کیا فرق پڑتا؟“ وہ اترائی۔

”تم میرے قریب بیٹھتیں۔“ وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

”شریر۔“ ریشم ادائے دلربائی سے شرمیلی سی مسکراہٹ سے بولی۔

”خدا قسم میں تو گھنٹہ بھر میں بور ہو گیا۔“ اشی بولا۔

”بڑے بد ذوق ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”با ذوق صاحبہ آپ کیوں باہر تشریف لے آئیں۔ جب کہ محفل.....“ اشی نے

سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے یوسف انکل نے بلایا تھا۔“ ریشم سادگی سے بولی۔ ”جانے کہاں ہیں۔“

”یوسف انکل۔“ اشی نے چمن کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی دیر

ہوئی ادھر گئے تھے۔“

”چمن میں؟“ وہ حیرانگی سے بولی۔

”ہاں۔“ اشی نے جواب دیا۔

”تو مجھے کیوں بلایا؟“ وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

”معاف کرنا میں غیب کا علم نہیں جانتا۔“ اشی نیل کی پیتیاں نوچتے ہوئے بولا۔

ریشم تذبذب کے عالم میں کھڑی چمن کی طرف دیکھنے لگی۔

”جاؤ نا۔“ اشی ہونٹوں میں مچلتا تبسم دباتے ہوئے بولا۔

”ہائے۔“ ریشم نے بے دلی سے کہا۔ ”مجھ سے کیا کام آن پڑا انکل کو۔ لان میں

توروشنی بھی نہیں۔“

”چاندنی کا غبار پھیلا ہوا ہے۔“ اشی رومانی انداز میں گویا ہوا اور پھر ریشم کے

تذبذب کو دیکھ کر بولا۔ ”اکیلے ڈر لگتا ہے تو میں ساتھ چلوں؟“

ریشم نے اثباتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اشی کی مسکراہٹ بے قابو ہو ہو گئی۔

”تو پھر تمہیں باہر کیسے بلاتا؟“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

”باہر آنا ضروری تو نہیں تھا۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

”اب بنو نہیں۔“ بڑے پیار سے وہ بولا۔

”آپ نے اچھا نہیں کیا اشی۔“ ریشم کے لہجے میں خفگی تھی۔

”کیوں؟“ اشی برا مان گیا۔

”اتنا اچھا گانا ہو رہا تھا۔“ ریشم اور کچھ نہ کہہ سکی۔

”اوہ۔“ اشی مجھ گیا۔ ”معاف کرنا۔ تمہیں مفت میں پریشان کیا۔ تم جاسکتی ہو۔“

وہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ پھر اس کی طرف سے رخ موڑ کر مردہ مردہ قدموں سے جانے لگا۔

ریشم کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ اشی خفا ہو گیا تھا۔ ریشم نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔ اشی کی صحبت کے لیے تو وہ خود بھی چل گئی تھی۔ آج کی محفل میں شرکت ہی اس کی قربت کے لیے کی تھی۔ امی تو کسی طور آنے پر راضی ہی نہیں تھیں۔ وہ امی کو مجبور کر کے محض اسی لیے تولائی تھی کہ اشی بھی آیا ہوگا۔

اشی کی معصوم سی خوشیوں کا اس بے دردی سے گلا گھونٹنے پر اس کے ضمیر نے اسے خوب ہی ملامت کی۔ چند لمحے وہ ساکت سی کھڑی اشی کو جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے لبوں پر تبسم کی شبیہ پھوار پھونٹنے لگی۔ آنکھوں میں شوخی ناپنے لگی۔ تیزی سے قدم اٹھاتی وہ اشی کی پشت پر آ کر رک گئی۔

”اشی۔“ بڑی ملائمت سے اس نے پکارا۔

اشی رک گیا لیکن مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

ریشم مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی۔ ”ناراض ہو گئے جناب۔“

اشی منے سے بچے کی طرح منہ بنائے کھڑا رہا۔ ریشم ہنس پڑی۔ ”خفگی کی کیا بات

ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“

”جی ہاں۔ آپ نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“

”توبہ توبہ۔“ ریشم نے ادائے دلربائی سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”بڑے نازک مزاج ہیں آپ تو۔“

”تمہیں اس کی کیا پروا۔“ وہ سر کے ہلکے سے جھٹکے سے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے بولا۔

”اوہو۔ آپ تو سنجیدگی سے خفا ہو گئے۔“ ریشم اب بھی مسکرا رہی تھی۔

”ریشم تم۔ تم جاؤ۔ خواہ خواہ وقت ضائع کر رہی ہو۔ اندر اتنا اچھا گانا ہو رہا ہے۔“

وہ گھمبیر آواز میں بھرپور طنز کر رہا تھا۔ ”جانتی کیوں نہیں؟“

ریشم ہنس پڑی۔ ”اب تو آپ بھی چلے جائیں۔ جب بھی یہیں رہوں گی۔“ وہ ٹوٹے ہوئے درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔ اشی کا موڈ کچھ کچھ بدلنے لگا لیکن وہ سنجیدہ نظر آنے کی پوری پوری کوشش کرتا رہا۔

ریشم کو روٹھے محبوب کو نہانے کے لیے کتنی ہی باتیں کرنا پڑیں۔ کتنے ہی حیلے کرنا پڑے۔

”اب معاف بھی کر دیں صاحب۔“ اس نے ہاتھ باندھ دیئے۔

اشی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کے زور سے مروڑتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ ایسا کرو گی؟“

”اودی اللہ۔“ ریشم ساتھ ہی دوہری ہو گئی۔

”بے ایمان کہیں کی۔“ جھٹکے سے اشی نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ”اتنے پیار

سے میں نے بلایا اور اتنی بیدردی سے میری خوشیوں کا منہ نوچ لیا۔ گانا جیسے مجھ سے زیادہ اہم تھا نا۔“

”یہ بات نہیں تھی اشی۔“ ریشم نے ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

”تو اور۔“ وہ تنک کر بولا۔

”امی یا سارہ باجی پوچھ بیٹھیں تو.....“ وہ کہنے لگی۔ ”کیا کہیں گی وہ۔“

”تم صاف صاف بتا دینا۔ کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“ اشی ٹوٹے ہوئے درخت کے

تنے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں۔ آپ سچ ہی کہتے ہیں۔“

”واقعی سچ کہتا ہوں۔ کچھ بھی نہیں کہیں گی۔ دونوں جانتی ہیں۔“

بھی نہیں کر سکتا۔ بولو کیا تم بھی۔ تم بھی میرے متعلق ایسا ہی سوچتی ہو۔ ایسے ہی جذبات رکھتی ہو۔“

ریشم کے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ ریشم اشی کے جذبات کی قدر زبان سے تو نہ کر سکی۔ ہاں اس کا سر آپوں آپ اشی کے کندھے سے لگ گیا۔ یہ اس کے دلی جذبات کا خاموش اظہار تھا۔

فرط مسرت سے لبالب پیمانے کی طرح چھلکتا اشی جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ ریشم کے کانوں میں نغموں کی مترنم گنگناہٹ بڑی آسودگی سے اتر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی فردوسی کنج میں بیٹھے چشموں کے کنارے حوروں کے مقدس آنچلوں کے سائے تلے وہ ہر غم سے آزاد، ہر فکر سے دور مدہوش پڑی ہے۔



”کیا؟“ ریشم کے استفسار پر اشی مسکرایا اور پھر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”یہی کہ مستقبل قریب میں ہم دونوں ایک ابدی بندھن میں.....“

”ہائے اللہ۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔“

”حقیقت کی ریشم۔ مجھے اس وقت کا کس بے تابی سے انتظار ہے۔ میرا بس چلے تو ابھی۔“

”بس بس۔“

”سچ ریشم۔ انتظار کا تو ایک ایک لمحہ کٹھن ہوتا ہے لیکن کیا کروں۔ امی ابو نے کڑی شرط عائد کر رکھی ہے۔ جب تک مقابلے کا امتحان پاس کر کے کوئی اچھی سی نوکری نہ مل جائے وہ شادی تو کیا مگنی تک کرنے کو تیار نہیں۔“

ریشم سر جھکائے جھکائے مسکراتی رہی۔ پچھلے اتوار جب سائرہ اور امی اشی کے ہاں سے واپس آئی تھیں تو کچھ حسین سی سرگوشیاں، کوئی خوبصورت سے قیافے دونوں لگا رہی تھیں۔ ریشم کے کانوں میں بھی بھنک پڑی تھی۔ اب وہی باتیں اشی دہرا رہا تھا۔

”ویسے ریشم۔ امی اور ابو ہی نے نہیں میری سب بہنوں نے بھی تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ تمہاری امی سے اشاروں کنایوں میں عندیہ بھی بیان کر دیا ہے۔ لگتا ہے انہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ اشی بڑے شوق سے بتا رہا تھا۔ ریشم دل کی بے قابو دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالتی تھی۔

وہ ہمہ شوق باتیں کرتا رہا۔

”میں نے کئی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ کئی سے ملا ہوں۔ مراسم بڑھانے کا موقع بھی ملا ہے لیکن تم نے ریشم۔ تم نے جانے کیا جادو کر دیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں صدیوں سے تمہاری تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ پارہ شاید میرے ہی وجود کا دوسرا نام ہے ریشم۔ میں مدتوں سے اضطراب کی کیفیت سے دوچار تمہارا ہی متلاشی تھا۔“ وہ بڑا جذباتی ہو گیا۔ ریشم کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑتے ہوئے مضطرب لہجے میں بولا۔ ”ریشم تم میری زندگی ہو، میری خوشیوں کی انتہا ہو۔ میں اس گھڑی کا بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں جب تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا کر زندگی کا نیا سفر شروع کروں گا۔ تمہارے بغیر تو میں جینے کا تصور

آج موسم خاصا گرم تھا۔ دس بھی نہ بچ پائے تھے کہ فضا گرم ہونے لگی تھی۔ تپش اور گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہوا صبح ہی سے بندھی۔  
برآمدے میں تو ایک کونے میں بچھے تخت پر محمودہ بیگم بیٹھی تھیں۔ لگن میں تو ریاں، نمائز اور پیاز پڑے تھے۔ وہ سبزی بنارہی تھیں۔ قریب ہی سائرہ نیلے رنگ کے بیڈ کور پر خوبصورت رنگوں سے پھول بنارہی تھی۔ تھوڑی دیر ہی ہوئی چچی اور برابر کوشی میں رہنے والی بیگم ملک اٹھ کر گئی تھیں۔ ریشم نے ان کے لیے شربت بنایا تھا۔ بیگم ملک کے چار سالہ بچے نے شربت فرش پر گرادیا تھا۔ میٹھے پرکھیاں تو آہی جاتی ہیں۔ ریشم کا دل خراب ہونے لگا تھا۔

بچے کو اس کی بدتمیزی پر کوستے ہوئے وہ تیلیوں کا لمبا سا جھاڑو ہاتھ میں لیے آگئی تھی۔ بیرونی چمن والے لٹل کے ساتھ بڑکی پانی والی نالی لگا کر برآمدہ دھونے لگی تھی۔  
پاسینچے اڑ سے وہ جھکی جھکی برآمدہ دھورہی تھی۔ اس کے پاؤں پانی میں گلابی گلابی ہو رہے تھے اور بالوں کی لمبی سی ناگن چٹیا جھکنے پر بار بار بل کھا کر آگے کو لٹک رہی تھی۔  
بالوں کے سرے پانی میں بھیگ رہے تھے۔ قطرے موتیوں کی طرح سروں پر چمکتے ہوئے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے سے وہ خوب محظوظ بھی ہو رہی تھی۔

”اب بس بھی کرو بیٹی۔“ محمودہ بیگم نے پیاز کاٹتے ہوئے کہا۔

”اتنا گندہ ہو رہا تھا برآمدہ۔“ ریشم پانی کی دھار دونوں پاؤں پر ڈالتے ہوئے

بولی۔

”ہو گیا صاف۔ ٹھنڈا بھی۔ یہ چن گرد تو کمرے بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے۔“

”پہلے برآمدہ تو دھولوں۔“ ریشم پانی سے کھیلنے لگی۔  
”خوب صاف کرو۔ مہمان آرہے ہیں۔“ سائرہ نے شوخی سے ریشم کو دیکھا۔  
”صرف برآمدہ ہی صاف کرنا ہے۔ کمرے بھی تو جھاڑ پونچھ لو۔ تم بھی اب بیڈ کور چھوڑو۔“ ڈرائنگ روم بھی تو اچھی طرح صاف کرنے والا ہے۔ رات لڑکوں نے خوب اودھم مچایا تھا۔

”آج سب کچھ ریشم ہی کرے گی۔“ سائرہ نے کن انکھیوں سے ریشم کو دیکھا۔  
”کیوں؟“ ریشم تنک کر بولی۔

”تمہارے ہی مہمان آرہے ہیں نا۔“ وہ ہنسی دباتے ہوئے گویا ہوئی۔

”میرے کیوں۔“ ریشم کے گالوں پر شفق پھوٹ گئی۔

”بھی تمہاری ہی سہیلی ہے نیچی۔ اب ان کے امی ابو آرہے ہیں تو تمہارے ہی مہمان ہوئے نا۔“ سائرہ نے چبا چبا کر کہا۔

”اب تو وہ لوگ آپ کے ملنے جلنے والے ہو گئے ہیں۔ کوئی صرف میری سہیلی کے ماں باپ تو نہیں ہیں۔ کیوں امی جانی۔“ ریشم نے ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔  
”دو چار بار آپ ان کے ہاں جا چکی ہیں۔ پانچ چھ دفعہ وہ آچکے ہیں۔ نیچی بیچاری تو ایک ہی دفعہ آئی ہے۔“

”یہ لوگ بڑے مہربان ہو رہے ہیں۔ کیا بات ہے۔“ سائرہ نے ریشم کو شوخی سے چھیڑا۔

”اب میں کیا جانوں۔“ ریشم نے شوخی کی سزا کے طور پر چلو میں پانی بھر کر سائرہ پر اچھال دیا۔

سائرہ چیخی۔ اس کے بیڈ کور پر پانی پڑ گیا تھا۔ دوپٹے سے جلدی جلدی پانی پونچھتے ہوئے وہ ریشم کو کوسنے لگی۔ ریشم منہ چڑانے لگی۔

محمودہ بیگم نے مسکراتے ہوئے ریشم کو پیار سے ڈانٹا۔ آج وہ بہت خوش تھیں۔  
صغیر احمد اور عذرا آج آرہے تھے۔ ان کی آمد کسی مقصد ہی کے تحت تھی۔ یوں تو اشاروں کنایوں سے وہ اپنا مدعا کئی بار بیان کر چکے تھے۔ ریشم کے ماتھ جس طریق سے اظہار

کرتے تھے، وہ بھی ان کی ڈھکی چھپی خواہش کو عیاں کرنے کو کافی ہوتا تھا لیکن آج تو شاید وہ ریشم کا رشتہ مانگنے آرہے تھے۔ پیغام جو بھیجا تھا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

ریشم پانی کی نالی سے کھیلتی چمن میں اتر گئی۔

اور محمودہ بیگم سارہ سے باتیں کرنے لگیں۔

”لوگ تو بہت ہی اچھے ہیں۔ لڑکا بھی خوبصورت ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہے اور سلجھا

ہوا بھی۔“ محمودہ بیگم بولیں۔

”ہاں امی۔ ان لوگوں کا پکا پکا ارادہ ہے۔“ سارہ نے سوئی میں دھاگہ ڈالتے

ہوئے جواب دیا۔

”میری ریشم ماشاء اللہ بہت خوش قسمت ہے۔ اشی مقابلے کے امتحان میں بھی

بیٹھ رہا ہے۔ بہت بڑا افسر بن جائے گا۔“ وہ خوش ہو کر بولیں۔

”ریشم کی گزر بھی جب ہی ہوگی۔“ سارہ نے زہر خند سے کہا۔ ”چھوٹے موٹے

کو تو وہ نگاہ میں بھی نہیں لائے گی۔“

”اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے بیٹی۔ ہم جیسے لوگوں کو ایسے معقول رشتے مل جائیں تو

بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے۔ ویسے ریشم بھی تو سمجھ چکی ہوگی۔“ محمودہ نے جیسے راز جاننا چاہا۔

”بہت اچھی طرح سے۔“ سارہ ہنس پڑی۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ محمودہ بیگم نے اطمینان سے سر ہلایا اور پھر لگن اٹھا کر تخت سے

اتریں اور باورچی خانے کی طرف چل پڑیں۔

سارہ پھول بنانے لگی۔ ریشم کی خوش بختی کی وہ بھی قائل ہو گئی تھی۔ ریشم نے اشی

کے متعلق اسے کچھ کچھ بتایا بھی تو تھا اور اس کچھ کچھ میں اتنا کچھ تھا کہ سارہ ریشم کے ذہن

میں پھیلتے رنگ و نور کے سایوں سے خوب ہی متعارف ہو گئی تھی۔ اسی لیے جب بھی اشی کے

گھر سے کوئی آتا یا نہیں بلایا جاتا تو وہ ریشم کو مزے مزے سے چھیڑا کرتی۔

شام چائے کا اہتمام ریشم اور سارہ نے مل کر کیا۔ صغیر احمد اور عذرا بیگم پانچ بجے

کے قریب آ گئے۔

”بچیوں کو بھی ساتھ لاتے۔“ محمودہ بیگم نے دونوں کو دیکھ کر کہا۔

”وہ بھی آتی ہی رہتی ہیں۔“ عذرا بیگم بولی۔

”اور آتی ہی رہیں گی۔“ صوفی پر بیٹھتے ہوئے صغیر احمد ہنسے۔ ”ہم نے آنا

چھوڑ تھوڑے ہی دینا ہے اب۔“

”آپ کا اپنا گھر ہے بھائی صاحب۔“ محمودہ عذرا کے قریب بیٹھتے ہوئے

مسکرائیں۔

”اسی لیے تو روز روز چلے آتے ہیں۔“ عذرا نے کہا۔

لگاؤ اور محبت کے بھرپور جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

ریشم اور سارہ باورچی خانے میں چائے وغیرہ لانے کے لیے چلی گئیں۔ سارہ

نے صندل کا شربت تیار کیا۔ چائے سے پہلے مشروب کی ضرورت تھی۔

محمودہ بیگم کا خیال غلط نہیں تھا۔ چائے سے فارغ ہو کر جب وہ چمن میں کرسیاں

بچھو کر صغیر احمد اور عذرا کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں تو باتوں کا موضوع کئی موضوعات

سے ہوتا ہوا رشتوں ناٹوں پر آ گیا اور پھر باتوں ہی باتوں میں بڑے محزو و انکساری سے

صغیر احمد نے ریشم کو بیٹی بنالینے کا محمودہ بیگم سے کہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر مسکرا مسکرا کر بولے۔

”ہم ابھی اشی کے امتحان سے فارغ ہو کر کسی اچھے عہدے پر فائز ہونے کے

منتظر ہیں۔ باقاعدہ منگنی انشاء اللہ اسی وقت کریں گے۔ اب صرف اتنی گزارش ہے کہ ہم اس

بچی کے دل سے خواہش مند ہیں۔“

”یہ صرف اس لیے کہ.....“ عذرا بولیں۔ ”جوان بچی کے لیے شاید اور بھی

خواستگار ہوں۔ اس لیے ہمیں نظر میں ضرور رکھئے گا۔ میں تو ابھی کوئی بات منہ سے نکالنے

کے حق میں نہ تھی۔ جب تک اشی اس قابل نہ ہو جاتا لیکن احمد صاحب بھی ٹھیک کہتے ہیں اور

شو، نجھی کا بھی یہی خیال ہے کہ اپنی خواہش آپ کے گوش گزار ضرور کر دی جائے۔“

محمودہ بیگم چپ چاپ بیٹھی دونوں کی باتیں سنتی رہیں۔

”آپ نے ابھی ریشم کا رشتہ کہیں طے تو نہیں کیا؟“ خاموشی سے قدرے گھبرا کر

عذرا نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ فی الحال تو نہیں کیا۔“ محمودہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”کہیں ارادہ وغیرہ تو نہیں کر چکیں؟“ صغیر بے تاب سے بولے۔

”نہیں جی۔ فی الحال تو ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی تو سارہ سے فارغ ہونے کا سوچتی ہوں۔ پھر خالد کی باری ہے۔ آخر میں ریشم ہوگی۔“ محمودہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو گویا آپ کو ابھی جلدی نہیں؟“ صغیر خوشی سے بولے۔

”یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ ان کے سارہ اور خالد سے فارغ ہونے تک اشی بھی تو امتحان پاس کر کے معقول نوکری پا چکا ہوگا۔“ عذرا نے کہا۔

”انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔“ صغیر کرسی پر پورے اطمینان سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے۔

”دو تین سال تو لگ ہی جائیں گے۔“ صغیر نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ وقت گزر رہی جاتا ہے۔ آپ سارہ کی شادی کب کر رہی ہیں؟“

”چار چھ ماہ تک۔“ محمودہ بولیں۔ ”وہ لوگ تو اس سے بھی جلدی کرنا چاہتے ہیں لیکن تیاری کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔ آپ جانیں ہم جیسے لوگوں کے لیے تیاری بھی کتنا بڑا مرحلہ ہے۔“

”سچ کہتی ہیں۔“ عذرا بولی۔ ”مہنگائی تو کمر توڑ ہوتی جا رہی ہے۔ اس پر رسم و رواج دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ شو کے لیے چیزیں اکٹھی کر رہی ہوں۔ اللہ قسم دماغ چکرا رہا ہے۔ پانی کی طرح پیسہ لگ رہا ہے۔ پھر بھی عام سا جہیز بن پایا ہے۔“

”دن مقرر ہو گیا۔“ محمودہ نے پوچھا۔

”بس ہوا سمجھیں۔ لڑکے کی بہن باہر سے آجائے تو ہفتے عشرے میں شادی کر لیں گے۔ تیاری تو بہر حال ہمیں کرنا ہی ہے۔ اس ماہ کے آخر تک تو وہ آ بھی جائے گی۔“

اور

پھر عذرا اور محمودہ بڑھتے ہوئے اخراجات، رسم و رواج کی سیلابی صورت اور سفید پوشی کے کھرتے بھرم کا ذکر کرنے لگیں۔

صغیر صاحب خاموشی سے دونوں کی متفکرانہ باتیں سن کر زیر لب مسکراتے رہے۔ دونوں کی باتیں حالات حاضرہ کے دکھتے موضوع پر گھوم رہی تھیں۔ صغیر احمد بور

ہونے لگے۔ موضوع کو خوشگوار بنانے کے لیے ہنس کر بولے۔ ”محمودہ بہن، ہم اپنے بیٹے کی شادی پر ایک انقلاب لائیں گے۔“

عذرا اور محمودہ نے بیک وقت ان کی طرف دیکھا۔

”ہم جہیز کی رسم ہی اڑا دیں گے۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ شرعی کام کریں گے۔ ہماری بچی کے لیے تو آپ ہر وسوسہ دل سے نکال دیں۔ خدا قسم زندگی ہوئی تو آپ دیکھیں گی کہ شادی بغیر جہیز کے بھی ہو سکتی ہے۔ آپ ریشم کا تو بالکل ہی فکر نہ کریں۔“

محمودہ بیگم نے متفکرانہ انہیں دیکھا۔ عذرا بھی صغیر کی حامی بن کر محمودہ کو تسلی دینے لگیں۔ ”بیٹی کی شادی پر تو ہم مجبور ہیں لیکن بیٹے کی باری پر تو ہم رسوم اور پیسے کے زیاں سے اجتناب کر سکتے ہیں۔“ محمودہ بیگم نے سکون سے ایک گہرا سانس لیا۔ کاش سارہ کے لیے بھی ایسے ہی معقول لوگ ملتے۔ وہ سوچنے لگیں۔

جاتے جاتے دونوں میاں بیوی نے ریشم کو خوب پیار کرتے ہوئے التجا آمیز نظروں سے اپنی خواہش کا اعادہ کیا۔ محمودہ نے مسکرا کر صاف کر دی۔

-----○-----



”اشی“ شمو نے پیار سے نام لبا کرتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ اشی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

”جاؤ نا پلیز۔“

”نہیں جاؤں گا۔ آپ سب نے تو جیسے مجھے ملازم ہی سمجھ لیا ہے۔ دو پھیرے

کاٹ آیا، اب تیسری دفعہ پھر جاؤں۔ کوہو کا تیل ہوں نا۔“

”کیسے خراب ہو۔ اشی۔“

”بس خراب تو خراب سہی۔“

”بری بات ہے بھائی جان۔ باجی کی شادی ہو رہی ہے۔ روز روز تو اتنے کام

نہیں کرنا پڑیں گے آپ کو۔ ہماری طرف بھی تو دیکھیں۔ دن رات کام کر رہی ہیں۔“

”نچھی۔ چکنی چڑی باتیں مت کرو۔ ایسی ہیرا پھیری مجھے اچھی نہیں لگتی۔ بازار

ہی جانا ہے تو کل چلا جاؤں گا۔ اب تو جو چیزیں آگئی ہیں، انہی سے کام چلاؤ۔ ایک تو

گوٹے کناری ہی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔“ اشی گدے دار کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ

کسی طور اب پھر بازار جانے کو آمادہ نہیں تھا۔

”امی سے کہوں؟“ نچھی اس کی ہٹ دھرمی سے تنگ آ کر بولی۔

”ضرور ضرور۔“ اشی نے جیب سے سگریٹ نکالا اور دیا سلائی سلگاتے ہوئے

نچھی کو چڑاتے ہوئے بولا۔ ”خود چلی جاؤ نا۔ کونسا بازار کا راستہ نہیں جانتیں۔“

اشی دودفعہ شمو ہی کے کام کی غرض سے بازار سے ہوا آیا تھا۔ اب پھر کوئی چیز بھول

گئی تھی۔ رات بیٹھ کر دونوں بہنیں دو پنوں کی لیس اور کناری ختم کرنا چاہتی تھیں۔ شادی

میں بمشکل آٹھ دن تھے۔ دوڑ دھوپ شروع تھی۔ گھر میں پہلی شادی تھی۔ تجربہ باپ کو تھانہ

بیٹے کو۔ اس لیے کام پہاڑ سا لگ رہا تھا۔ اشی چڑچڑاتو اس لیے ہو رہا تھا کہ ان دنوں اس کی خوب درگت بن رہی تھی۔ کبھی ابا کام پر بھیج رہے ہیں۔ کبھی امی اور شمو کے لیے تو وہ بازار کے کئی کئی چکر دن میں لگا رہا تھا۔

”چائے بنا لاؤں۔“ شمو نے خوشامد کی۔ ”پیو گے؟“

”ضرور پیوں گا۔“ اشی سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔

”پھر تو لا دو گے نہ فیتہ اور گونا؟“ شمو پیار سے بولی۔

”اوں ہوں۔“ اشی نے سر صوفہ نما کرسی کی پشت سے نکا دیا۔

”اچھا۔“ شمو کچھ کچھ خفا دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”یاد رکھنا

تمہاری شادی پر میں بھی نکا سا جواب دے دوں گی۔ ایک کام نہیں کروں گی۔“

”واہ واہ۔ اب کی نا کام کی بات۔“ اشی سرور لہجے میں بولا۔ ”اپنی ہی شادی کی

پڑی ہے۔ ہمارا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ ہاں تو میری شادی پر کام نہیں کرو گی!“

”قطعاً نہیں۔“

”فرق کیا پڑے گا؟ یہ نچھی کس مرض کی دوا ہے اور پھر ابی ہیں۔ شکوہ ہے اور پھر

آصفہ کس لیے ہیں۔“

شمو نے اس جواب پر منہ بنایا۔ اشی اسے لا جواب دیکھ کر نہس پڑا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ شمو چڑ کر بولی۔ ”میں بھی تم سے خوب سمجھ لوں گی۔“

”یعنی۔“

”یعنی یہ کہ سارے کپڑے خود ہی ٹانگ لوں گی۔ ریشم ویشم کو بلانے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ سمجھے۔“

”بڑی استاد ہو شمو۔“

”بس میں نے کہہ دیا نا۔ نچھی سن لو۔ بالکل ریشم کو کپڑے ٹانگنے کی دعوت نہیں دینا۔“

”ٹھیک ہے باجی۔“

”کیا کہا؟“ اشی نے کرسی کے قریب دری پر بیٹھی نچھی کے بال کھینچتے ہوئے مسکرا

کر پوچھا۔



”تم ہمارا کہا نہیں مانتے تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے تمہارا خیال رکھنے کی۔“ شمو شوخی سے بولی۔ ”کیوں نہیں؟“

”بالکل بالکل۔“ نجھی بال چھڑاتے ہوئے ہنسی۔ ”ان کے لیے یہ سزا بالکل ٹھیک ہے۔ بڑے پروگرام بنارہے تھے بیچارے۔ ریشم روز آیا کرے گی تو یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ اچھا ہی ہو جو اسے سرے سے بلائیں ہی نہیں۔“

”شادی پر بھی نہیں۔“ شمو چہکی۔

دونوں بہنیں اشی کو خوب بنانے ستانے لگیں۔ رنگ برنگ دوپٹے، کونوں، فیتوں اور ستارے دار پٹیوں کے پیکٹ سامنے رکھے دونوں بیٹھی تھیں۔ اشی سگریٹ ٹھاٹھ سے پی رہا تھا۔ دونوں کی باتیں اسے خوب محظوظ کر رہی تھیں۔

جہیز کے کپڑے ٹانگنے کے لیے شمو نے ریشم کو بھی بلانے کا امی کو کہا تھا۔ سائرہ کے لیے بھی دعوت تھی اور جب یہ بات اس نے اشی کو بتائی تھی تو وہ کھل اٹھا تھا۔ خوشیوں کے سرچشمے اسے چاروں اور پھولتے محسوس ہوئے۔ شمو اب اسے نہ بلانے کی دھمکی دے کر اسے بازار بھیجنے پر آمادہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ مذاق کو خوب جانتا تھا۔ شمو اس کے لطف لینے سے چڑ بھی رہی تھی۔

وہ واقعی چڑ گئی۔

”اللہ قسم اشی تم میری چیزیں لینے نہ گئے تو کون کا فر ہے جو ریشم کو بلائے۔“

”اوہو ہو۔“ اشی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ شمو کے قریب جھکتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولا۔ ”اتنا ظلم نہ کرنا۔ لاؤ جلدی کرو جو کچھ منگوانا ہے، میں لا دیتا ہوں۔“

شمو اور نجھی اس کے جھک جانے پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

پھر وہ تین دن اشی کی زندگی کے ناقابل فراموش دن تھے۔ نجھی اور شمو نے محمودہ بیگم سے بہ منت سائرہ اور ریشم کے لیے اجازت لی تھی۔ دونوں بہنیں تین بجے کے قریب آ جاتیں اور رات گئے تک کپڑے ٹانگنے کا شغل رہتا۔ اشی بھی وہیں گھسا بیٹھا رہتا۔ قربت کی لذتیں نشہ بن کر رگ و پے میں اترتی رہتیں۔ شمو کبھی شوخی سے ڈانٹتی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ جاؤ نا، ابو کا کوئی کام کروادو۔“ وہ بھی متانہ نظروں سے ریشم کو دیکھتے ہوئے شمو

کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتا۔ ”میں تو تمہاری خاطر یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ چند دن کی تو بات ہے، پھر چلی جاؤ گی تو کہاں موقع ملے گا یوں بیٹھنے کا۔ میری شمو۔“

”بے ایمان کہیں کا۔“ شمو گلے میں پڑے مضبوط بازوؤں سے بمشکل اپنے آپ کو چھڑا پاتی۔ نجھی اور سائرہ ہنس پڑتیں اور ریشم کے گال تہمتا اٹھتے۔

اور جو کبھی امی کمرے میں آ جاتیں تو وہ بھی ڈانٹتیں۔ ”اتنے کام پڑے ہیں کرنے کو اور تم یہاں بیٹھے ہو۔“

تو وہ بڑی عاجزی سے ماں کو دیکھتا۔ جلدی سے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے کہتا۔ ”امی یہ کام تو میں ہی کر رہا ہوں۔ سب کی نظریں کنزور ہیں۔ دھاگے ڈالنے کے لیے مجھے ہی کہتی ہیں۔“

امی گھورتیں تو وہ شمو کو کندھا مارتے ہوئے اشارہ کر دیتا۔ شمو جھٹ کہتی۔ ”واقعی امی۔ یوں سارا کام بہت جلدی ہو رہا ہے۔ یہ دھاگے پروئے جارہا ہے۔ ہم کپڑے ٹانگتے جارہے ہیں۔“

امی باہر چلی جاتیں تو وہ سوئی کپڑوں پر ہی پھینک کر پرے ہٹ جاتا۔ اس کی اس بے ساختہ حرکت پر ہنسنے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔

معصوم شوخیوں اور بے ضرر قہقہوں بھری شرارتوں کو جلو میں لیے دن گزر رہے تھے۔ بچہ تو کوئی بھی نہ تھا۔ اشی کے جذبات کو کبھی سمجھتے تھے۔

تیسری شام کپڑے ٹانگنے کا مرحلہ ختم ہو گیا۔ آصفہ اور شگو چرمی سوٹ کیس اٹھا لائیں۔ ایک بڑا بکس بھی لے آئیں۔ ریشم اور سائرہ ترتیب سے اس میں کپڑے رکھنے لگیں۔ نجھی اور شمو سلائی کنڑھائی کی چیزیں پیٹی میں ڈالنے لگیں۔ اشی نے بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بنایا۔ کپڑوں سے بھرے بھاری بھاری سوٹ کیس وہی اٹھا کر امی کے کمرے میں لے گیا۔

کام سے فارغ ہو کر شمو نے اپنا کمرہ ٹھیک ٹھاک کیا۔ نجھی گرم گرم چائے بنا لائی۔ مکان چائے سے ہی دور ہو سکتی تھی۔ اشی اور عذرا نے بھی سب کے ساتھ چائے پی۔

ریشم اور سائرہ نے جس اپنائیت اور لگن سے کام کیا تھا۔ سب بڑے معترف تھے۔

عذرا بیگم تو ان لڑکیوں سے بے انتہا خوش تھیں۔ ریشم ان کا انتخاب تھی۔ اس کو پرکھنے جانچنے کا انہیں ان دنوں خوب موقع ملا تھا۔ ہنرمند اور سلیقہ شعار لڑکیاں انہیں ہمیشہ سے پسند تھیں۔ عادات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ پچھلے ہوئے موم کی طرح حالات کے سانچے میں ڈھل جانے کی ایسی لڑکیاں پوری صلاحیت رکھتی تھیں۔ یہ بات ان کے لیے بڑی اطمینان بخش تھی۔

عذرا چائے پیتے ہوئے ان کی تشکرانہ انداز میں تعریفیں کر رہی تھیں۔

”ایسا کون سا معرکہ مارا ہم نے خالہ جان۔ آپ تو یونہی.....“ سارہ نے کہا۔

”سرچڑھا رہی ہیں۔“ اشی نے سارہ کی بات جلدی سے پوری کر دی۔

”واقعی امی۔ آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے سارا کام انہی نے کیا ہو۔“ اشی کن اکھیوں سے ریشم کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”اور تم نے کیا ہے؟“ ماں نے پیار سے کہا۔

”آدھے سے زیادہ۔“ اشی پیالی پرچ میں رکھتے ہوئے بولا اور پھر انگلیوں پر کام گنتے ہوئے بولا۔ ”بازار کے لاکھوں کروڑوں چکر میں نے لگائے۔ سوئیوں میں دھاگے میں نے پروئے، چائے میں نے پلائی۔ ٹیپ کے گانے میں سنو اتا رہا۔ بتی بند ہو جانے پر اخبار سے انہیں پنکھا میں کرتا رہا۔ اور.....“

”شریر۔“ امی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ملازمہ انہیں بلارہی تھی۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

”ہنسنے کی کیا بات ہے۔ ایک بات بھی غلط کہی میں نے؟“ اشی نے معصوم چہرہ

بناتے ہوئے پوچھا۔

”پہلے مان لیتے ہیں۔ سارا کام آپ ہی نے کیا۔“ سارہ نے کہا۔ ”اب فرمائیے

کیا کریں سب۔“

”میں مفت کام نہیں کیا کرتا۔“ اشی بولا۔

”اجرت چاہیے؟“ نجھی بولی۔

”بالکل۔“ وہ بولا۔

”تو امی سے کہئے۔“ نجھی نے کہا۔

”شمو سے کیوں نہیں۔“ اشی نے شمو کی طرف دیکھا۔

”کیا لینا ہے؟“ وہ بولی۔

”آئس کریم۔“ اشی نے گویا سب کو دعوت دی۔

”ٹھیک۔ چلو سب آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔“ شمو نے حامی بھری۔

”خوب خوب۔“ نجھی بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ”کسی اچھے

ہوٹل میں جائیں گے۔“

”انٹرکون میں چلی چلو۔ بل تو شمو نے ہی دینا ہے۔“ اشی اٹھتے ہوئے بولا۔

”نہیں بھئی۔“ سارہ جلدی سے بولی۔

”کیوں؟“ شمو نے پوچھا۔

”ہمیں تو بس اب گھر ہی پہنچا دیں۔ امی انتظار میں ہوں گی۔“ سارہ نے کہا۔

”بہت اچھا۔ آپ کو راستے میں ڈراپ کر دیں گے۔“ اشی نے سارہ سے کہا۔

”آپ اکیلی ہی گھر جانا چاہتی ہیں نا۔“

”جی نہیں۔ ریشم بھی جائے گی۔“ سارہ نے مسکراتے ہوئے شونی سے اشی کو دیکھا۔

”یہ سراسر زیادتی ہے۔“ اشی بولا۔ ”ریشم ہی تو آئس کریم کھانے جانا چاہتی

ہیں۔ ابھی کہہ رہی تھیں۔“

”ہائے اللہ۔ میں نے کب کہا۔“ ریشم نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

”تو گویا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ اشی بھولا سا چہرہ بناتے ہوئے بولا۔

”سچ کا کبھی نام بھی سنا ہے جناب نے۔“ شمو نے ہنستے ہوئے اس کا کان پکڑ

لیا۔ اشی خواہ مخواہ چیخنے لگا۔

بہن بھائی کی چھیڑ چھاڑ پر دونوں بہنیں مسکرانے لگیں۔

سارہ ان کے ساتھ کسی ہوٹل یا ریستورنٹ میں جاتے ہوئے ہچکچاہٹ رہی تھی لیکن ان

کا اصرار، اتنی محبت اور پیار سے تھا کہ وہ رد نہ کر سکی۔

”ہم وہیں سے آپ کو گھر چھوڑ آئیں گے۔“ اشی نے کہا۔ ”اور ہوسکا تورات کا

کھانا بھی آپ کے ہاں ہی کھا کے آئیں گے۔“

”ضرور ضرور۔“ سارہ نے جلدی سے کہا۔ ”جو دال ساگ ہوگا، مل کر کھالیں گے۔“

”منظور ہے، منظور ہے۔“ شمو اور نجھی نے نعرہ سالگایا۔

”تو کیا کھائیں گے۔“ سائرہ نے پوچھا۔

”سرتو ابھی کھا رہے ہیں۔ دال ساگ وہاں ٹھیک رہے گا۔“ شمو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ریشم بھر پورا اور محمور ادا سے مسکرائے گئی۔

”جناب راستے میں ہم خریدیں گے تلی ہوئی مچھلی اور روٹی۔ جوان کے ہاں جا کر کھائیں گے۔ بل دیں گی یہی۔ کیوں جناب کیسی رہی؟“ اشی نے ریشم اور سائرہ کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ریشم اور سائرہ دونوں نے کہا۔

”نہیں نہیں یہ زیادتی ہے اشی۔“ شمو نے اشی کو گھورا۔

”زیادتی کیوں؟“ ریشم نے شمو سے پوچھا۔

”اشی بھائی ٹھیک ہے یہی پروگرام۔“ سائرہ نے مسکرا کر کہا۔

”ایک تو دونوں اتنے دنوں سے کام کر رہی ہیں۔ اس پر یہ تاوان۔“ نجھی نے

اشی سے کہا۔

”کام۔ کام۔ کام۔“ اشی ہنستے ہوئے بگڑ کر بولا۔ ”کوئی احسان کیا ہے۔“

”احسان نہ سہی، پھر بھی.....“ شمو نے نظروں سے اشی کو ڈانٹا۔

”دیکھو شمو۔ یوں گھور گھور کر مجھے چپ رہنے کی تلقین نہ کیا کرو۔“ اشی چپک کر

بولا۔ ”ان لوگوں نے کام کیا ہے تو اپنا گھر سمجھ کر ہی کیا ہے نا۔ کیوں جی؟“ اشی نے گردن کو

ہلکا سا خم دے کر دائیں طرف کھڑی ریشم کی طرف مستفسر اندہ دیکھا۔

”آپ کا اپنا ہی گھر ہے نا؟“

”بالکل ہے۔ بالکل ہے۔“ ریشم کے متماتے شرماتے چہرے کو دیکھتے ہوئے

جلدی سے بات گول کرنے کو شمو بولی۔ ساتھ ہی اشی کے بازو میں چپکے سے ناخن

چھوئے۔ اشی اچھل کر پرے ہٹ گیا۔ شوخ سی ہنسی اس کی آنکھوں میں مچل رہی تھی۔

انٹرکون سے آئس کریم کھا کر بازار سے مچھلی خریدی گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ

مچھلی کی قیمت سائرہ کے اصرار کے باوجود اشی نے اپنی جیب سے ادا کی۔

رات دس گیارہ بجے تک سب ریشم کے ہاں ہی گپ شپ لگاتے رہے۔ محمودہ بیگم کی موجودگی میں اشی بڑی معصومیت سے سر جھکائے لڑکیوں سے الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ اس کے یوں بننے پر ریشم چپکے چپکے مسکرا رہی تھی۔ سائرہ اور شمو بھی ایک دوسری کو آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر کے شوخ مسکراہٹوں کو دبا رہی تھیں۔

لیکن وہ تو بڑا سنجیدہ بنا بیٹھا تھا۔ کم گوسا۔ جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ محمودہ بیگم دس بجے کے قریب اٹھ گئیں۔ انہیں نماز بھی پڑھنا تھی اور صبح کے لیے دہی بھی جمانا تھا۔ ان کے اٹھتے ہی اشی بناوٹ کا لبادہ اتار کر اپنے رنگ میں آ گیا۔

”بڑے موقع پرست ہیں۔“ سائرہ نے کہا۔

”موقع پرست نہیں، موقع شناس کہئے۔“ اشی ہنسا۔

”بات تو ایک ہی ہوئی۔“ ریشم نے کہا۔

”یا خدا۔“ اشی نے ہاتھ ماتھے پر مارا اور پھر کئی ٹاپے یونہی ہاتھ رکھے رہے۔ پھر سراٹھا کر ریشم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟“

”فورتھ ایئر میں۔“ وہ بولی۔ شمو، نجھی اور سائرہ برابر مسکرائے جا رہی تھیں۔

”تو آپ کو موقع پرستی اور موقع شناسی کا فرق ہی پتہ نہیں چلتا۔ حد ہوگئی۔ میں تو آپ کو بہت لائق فائق سمجھتا تھا۔“

”ہیں تو لائق ہی۔ فارسی ان کا مضمون ہے اور ہمیشہ فرسٹ آتی ہیں۔“ نجھی بولی۔

”توبہ توبہ۔ یہی لیاقت ہے کہ موقع پرست اور موقع شناس کو ایک ہی بات کہہ

رہی ہیں۔“ وہ آنکھیں پھیلاتے اور اردوؤں کو خم دیتے ہوئے یوں بولا جیسے واقعی اسے ریشم

کی بات میں شک ہو۔

”تم اپنی کہو۔“ شمو نے ہنستے ہوئے اس کے بازو میں ناخن گاڑ دیئے۔ ”پڑھائی

کو تو خیر باد کہہ رکھا ہے۔ امتحان دو گے تو لیاقت کا پتہ چل جائے گا۔“

”ہم لیاقت کے جھنڈے گاڑ دیں گے جناب۔“ اس نے مکاتان کر بازو بلند

کرتے ہوئے اس انداز سے کہا کہ سب بے اختیارانہ ہنس پڑیں۔

سارہ کی منگنی کی رسم کے لیے محمودہ بیگم سامان اکٹھا کر رہی تھیں۔ کپڑے تیار کر لیے تھے۔ اب دعوت کا اہتمام کرنا تھا۔ ان کی منتظر تھیں کہ آکر بتادیں۔ کتنے لوگ آرہے ہیں۔ یہ پتہ چلنے پر ہی وہ اپنے عزیزوں اور ملنے والوں کی فہرست بنا سکتی تھیں۔ ویسے ریشم نے تو اپنی سہیلیوں کے نام ابھی سے لکھ رکھے تھے۔ امی نے حالات کے پیش نظر اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں کو بلانے پر ریشم کو ملائمت سے سمجھانا چاہا تو وہ بگڑ گئی..... ”ہمارے حالات تو کبھی اچھے ہوں گے ہی نہیں..... ہمارے جیسے لوگ تو کسی کو بلاتے ہی نہیں ہیں ناں تقریبوں پر؟“

”شادی پر بلا لینا۔“

”میں تو منگنی پر ہی بلاؤں گی..... سب کے ہاں میں دو دو تین بار جا چکی ہوں۔ اب ان سب کو بلانا بہت ضروری ہے اور خچی کو تو دو تین دن یہیں رکھوں گی۔ ان کے ہاں بھی شمو کی شادی پر میں اور سارہ باجی رہ کر آئے ہیں۔“

امی ریشم کی عادت کو جانتی تھیں، اس لیے چپ ہو گئیں۔ جب موقع آئے گا، دیکھا جائے گا۔ یہی سوچ کر وہ کام میں لگ گئیں۔ موقع آیا ہی نہیں۔

اس شام ڈھلے سہیل کی دونوں بھابیاں آگئیں۔ محمودہ بیگم سمجھیں منگنی کی تاریخ طے کرنے آئی ہیں۔

شربت اور پھل وغیرہ سے ان کی خاطر مدارت کی گئی..... منگنی کا ذکر چھڑا تو دونوں آپس میں آنکھوں کے خوشگوار اشارے کرتے ہوئے مسکرائیں۔

محمودہ بیگم کچھ نہ سمجھیں..... اس لیے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”بات یہ ہے باجی۔“ سہیل کی بڑی بھابھی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہم تو آج

ہی منگنی کرنے آئے ہیں۔“

”جی۔“ حیرت سے محمودہ بیگم نے دونوں کو دیکھا۔

”جی ہاں..... ہم آج سارہ کو انگوٹھی پہنانے آئے ہیں۔ شگن ہی کرنا ہے، لمبی چوڑی منگنی پیسے کے زیاں کے سوا ہے ہی کیا۔ شادی چونکہ جلدی کرنا ہے، اس لیے اس کی ضرورت بھی نہیں..... شریفوں میں تو زبان ہی دینا کافی ہوتا ہے۔“ بڑی بھابھی نے کہا۔

”مہنگائی کمر توڑ ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں ایسی رسمیں فضول ہی تو ہیں۔“ چھوٹی بھابھی بولی۔

”پڑھے لکھے لوگوں کو رواجوں کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔“ بڑی بھابھی نے ریشم کی طرف جوان کی پیش کش پر منہ بنائے جا رہی تھی..... ”کیوں بی بی..... آپ کو کچھ اعتراض ہے۔“

”اعتراض کیسا؟“ ریشم سے پہلے ہی محمودہ بیگم بولیں۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ ایسے معقول اور حقیقت پسند ہوں گے۔

”تو پھر بسم اللہ کیجئے۔ جاؤ بیٹی بلا لاؤ سارہ کو۔“ بڑی بھابھی نے ریشم سے کہا۔

”میں خود لے آتی ہوں۔“ چھوٹی بھابھی بے تکلفی سے انھیں..... ”آؤ ریشم

میرے ساتھ۔“ ریشم چہرے پر ناخوشگوار سے اثرات لیے اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگئی۔ سارہ باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی۔

”آئیے باجی۔“ ریشم نے کہا۔

”کہاں؟“

”ڈرائنگ روم میں۔“

”کیوں؟“

”آپ کی منگنی ہو رہی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب میں سمجھاتی ہوں۔“ چھوٹی بھابھی جو باورچی خانے کے باہر کھڑی تھی۔

ہنستے ہوئے اندر آگئی۔ سارہ کے گلے میں دایاں بازو جمائل کرتے ہوئے وہ مسکرائی۔ ”ہم

شگن کی انگٹھی پہنانے آئے ہیں تمہیں..... آؤ..... بڑی بھابھی پہنائیں گی۔“  
سارہ حیران حیران دونوں کو دیکھنے لگی۔

”یہ لوگ منگنی گول کر گئے ہیں سارہ باجی.....“ ریشم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ بھابھی صرف مسکرائی، کچھ بولی نہیں۔ سارہ کی کلائی پکڑے..... وہ اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں بڑی بھابھی اور محمودہ بیگم رسم و رواج کو موضوع بنائے سرگرم گفتگو تھیں۔ محمودہ بیگم من ہی من میں خوش ہو رہی تھیں۔ منگنی پر اٹھ جانے والی رقم شادی پر کام آ سکتی تھی۔ سہیل کی بھابیوں کی حوصلہ افزائی سے ان کے تفکرات کم ہو گئے تھے۔

سارہ نے شرمنا لجانا کیا تھا۔ ہاں آنکھوں میں حیا کے سائے ڈول رہے تھے۔ اس کا سر قد رے جھکا ہوا تھا۔ بھابھی نے بڑے پیار سے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔

چھوٹی بھابھی نے اپنا غنابی دوپٹہ سارہ کے سر پر ڈال کر پسید دوپٹہ اتار لیا۔

”اجازت ہے جی۔“ بڑی بھابھی نے اپنے بٹے سے انگٹھی کی ڈبی نکالی۔

”بسم اللہ کیجئے۔“ چھوٹی بھابھی نے سارہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے

ہوئے بڑی بھابھی سے کہا۔

بڑی بھابھی نے پھر محمودہ بیگم کی طرف دیکھا۔ اجازت طلب نظریں محمودہ بیگم کے اشارے کی منتظر تھیں۔ محمودہ بیگم نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ریشم صوفے کی پشت پر کھڑی تھی..... سونے کی ہلکی سی انگٹھی اسے پسند نہ آئی تھی۔

”مبارک ہو۔“ بھابھی نے انگلی میں انگٹھی پہناتے ہوئے کہا۔

”منہ میٹھا کرایئے۔“ چھوٹی بھابھی نے کہا۔

”مٹھائی تو ہے نہیں۔ ریشم تھوڑی سی چینی ہی پلیٹ میں ڈال لاؤ.....“ محمودہ

بیگم نے کہا اور پھر دونوں بھابیوں کو بھی مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ ”اللہ میری بچی کے نصیب اچھے کرے۔“

”آمین۔“ دونوں بولیں۔

پھر تینوں بیٹیوں کے نصیب ہی کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ سارہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آج وہ واقعی پرانی ہو گئی تھی۔ خوشی کے احساس کے ساتھ رنج کا غیر محسوس

ساد باؤ افسردہ کر رہا تھا۔ کچھ کھو دیا تھا۔ کچھ پالیا تھا۔ ملی جلی کیفیت تھی۔ ہونٹوں پر تبسم اور آنکھوں میں نمی لیے وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

محمودہ بیگم کا دل بھی بھرا آیا تھا۔ باپ کی کمی اور بھائی کی عدم موجودگی دکھ دیئے بغیر نہ رہی۔

چینی سے منہ میٹھا کرنے کے بعد سب نے پر تکلف سی چائے پی۔ ریشم نے مائی کو بھجوا کر مٹھائی کا ڈبہ منگوا لیا تھا.....

دونوں بھابیوں کو محمودہ بیگم نے دو جوڑے پیش کئے جو ان کے شریفانہ انکار کے باوجود انہوں نے دے ہی دیئے اور جمعہ کو سہیل کو بھی انگٹھی پہنانے آنے کا انہیں کہہ دیا۔

وہ دونوں ہنسی خوشی رخصت ہو گئیں تو ریشم پھٹ پڑی۔ ”یہ کیا طریقہ ہوا۔ اتنے دنوں سے ہم پروگرام بنا رہے تھے۔ وہ جنابہ سب الٹ پلٹ کر گئیں..... کتنا لطف آتا۔ باجی کو دلہن بناتے۔ دھوم دھڑکے سے منگنی ہوتی.....“

”ریشم اب تم بالکل ہی بچی نہیں ہو جو حالات کو سمجھ نہ سکو، ہمیں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایسے لوگوں سے ماٹھا لگایا۔ مجھے تو دن کو چین ملتا تھا نہ رات کو۔ تھوڑا تھوڑا کرتے بھی ہزاروں ہی کا خرچ تھا۔“ محمودہ بیگم نے کچھ اس افسردہ انداز سے کہا کہ ریشم کا دل دکھ گیا..... پہلی بار اسے اپنے حالات کا جیسے اندازہ ہوا۔

”یہ سب امیروں کے چونچلے ہیں۔“ امی بولیں۔ ”جی کس کا نہیں چاہتا..... لیکن مجبوری بھی تو ہوتی ہے۔ باپ سر پر نہیں بھائی کے سر پر پڑے ہیں..... وہ بھی اللہ جانے کیا کر رہا ہے۔ خرچے میں بے قاعدگی ہے۔ خط ہفتوں بعد لکھتا ہے۔ آخر میں کس بل بوتے پر دھوم دھڑکے سے منگنی رچاتی۔ وہ تو میرے مولا نے خود ہی عزت رکھ لی..... جو وہ لوگ صرف شگن پر ہی آمادہ ہو گئے۔“

ریشم کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں نمی آ گئی..... اس نے سوچا متوسط طبقہ واقعی ضرورت کے دوزخ کا ایندھن ہے۔ مجبوری اس کی خواہشوں، خوشیوں اور آرزوؤں کو نگل جاتی ہے۔

”لائی ہوں۔“

شمو کرسی پر بچھنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ شگو اس کے نئے نئے کٹے بالوں کی تعریف کرنے لگی..... ”باجی آپ پر بہت اچھے لگ رہے ہیں یہ بال۔“

”شعیب کو یہی سائل پسند ہے۔“ شمو بولی۔

”بھائی جان بڑے فیشن ایبل لگتے ہیں۔“ آ صی بولی۔

”شکر ہے پرانے ٹائپ کے نہیں۔“ شگو بولی۔

نجھی کپڑے لے آئی۔ سفید لٹھے کی شلوار ہلکے گلابی رنگ کی پھول دار قمیص اور گلابی ہی دوپٹہ۔ شمو کپڑے لے کر غسل خانے میں گھس گئی۔ کتنی ہی دیر وہ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہاتی رہی۔ جب وہ باہر آئی تو سکون کا گہرا سانس لیتے ہوئے وہ کرسی پر عین سچے کے نیچے آ بیٹھی۔ بھیکے بالوں کو تو لیے سے مل کر سکھاتے ہوئے وہ نجھی سے باتیں کرنے لگی۔

شگو کو امی نے باہر بلایا اور آ صی شمو کے پسینے سے بھیکے کپڑے برآمدے میں پھیلانے لے گئی۔

”سارا دن کیا کرتی ہو نجھی۔ کچھ سلائی کڑھائی ہی کیا کرو۔“ شمو نے قریب ہی پلنگ پر لیٹی ہوئی نجھی سے کہا۔

”سوچ رہی ہوں“ نجھی کروٹ کے بل ہوتے بولی۔ ”وقت گزاری کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا..... میں تو خود بھی بور ہوتی رہتی ہوں۔ کالج جانا نہیں ہوتا..... گھر پہ کوئی کام نہیں.....“

”امی سے کہہ کر دوستی وغیرہ منگوا لو..... چھوٹی موٹی کتنی چیزیں ہوتی ہیں بنانے کی۔ سب کچھ تو خرید انہیں جاسکتا..... سلائی تو ساری خود ہی بنانا.....“

”تمہاری شادی کیا ہوگئی..... واعظ بن بیٹھیں۔ کرلیں گے سلائی بھی۔ ابھی کون سا بیاہ رہنے کو ہے ہمارا.....“

”کوئی پتہ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے جلد ہی کوئی رشتہ مل جائے.....“

”معاف رکھو جی۔ میں تو ابھی ایم اے کروں گی۔“

چھت کا پنکھا گھر گھر رچل رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ دریا اٹھا کر نجھی نے فرش پر خوب پانی بچھایا تھا۔ کرسیاں گھسیٹ کر سچے کے نیچے کر لی تھی۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی لیکن گرمی کا زور ٹوٹ نہیں رہا تھا۔

شمو تھوڑی دیر پہلے ہی آئی تھی۔ ریشمی لباس جسم میں آگ لگا رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پسینہ بننے سے کپڑے جسم سے چپک کر اور بھی تکلیف دے رہے تھے۔ نجھی، شگو اور آ صی نے ہلکے پھلکے وائل کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

”نجھی۔“ شمو نے دوپٹہ کرسی کی پشت پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“

”بھئی کوئی وائل کی قمیص مجھے بھی دے دو۔ ان کپڑوں سے تو جسم جل اٹھا ہے۔ گرمی میں تو کوئی بھی شادی نہ کروائے۔ اچھا خاصا عذاب ہے۔“

”وائل کی قمیصیں بنوالیں نا.....“ نجھی نے کہا۔ ”ان کپڑوں کو تو دیکھ دیکھ کر ہی گرمی لگ رہی ہے۔ جانے تم نے کیسے پہن رکھے ہیں۔“

”بھئی گھر والے پہننے ہی نہیں دیتے سوتی کپڑے۔ ساس محترمہ تو کہتی ہیں۔ سلمیٰ رٹے لگے کپڑے ہر وقت پہنے رہوں۔ کل گرمی سے تنگ آ کر میں نے چوڑیاں اتار دیں تو غصے ہونے لگیں.....“

”نئی نئی ہیں نا، چادڑ چلے ہو رہے ہیں۔“

”نہیں نجھی..... لوگ بھی اچھے ہیں۔“

”خدا کرے اچھے ہی ہوں.....“

”اچھا تم مجھے اپنے کوئی وائل کے کپڑے دے دو، یہاں تو آرام سے بیٹھوں ذرا۔“



”رشتہ نہ ملا تو پڑھتی رہنا..... مل گیا تو ایک دو تین۔“

”پہلے بھائی جان سے تو نوٹ لیں۔“

”کہاں ہے وہ۔ ابھی آیا نہیں آفس سے.....“

”میچ کھیلنے گئے ہیں.....“

”میچ ہی کھیلتا رہتا ہے یا کبھی پڑھتا بھی ہے۔ اس کے امتحان کی تاریخ تو آگئی

ہے۔“

”بس..... سو سو.....“

”کیوں.....؟ مقابلے کا امتحان ہے، کھیل تو نہیں۔“

”رات کو پڑھتے ہیں گھنٹہ دو گھنٹے.....“

”کتنی غلط بات ہے.....“

”انٹیلی جنٹ ہیں.....“

”انٹیلی جنسی..... سے ہی کام نہیں چلتا نجھی۔ محنت کی بھی تو ضرورت ہے اور

اسے پتہ بھی ہے۔ جب تک یہ امتحان پاس نہیں کرے گا منگنی ہوگی نہ شادی۔“

نجھی نے کندھے اچکا کر رخ بدل لیا۔ شمو نے تویہ کرسی کی پشت پر پھیلا دیا۔ بے

ترتیب بالوں کو وہ انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے بولی۔ ”ریشم کا کیا حال ہے..... وہ وہ کیا

کرتی رہتی ہے آج کل.....“

”کتنے ہی دن ہو گئے ان میں سے کوئی آیا نہ ہم گئے۔“

”اس کے پرچے کیسے ہوئے تھے.....“

”اچھے ہی ہوئے۔ صرف انگلش بی اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو سکا۔ بیچاری

پریشان بھی تو تھی۔“

”پریشان کیوں؟“

”اس کے گھر میں ان دنوں خاصا جھگڑا کھڑا تھا.....“

”وہ کیوں؟“

”اس کے بھائی جہاں شادی کرنا چاہتے ہیں، ان کی امی کو وہ پسند نہیں.....“

”لڑکی اچھی نہیں.....“

”پتہ نہیں..... ملتان میں ہی ہیں جہاں وہ ان دنوں ملازم ہیں۔ کوئی چکر چلا رکھا

ہے۔ کسی معمولی سے خاندان کی معمولی سی لڑکی ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر لڑکی اچھی ہے تو پھر انہیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔“

”پتہ نہیں اب کیا بنا۔“

”تم اس کے پاس گئی ہو تیں۔“

”بس جا ہی نہ سکی۔ ایک دو دفعہ امی بھی تیار ہوئیں لیکن مہمان آ گئے.....“

”چلو آج شام چلتے ہیں.....“

”ٹھیک ہے..... غروب آفتاب کے بعد جائیں گے۔ گرمی ذرا کم ہو جائے۔“

”اچھا۔“ کہتے ہوئے شمو اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی

ہوئی..... اپنے بٹوے سے کنگھی نکال کر بالوں میں ڈالی۔

”ہیلو“ اشی بیٹ گھماتا کمرے میں داخل ہوا۔ سفید پتلون پر اس نے سفید ہی

قمیص پہن رکھی تھی۔ کھلے گریبان سے اس کے سینے کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ حدت

سے چہرہ تپ رہا تھا اور پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پکھل رہی تھیں۔

”شمو آگئی.....“ وہ بیٹ کرسی پر پھینکتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

”کیا حال ہے اشی؟“ شمو اس سے لپٹ گئی۔

”ٹھیک ہوں۔ تم اپنی کہو۔ سسرال جا کر اتنا دل لگا لیا کہ بھول ہی گئی

ہمیں.....“ اس نے شمو کے بالوں میں پیار کرتے ہوئے کہا۔

”تم کون سا آگئے تھے ملنے.....“ الگ ہوتے ہوئے شمو بولی۔ ”پنڈی کوئی کوہ

قاف تو نہیں.....“

”بھئی بیٹیوں کے گھر نہیں جایا کرتے۔“ اشی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بوٹوں کے

تسے کھولنے لگا۔

”چل بڑا آیا میرا بزرگ۔“ شمو نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

”وہ کہاں ہے۔“ اشی ننگے پاؤں ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر پھیلاتے ہوئے بولا۔



”کون۔“ شمو کی آنکھیں جپکنے لگیں۔

”تمہارا دم چھلا۔“ اشی نے قمیص پتلون سے نکالتے ہوئے کہا۔

”وہ نہیں آئے۔“ نجھی پلنگ پر اٹھ بیٹھی تھی۔

”کیوں؟“ اشی نے پوچھا۔ ”لڑائی ہوگئی؟“

”اللہ نہ کرے۔“ شمو اترائی۔

”حلیہ تو تم نے ایسے بنا رکھا ہے جیسے انہوں نے گھر سے مار مار کر نکال دیا ہو۔“

اشی نے چھیڑا۔

”شعیب صاحب دورے پر گئے ہیں..... میں ادھر آگئی۔“ شمو بولی۔ ”یہ حلیہ تو

میں نے گرمی سے تنگ آ کر بنایا ہے۔ یہاں گرمی پنڈی سے زیادہ ہے۔“

”پنڈی مری کے قریب جو ہے۔“ اشی نے کہا..... اور پھر کرسی پر پھیلتے ہوئے

نجھی سے کہا۔ ”ٹھنڈا پانی تو پلا دو.....“

”شر بت؟“

”نہیں صرف سادہ پانی۔“

نجھی کمرے سے باہر نکل گئی۔ شمو کمر موڑے آئینے میں اپنے ترشے بال سنوارنے

لگی۔ اشی سیٹیاں بجاتے ہوئے گویا گرمی کا زور توڑنے لگا۔ اچانک اس کی نظر شمو کے بالوں پر

گئی۔

”ارے یہ تمہارے بال کیا ہوئے؟“

”کنوادیئے.....“

”کیوں؟“

”شعیب کی پسند۔“

”بڑا نامعقول آدمی ہے۔“

شمو اس کی فی البدیہہ بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر پیار سے اس کے بال

جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ”کہیں یہ قصہ ان کے سامنے نہ کہہ بیٹھنا.....“

”بڑا ڈرنے لگی ہو۔“

”ڈرنا ہی پڑتا ہے۔“

دونوں ہنسنے لگے۔ نجھی نے ٹھنڈا پانی لا کر اشی کے سامنے رکھ دیا۔ ”چائے ابھی

پئیں گے یا نہا کر۔“

”کیا خیال ہے تمہارا.....“ اشی نے پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

پھر گلاس دوبارہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”بالکل پاگل ہو۔ میرا حال تو دیکھو۔ چائے پینے والا

ہے؟“

”تو گویا نہا کر پئیں گے۔“ نجھی واپس جاتے ہوئے بولی۔

”سمجھدار معلوم ہوتی ہو۔“ اشی نے گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ نجھی جگ گلاس

لے کر شمو کی طرف آئی۔ اس نے بھی پانی پیا۔ پھر وہ باہر نکل گئی اور شمو سٹول پر بیٹھ کر آئینے

میں اپنے بال سیٹ کرنے لگی۔

”شمو۔“ کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد اشی کی آواز آئی۔

”ہوں۔“ وہ بال بناتے بناتے بولی۔

”شمو۔“ پھر آواز آئی۔

”ہوں۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔

”شمو۔“ اشی نے پھر کہا۔ اب کے لہجے میں التجا تھی۔

”کیا ہے۔“ وہ قدرے رخ پھیر کر بولی۔

”شمو۔“ اشی نے قدرے لمبا کرتے ہوئے اس کا نام پکارا۔

شمو نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے آنکھوں کی

ساری خوشیوں سے اس کی طرف ملتجیانہ دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا۔“ شمو ناچتی مسکراتی شوخیوں سے اس کا عندیہ بھانپنے کی کوشش کرتے

ہوئے بولی۔

”میرا دل بڑا اداس ہو رہا ہے۔“ وہ بڑی مسکین صورت بنا کر بولا۔

”کس سے.....“ شمو جانتے ہوئے بھی بن کر بولی۔

”اسے دیکھے بڑے دن ہو گئے ہیں.....“ وہ مسکین سی صورت بنائے بولا۔

”کسے؟“ شمو ہنسی روکتے ہوئے انجان بنی رہی۔

”اب جانتی تو ہو.....“ اشی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ سٹول پر بیٹھی شمو کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے آئینے میں شمو کے عکس کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا..... ”اسے بلا بھیجیو اس کے ہاں چلو۔“

”پہلے یہ بتاؤ۔“ شمو مسکراتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئی۔..... ”پڑھائی کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ٹھاک ہے۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”سوال گندم جواب چنا..... کہہ کیا رہا ہوں اور پوچھ کیا رہی ہو۔“

”جو کچھ تم نے کہا ہے، اسی لیے تو پوچھا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس کے لیے اداس تو اتنے ہو رہے ہو۔ اسے حاصل کرنے کی شرط کا بھی کچھ پتہ ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم پڑھنے میں قطعاً سنجیدہ نہیں ہو..... امتحان کی ڈیٹ بھی آگئی ہے اور.....“

”بس..... بس.....“ اشی نے احتجاجاً دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ”تقریر شروع نہ کر دینا۔ روز سنتا ہوں۔ کان پک گئے ہیں..... یہ کہو ریشم سے..... ملنے جاؤ گی یا اسے بلاؤ گی.....“

شمو مسکرانے لگی۔

”دیکھو کتنا شریف سا آدمی ہوں۔ تمہارے واسطے سے وہاں جانا چاہتا ہوں.....“ وہ جیسے منت کر رہا تھا۔

شمو کو ہنسی آگئی..... آئینے کی طرف رخ موڑتے ہوئے بولی۔ ”آج شام ان کے ہاں جانا ہے۔ ابو سے گاڑی مانگ لینا..... ڈرائیونگ کے بہانے ہی جاسکتے ہو۔“

”میری اچھی بہن۔“ اشی نے اس کے گلے میں بازو ڈال کر زور سے اسے بھیجنے لیا۔

شمو اپنے آپ کو اس کے بازوؤں سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخنے لگی۔

گھر کی فضا میں تناؤ تھا۔ اس تناؤ کے کسی آن، کسی لمحے ٹوٹ جانے کا امکان تھا۔ تناؤ برقرار رہے تو شاید اتنا خطرناک نہیں ہوتا۔ ہاں ٹوٹ جائے تو ہر چیز کے ٹوٹ جانے، بکھر جانے کا امکان قوی ہوتا ہے۔

خالد کے متعلق اڑتی اڑتی خبریں تو کافی دنوں سے آرہی تھیں لیکن ان پر یقین ماں کو آتا تھا نہ بہنوں کو۔ پچھلے ہفتے ریشم کا چچا زاد شوکت ملتان گیا تھا۔ اس نے چچی سے نہیں، ہاں ریشم اور سائرہ سے بہت سی باتیں کہی تھیں۔ اس نے اس لڑکی کو بھی دیکھا جس کے چکر میں خالد ان دنوں پڑا تھا۔ خرید و فروخت کے سلسلہ میں بازار کی ایک بہت بڑی دکان پر وہ گیا تو خالد کے ساتھ وہ لڑکی بھی چیزیں خریدنے آئی تھی۔ خالد نے ہی چیزوں کی قیمت ادا کی تھی۔

پھر ایک سینما میں اس نے دونوں کو دیکھا تھا۔

اپنے طور پر تحقیق و تصدیق بھی کر آیا تھا۔ شوکی کا اندازہ یہی تھا کہ وہ لڑکی محبت سے زیادہ پیسے کی متلاشی تھی۔

سائرہ تو یہ باتیں سن کر گرم صم ہی ہو گئی تھی۔ ہاں ریشم تجسس لہجے میں لڑکی کی شکل و صورت کا پوچھنے لگی۔ ”خوبصورت ہوگی؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ شوکی نے کہا۔ ”میں تو حیران ہوں خالد کو ہو کیا گیا ہے، کچھ تو دیکھا ہوتا۔“

”محبت اندھی ہوتی ہے۔“ سائرہ نے طنز کیا۔

”شاید یہی بات ہو..... ورنہ اس لڑکی میں کوئی ایسی بات تو نظر نہیں آئی جو قابل کشش ہو..... خاندان ہے نہ شکل و صورت..... تعلیم بھی نہیں.....“

”تمہیں کیسے پتہ چلا۔“ ریشم نے پوچھا۔

”بس پتہ کر لیا۔“

”تو یہ سب چکر چلا کیسے؟“

”خالد جس دوست کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا ان لوگوں کے ساتھ کوئی دور پار کا رشتہ ہے..... درمیانی رابطہ وہ دوست ہی بنا۔ وہ خود بھی خالد کی وجہ سے پھڑے اڑا رہا ہے۔“

”دوسرا مہینہ ہے بھائی جان نے خرچہ نہیں بھیجا۔“ سائرہ رو ہانسی سی تھی۔

”اور خط تو اتنا مختصر لکھنے لگے ہیں کہ اسے تار کہا جائے تو ٹھیک ہے۔“ ریشم بولی۔

”پہنڈ کی شادی ہو جائے تو کوئی قباحت نہیں.....“ شوکی جہان دیدہ انداز میں

بولی۔

”لیکن جو کچھ ان دنوں خالد کر رہا ہے، اسے تو کبھی بھی مستحسن قرار نہیں دے

سکتا۔ لڑکی اسے پسند آ ہی گئی تھی تو اچھا تھا چچی کو بلا لیتا..... بزرگوں کے فیصلے تجربے اور پرکھ

کے فیصلے ہوتے ہیں۔“

”تو بھائی جان کونسا شادی رچا بیٹھے ہیں۔“ ریشم نے خالد کی طرف داری کی۔

”کسی دن یہ خبر بھی آپہنچی گی۔“ شوکی نے کہا۔

”تو گویا یہ معاملہ اس حد تک بڑھ چکا ہے۔“ سائرہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ شوکی کا لہجہ اٹل تھا۔

شوکی کی باتیں دونوں بہنیں گول کر گئیں۔ امی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو اڑتی اڑتی

خبریں سن کر ہی ہراساں تھیں۔ ماں کی پریشانوں میں مزید اضافہ ہی ہونا تھا نا۔

لیکن تقدیر کے وار کون روک سکتا ہے۔ محمود بیگم اس دن خاندان کے کسی بزرگ

کے سوئم میں گئی ہوئی تھیں..... وہاں تائی سلیمہ بھی ملتان سے آئی ہوئی تھیں..... خالد کے قصے

شاید ڈھکے چھپے نہ رہتے۔ انہوں نے واقعے کو کچھ داستان کا رنگ دیتے ہوئے ایسی ایسی

باتیں بتائیں کہ محمود بیگم کو وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ مرنے والے بزرگ کو تو کیا رونا تھا، اپنی

تقدیر کو ہی روتی رہیں لیکن خالد سے انہیں ایسی امید تھی نہ توقع..... لیکن حالات سامنے

تھے۔ حقیقت کے چہرے سے پردے سرک رہے تھے۔ پہلے خبریں نہ پہنچی ہوتیں تو شاید تائی

سلیمہ کو وہ کوئی جواب بھی دیتیں۔ ٹوک بھی سکتیں لیکن اب تو کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔

گھر آئیں تو ان کی متورم اور سرخ آنکھیں دیکھ کر ریشم پیار سے گلے میں بانہیں

ڈال کر ہنسی۔ ”امی جانی! اتنا بابا کوان کے گھر والے بھی نہ روئے ہوں گے جتنا آپ..... حد

کرتی ہیں آپ بھی۔“

”امی کا دل بہت ہی نرم ہے.....“ سائرہ بولی..... ”ویسے اس دن میت دیکھ کر

مجھے بھی بہت رونا آیا تھا۔“

”اس دن تو خیر رونا قابل معافی ہے۔“ ریشم ہنس کر بولی۔ ”لیکن آج تو سوئم

تھا۔ لوگ درود و فاتحہ پڑھتے ہوں گے اور ہماری ننھے سے دل والی امی برابر روئے جا رہی

ہوں گی..... میں ناامی.....“

”امی چائے بنا دوں۔ رورو کر سر تھک گیا ہوگا۔“ ریشم ہنسنے جا رہی تھی لیکن محمودہ

بیگم کے ہونٹ تو جیسے پتھر اگئے تھے۔ مسکراہٹ تک نہ آئی تھی۔ ریشم سے پیچھا چھڑا کر وہ اندر

چلی گئیں اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر گئیں۔

ریشم چائے بنانے باورچی خانے میں جا گھسی۔ امتحان سے فارغ ہو گئی تھی۔ اس

لیے گھر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ یوں بھی سائرہ ان دنوں جہیز کی

چھوٹی موٹی چیزیں تیار کر رہی تھی۔ اس لیے ریشم کھانے پکانے کا ذمہ لیے ہوئی تھی۔

سائرہ اندر گئی تو امی کو اتنا مصحمل پا کر بے چین ہو گئی۔

”کیا ہوا امی؟“

”کچھ نہیں۔“

”پریشان لگ رہی ہیں؟“

”قسمت ہی ایسی ہے۔“

”کیوں! کیا ہوا؟ کچھ بتائیں نا.....“

”کیا بتاؤں.....“

”پھر بھی.....“

”ملتان والی تائی سلیمہ آئی ہوئی ہیں.....“

”ہوں..... تو انہوں نے خالد بھائی کے متعلق کچھ کہا ہوگا.....“

”کچھ کیا..... بہت کچھ.....“

”امی آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں۔ لوگ بات کا بنگلڑ بنا لیتے ہیں.....“

”باتیں بے وزن نہیں ہیں بیٹی۔“

سارہ کچھ کہنے کو تھی کہ ریشم چائے کی پیالی لے کر آ گئی۔

”لیجئے امی۔“

”کیوں بنائی بے وقت چائے؟“

”آپ کی تکان دور ہو جائے گی۔“

محبت سے پیش کی ہوئی چائے محمودہ بیگم نے سرد مہری سے تھام لی۔ خرچ کے یہ چھوٹے چھوٹے اضافے تو اب انہیں بے طرح کھٹکتے تھے۔

سارہ نے تائی سلیمہ کی باتوں کو کرید کرید کر پوچھا تو قصہ وہی تھا جسے شوکی سنا چکا تھا..... کچھ اضافے بھی تھے۔ تائی سلیمہ نے تو اس لڑکی کو بازاری لڑکی ثابت کرنے کی ڈھکی چھپی کوشش بھی کی تھی۔ کچھ بھی تھا، ان لوگوں کے متعلق لوگوں کی رائے کسی طور اچھی نہ تھی۔ یہ باتیں شوکی بھی در پردہ کہہ ہی گیا تھا۔

سارہ امی کے پاس ہی پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ریشم قریبی سٹول پر ان کے سامنے آ بیٹھی..... سلیمہ نے جو کچھ کہا تھا، محمودہ بیٹیوں کو بتانے لگیں۔

سارہ کا دل بھی برا ہونے لگا۔ امی تو دوپٹے کے آئینے سے کئی دفعہ آنکھوں کے گوشے پونچھ چکی تھیں..... بد دل ریشم بھی تھی لیکن وہ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ و تیار تھی.....

”یوں کریں امی خالد بھائی کو بلا بھیجیں.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”کئی دفعہ لکھ چکی ہوں۔ جانتا بھی ہے کہ بہن کی شادی تیار ہے۔ پھر بھی کوئی اثر

نہیں ہوتا.....“

”آپ خود چلی جائیں۔“

”کہاں؟“

”ملتان۔ بھائی جان کے پاس۔“

”کیا کروں گی وہاں جا کر۔“

”انہیں سمجھائیے گا۔ نہ سمجھیں تو..... پھر خوشی خوشی ان کی شادی.....“

”شادی جیسے گڈی گڈے کا کھیل ہے نا..... ابھی ایک سے تو فارغ ہو لوں۔“

مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں گی۔ اسے اپنی بڑگئی۔ میں سوچ رہی تھی۔ اسے لکھوں گی پانچ

ہزار کا کہیں سے بندوبست کر لے..... لیکن اب.....“

محمودہ بیگم ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے نصیبوں کا گلہ کرنے لگیں۔ بیوگی اور بیٹے کا

سہارا..... ایسے موضوع تھے جن پر رونے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ ماں کے ساتھ سارہ بھی

چپکے چپکے آنسو بہانے لگی۔

پریشانی ریشم کو بھی تھی لیکن مسائل کا حل یوں ڈھونڈا نہیں جاسکتا تھا۔ رونا ڈھونا

اسے کسی طور پسند نہ تھا..... وہ جھلائی ہوئی اٹھ کر باہر آ گئی۔ گرمی کی جھلسی ہوئی سہ پہر دم توڑ

رہی تھی۔ فضا میں دھول تھی، ہوا بالکل بند تھی۔ تانبے کی رنگت کا مشرقی افق بالکل صاف تھا۔

بادلوں کے ابھرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

ریشم نے ربڑ کی ٹالی پکڑی اور اس کا سرا نلکے سے لگا کر چمن میں اتر

گئی..... پودوں کو پانی دیتے ہوئے وہ حالات کی نئی اور سنگین کروٹ کے متعلق سوچنے

لگی۔

رات اس کی سارہ سے اچھی خاصی لڑائی ہو گئی..... امی کی طرح وہ بھی کچھ

کھائے پئے بغیر سو جانے کو تیار تھی کہ ریشم اس سے الجھ گئی۔

”ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟“ اس نے جھلا کر کہا۔

”تم اتنی بچی بھی نہیں ہو..... کہ سمجھ نہ سکو۔“ سارہ نے بستر برابر کرتے ہوئے

جواب دیا۔

”باجی.....“ وہ اس کی چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”ہوں۔“ سارہ چادر ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہی۔

”آپ حقیقت کو تسلیم کر لینے کی عادت کیوں نہیں ڈالتیں؟“

”کیا مطلب؟“

”آپ کا خیال بھی یہی ہے کہ خالد بھائی کو شادی نہیں کرنی چاہیے؟“

”میں نے کب کہا؟“

”امی اور آپ یہی چاہتی ہیں۔ یہ تو محض آڑ ہی ہے کہ وہ ایسی لڑکی سے شادی کر رہے ہیں جسے امی جانتی ہیں نہ ہم..... حقیقت یہ ہے کہ ان کی شادی سے امی کو مالی خسارہ ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ شادی کر کے ہمارا بوجھ نہیں اٹھائیں گے۔ پانچ ہزار کا بندوبست نہیں کریں گے۔“

”تو یہ کوئی بات ہی نہیں۔ امی پچاری کہاں سے اخراجات پورے کریں؟“

”خالد بھائی جان اب ان کے اخراجات کے پابند بھی تو نہیں..... آپ ذرا یہ بھی تو سوچئے..... ان کی عمر ستائیس سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان کی کچھ انگلیں، کچھ امیدیں، کچھ تصورات ہیں..... گھر بنانے کا انہیں بھی حق ہے اور پھر جب گھر آباد کر لیں تو چھ سو روپے میں اپنا گزارا چلائیں..... یا ہمارا بوجھ اٹھائیں.....“

سارہ چپ ہو گئی۔

”خالد بھائی جان شادی امی کی پسند سے کریں یا اپنی..... یہ الگ بات ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ شادی کے بعد وہ ہمارا بوجھ نہیں اٹھا سکتے..... نہ ہی اٹھانا چاہیے۔“

”کوئی خزانہ رکھا ہے نا امی نے.....“ سارہ جل کر بولی تو ریشم چمک کر بولی۔ ”تو کیا خالد بھائی ساری عمر شادی ہی نہ کریں.....؟“

”ساری عمر کا کیا سوال۔ چند سال اور انتظار کر لیتے..... تمہاری شادی کر لیتے..... تو.....“ ریشم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”تو بہ تو بہ۔ ایسی بھی کیا خود غرضی..... کتنا ظلم ہے باجی۔ میری شادی دس سال بھی نہ ہو تو خالد بھائی بھی سزا بھگتتے رہیں۔ ہائے ہائے۔ کیا سوچیں ہیں جناب کی.....“

اور پھر اس نے خالد کی حمایت میں ایک لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا..... وہ مصر تھی کہ امی ملتان جا کر لڑکی اور اس کا گھر بار دیکھیں اور اگر خالد واقعی سنجیدہ ہے تو بخوشی اس کی شادی وہاں کر دیں..... باقی رہ گیا ماں بیٹی کا بوجھ..... تو اس نے نوکری کے متعلق سوچ لیا تھا۔ اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو کر وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو پوری طرح تیار تھی۔ سارہ گم صم ریشم کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ریشم اٹھارہ انیس برس کی لڑکی نہیں جہانم دیدہ عورت کی طرح حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے رہی تھی۔

واقعی

خالد شادی اپنی پسند سے کرتا یا گھر والوں کی..... مالی پریشانیاں پیدا ہونا ہی تھیں اور ان کا حل رونے دھونے سے نہیں دلجمعی سے غور کرنے سے سوچا جاسکتا تھا۔

-----○-----

زریں کی گاڑی کا ہارن تھا..... ریشم جتن اٹھا کر آمدے سے باہر آ گئی۔ گاڑی زریں ہی کی تھی۔ ریشم تجسس سے ادھر دیکھنے لگی۔ شاید زریں آئی تھی لیکن ڈرائیور گاڑی گیٹ سے باہر ہی کھڑی کر کے اندر آ گیا۔

”کیا بات ہے رحیم خان؟“ ریشم نے برآمدے کی سیڑھی پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

”چھوٹی بی بی نے یہ رقعہ دیا ہے جی۔“ سلام کے بعد ڈرائیور نے جیب سے نیلا لفافہ نکال کر مودبانہ پیش کیا۔

”سب ٹھیک ٹھاک۔“ ریشم نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

”جی صاحب۔“ ڈرائیور نے قدرے جھکتے ہوئے جواب دیا۔

ریشم لفافہ چاک کر کے چھوٹا سا نیلا پرزہ نکالتے ہوئے رحیم سے زریں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ”زریں کہیں باہر واپس نہیں گئی؟“

”جی نہیں..... سوات کا پروگرام بن تو رہا ہے۔ شاید چند دنوں تک چلی جائیں۔“

”ہوں۔“

ریشم خط پڑھنے لگی۔ چند طور تھیں۔

شہزاد کے آموں کے باغ میں پکنک منانے کا پروگرام تھا۔ صبح جا کر شام کو لوٹ آنا تھا۔ زریں نے اپنی چند قریبی دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان میں ریشم اور نجی بھی شامل تھیں۔

ریشم خط پڑھ کر مسکرانے لگی۔

”چھوٹی بی بی نے بہت بہت تاکید بھی کی ہے۔“ ڈرائیور بولا۔ ”کہتی تھیں انکار کی گنجائش نہیں.....“

”وہ تو اس نے لکھا بھی ہے.....“ ریشم کچھ سوچتے ہوئے بولی..... اور پھر ایک دم پلٹتے ہوئے بولی۔ ”تم ٹھہرو..... میں امی سے پوچھ کر جواب دیتی ہوں۔“

جتن اٹھا کر وہ تیزی سے اندر آئی۔ برآمدہ دو چھلانگوں میں پار کیا۔ ڈرائنگ روم میں گھسی۔ پچھلا دروازہ کھول کر امی کے کمرے میں کود جانے کے انداز میں داخل ہوئی۔

”امی جانی۔“ اس نے مخصوص خوشامدانہ انداز میں ماں کو پکارا۔

”کیا ہے.....“ امی الماری سے کپڑے نکال رہی تھیں۔ نعیمہ کی ساس ہسپتال میں داخل تھیں۔ اس کی احوال پرسی کو جانا تھا۔ سائرہ بھی تیار ہو رہی تھی۔

”امی جانی۔“ ریشم ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔

”تیرا بچپنا کب جائے گا؟“ امی نے بیزار سے کہا۔ اور پھر گلے میں سختی سے پڑے ریشم کے ریشمی بازو نکالتے ہوئے بولیں۔ ”جو کچھ کہنا ہوتا ہے زبان سے کہا کر۔ یہ عادت چھوڑ دے۔“

”کیوں چھوڑ دوں۔ اپنی ہی تو امی جانی ہیں۔“ ریشم نے ماں کے گال سے گال لگا دیا۔

”کیا بات ہے ریشو؟“ سائرہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ”یہ خوشامدیں کیوں ہو رہی ہیں؟“

”بڑے مزے کی بات ہے باجی۔“ ریشم ماں کے گلے سے بانہیں نکال کر سائرہ کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور پھر رقعہ اسے تھما دیا۔

”آپ بھی چلیے باجی.....“ اس نے رقعہ پڑھتی سائرہ سے کہا۔ ”اللہ کتنا مزہ آئے گا۔ میں تو گھر بیٹھ بیٹھ کر بور ہو گئی تھی ایمان سے.....“

”کہاں جانا ہے؟“ امی نے کپڑے نکال کر کہا۔

ریشم نے آنکھوں سے ملتجیانہ سائرہ کو اشارہ کیا۔ ایسے موقعوں پر امی سے وہی اجازت لے کر دیا کرتی تھی۔ سائرہ ہنس پڑی اور رقعہ ماں کی طرف بڑھا دیا۔



امی انکار کرتیں بھی تو کونسا ریشم نے چھوڑ دینا تھا۔ جانے اس وقت موڈ ہی کچھ اچھا تھا یا ریشم سے پیچھا چھڑانا مقصود تھا..... بولیں۔ ”کب جانا ہے؟“

”اتوار کو لکھا تو ہے۔“ ریشم بے صبری سے بولی۔

امی کپڑے ساڑہ کو دیتے ہوئے بولیں۔ ”ذرا استری پھیر دو۔“

”امی جانی۔“ ریشم نے جلدی سے کہا۔ ”بچی بھی جارہی ہے۔ شاید سلمیٰ بھی.....“

”میں جاؤں گی نا پکنک پہ.....“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”چلی جانا.....“ امی نے مختصر سا جواب دیا۔

”امی پیاری.....“ ریشم نے جیسے نعرہ لگایا..... اور پھر لپک کر اپنے کمرے کی طرف

گئی۔

”میں ضرور آؤں گی۔“ اس نے چند تکلفاتی باتوں کے بعد زریں کو لکھا اور پھر

رقعہ لے کر بھاگی بھاگی باہر آئی۔

”یہ لو۔“ اس نے رقعہ ڈرائیو کو دے دیا۔

”سلام بی بی۔“ ڈرائیور رقعہ لے کر مڑا۔

”ہاں رحیم..... سنو.....“ اس نے جلدی سے کہا۔

”جی فرمائیے.....“

”زریں سے کہنا۔ اتوار کو مجھے گھر ہی سے لے لے۔ میں اکیلی کیسے اس کے گھر

جاؤں گی۔“

”بہت بہتر جی۔“

”میں صبح صبح تیار ہو جاؤں گی۔ ہاں تو کتنے بچے روانہ ہونا ہے؟“

”پانچ بچے نکل جائیں گے بی بی..... رات کو واپس بھی تو لوٹنا ہے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ میں تیار رہوں گی۔“

ڈرائیور سلام کر کے رخصت ہو گیا اور ریشم لہراتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس کی خوشیوں

کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ گھر میں تو اس کا جی لگتا ہی نہیں تھا۔ فضا ہی ایسی مکدر تھی۔ امی ہر وقت

ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتیں۔ ساڑہ اداس اداس رہتی۔ ہنسنے مسکرانے پر تو جیسے پابندی ہی لگ

گئی تھی۔ اسی بات سے ریشم کو چڑھ لگتی تھی۔ ماں کو سمجھا سمجھا کر عاجز آ گئی تھی۔ بہن سے کئی دفعہ الجھ چکی تھی..... لیکن پھر بھی فضا معمول پر نہ آئی تھی۔

پکنک کا دعوت نامہ تو جیسے رحمت کا نزول تھا۔ یوں بھی امتحان دینے کے بعد گھر

بیٹھنا خاصا بور کا م تھا۔ اس پر گھریلو حالات کی تلخیاں۔ ریشم پکنک پر جا کر فراغت کے چند

گھنٹے گزارنے کو غنیمت سمجھ رہی تھی۔

اس دن موسم بڑا ہی خوبصورت تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ فضا دھل کر نکھر

آئی تھی۔ ہوائیں نرم آلودھیں۔ آسمان کا نیلا رنگ چمک اٹھا تھا..... اس کے لامحدود کناروں

پر کالے کالے بادل ڈوب رہے تھے، ابھر رہے تھے۔ خنکی گرمی کے جھلسائے ہوئے ماحول کو

اپنی پلیٹ میں لے کر شفقتوں کا احساس دلانے لگی۔

ریشم صبح ہی صبح تیار ہو گئی۔ ہلکے گلابی رنگ کی وائل کی پرنڈ قمیص کے ساتھ اس نے

گلابی شلوار اور دوپٹہ پہنا۔ بالوں کو ڈھیلی سی چوٹی کی صورت میں گوند کر پشت پر چھوڑ دیا۔

اس کے صبح بلج چہرے پر کسی آرائشی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میک اپ کے بغیر اس کا حسن

جہاں سوز تھا۔ گرمی کے پیش نظر اس نے نہانے کے بعد ٹیلکم پاؤڈر اپنے بدن پر خوب

چھڑکا۔ پاؤڈر کی ہلکی ہلکی خوشبو اسے بہت پسند تھی۔

سواپانچ بجے رحیم اسے لینے آ گیا۔ زریں نے رحیم کے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی بھیجا

تھا۔ ریشم نے امی کو گال پر پیار کر کے سلام کیا اور ساڑہ کو ٹاٹا کر کے گاڑی میں آ بیٹھی۔

پانچ چھ کاروں کا قافلہ تیار کھڑا تھا۔ ایک گاڑی میں نوکر چاکر تھے۔ پانچ میں پکنک

منانے والے احباب۔ عورتیں، مرد اور بچے بھی گاڑیوں میں گڈمڈ بیٹھے تھے۔ شاید ریشم کا ہی

انتظار تھا۔ اگلی گاڑی میں زریں اپنی بھابیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ریشم کو دیکھتے ہی باہر نکل آئی۔

”ہیلو۔“ دونوں بڑے تپاک سے ملیں۔

”شکر ہے تم آ گئیں۔“ زریں نے اسے لپٹائے لپٹائے کہا۔

”سلمیٰ آئی؟“ ریشم نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“



”پتہ نہیں۔“

”تم نے پیغام بھیجا تھا؟“

”ہاں۔“

”پھر؟“

”اس نے کہلا بھیجا کہ فارغ نہیں۔“

”بہت خراب ہے۔“

”واقعی.....“

دونوں ہنس پڑیں۔ پھر زریں اسے ساتھ لیے اپنی گاڑی کی طرف آ گئی۔  
”ہیلو.....“ پچھلی گاڑی میں بیٹھا شہزاد ریشم کو دیکھتے ہی بڑے شوق سے سر کھڑکی سے نکالتے ہوئے بولا۔

ریشم نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ کو ٹھکی..... لیکن دوسرے لمحے مسکراتے ہوئے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کیا۔

”جیتی رہیے..... جیتی رہیے۔“ شہزاد گاڑی سے باہر آتے ہوئے گرم جوشی سے مسکرایا۔

”مزان بخیر۔“ وہ ریشم کے ریشمی سراپا کو چشم شوق سے دیکھتے ہوئے بولا۔  
”شکریہ۔“ ریشم اس کی نگاہوں کی چمک سے کچھ خائف ہو کر زریں کے ساتھ

لگ گئی۔

”بڑے دنوں بعد آپ نظر آئیں۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔  
”اتنی دفعہ بلایا۔ آتی ہی نہیں تھی۔“ ریشم کی بجائے زریں نے جواب دیا۔

”امتحانوں کے بعد تو غائب ہی ہو گئی۔ جانے آج کیسے آ گئی۔“  
”تمہارے جذبہ دل کی کشش نے کھینچا ہوگا۔“ شہزاد نے کچھ اس طرح ریشم کو

دیکھا کہ وہ کپکپا گئی۔

”چلو نا بھی..... اب کیا دیر ہے۔“ اگلی گاڑی سے شمرہ بھابھی نے آواز دی۔  
”آگئے بھابھی.....“ زریں ریشم کو لیے اس طرف آ گئی۔ اگلی سیٹ پر دونوں

بیٹھ گئیں اور کاروں کا یہ قافلہ ریٹکنے لگا۔

اس دن صبح ہی موسم نے خوشگوار کروٹ لی تھی۔ صبح تو مطلع صاف تھا لیکن آہستہ آہستہ منہ زور ہوائیں چلنے لگی تھیں اور نیلے آسمان پر بھاری بھر کم بدلیاں ابھر آئی تھیں۔

باغات ایکڑوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ہریالی ہی ہریالی۔ اس پر موسم کی فراخدلی۔ سماں خوب پر لطف تھا۔ ریشم زریں کے سنگ آموں سے لدے پیڑوں تلے لہراتی پھری۔ کبھی چھوٹی سی نہر کے کنارے دونوں گھومتی پھریں۔ کبھی ایک دوسری پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اڑائے اور کبھی ایک دوسری کو پانی میں دھکے دیے۔ چھوٹی بھابھی اور بچے بھی ان کے کھیل میں شریک ہو گئے۔

دوپہر کا کھانا سب نے مل کر کھایا۔ گھاس پر ایک لمبا دسترخوان ڈال دیا گیا..... نوکروں نے کھانا چنا..... اتنا مرغن اور لذیذ کھانا..... یوں لگ رہا تھا جیسے بہت بڑی دعوت کا اہتمام ہے۔ یہ دعوت شہزاد کی طرف سے تھی۔

کھانے کے بعد سب ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ کوئی درختوں تلے لیٹ گیا۔ کوئی ریکارڈ پلیئر پر خوبصورت نغمے سننے لگا۔ کسی نے ٹیپ لگا دی۔ کوئی تاش کی بازیاں لگانے لگا۔ چھوٹی بچیاں جھولے میں جا بیٹھیں..... وہ ریشم کو بھی زبردستی کھینچ لے گئیں۔ زریں ساتھ لے جانے والے آموں کو نوکروں میں مالی سے ترتیب سے رکھوانے لگی۔

صبح سے اب تک شہزاد ریشم کے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا۔ ریشم کترات رہی لیکن کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ ایک تو وہ آئی اسی کے باغوں میں پکنک منانے تھی۔ دوسرے زریں کے منگیتر کی حیثیت سے کچھ کہنا مناسب بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زریں کے گرد منڈلا رہا ہو لیکن اس ہو سکنے پر اس کا ذہن یقین نہیں کر رہا تھا۔ بعض اوقات ہم اتنے حساس ہو جاتے ہیں کہ غیر محسوس کو بھی بری طرح محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ریشم کے اندر ہی اندر کئی جذبے کھٹک رہے تھے۔ خطرے کے الارم کی طرح بج رہے تھے۔

وہ ناصرہ کو جھولا دے رہی تھی کہ شہزاد اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔

”پسند آئے یہ باغات۔“ وہ آموں سے لدے پیڑوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی بہت۔“ وہ ناصرہ کا جھولا جھلاتے ہوئے بولی۔

”آپ کے لیے میں نے پیش قسم کے آموں کا ٹوکرا تیار کر دیا ہے۔“ وہ شوق

سے بولا۔

”جی..... ٹوکرا.....“

”ہاں۔“

”وہ میں کیا کروں گی۔“

”ساتھ لے جائیے گا۔“

”ہائے..... نہیں.....“

”بہت نایاب قسم کا آم ہے۔ یہ قسم آپ کو مارکیٹ میں کہیں نہیں ملے گی۔“ وہ سراپا شوق کہے گیا۔ اس کے باغوں میں کئی سال کے تجربوں کے بعد آم کی یہ قسم تیار کی گئی تھی۔ وہ ریشم کو اس کے متعلق بتانے لگا۔

”ایسی نایاب چیز اور آپ نے ٹوکرا بھر دیا.....“ ریشم سادگی سے بولی۔ ”میں

تھوڑے سے لے لوں گی..... سارے نہیں۔“

”یہ تحفہ ہے ریشم.....“ اس نے بے تکلفی سے ریشم کا نام لیا۔ ریشم نے خفیف سی گھبراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا..... اور پھر زور زور سے جھولا جھلانے لگی۔

چائے کے بعد ریشم اور زریں گھنے پیڑوں تلے ہوتی ہوئی کچھ دور نکل گئیں تو ریشم نے ہنستے ہوئے زریں سے کہا۔ ”یہ تمہارا کچھ لگتا میرے ساتھ چپکنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔“

”کون.....“ زریں نے پوچھا۔

”جناب کا منگیتر..... شہزاد صاحب..... خدا قسم مجھے اس کی یہ عادت اچھی نہیں لگتی..... تمہیں بتا دوں۔ آنکھ کا غیر ہے۔ ذرا سنبھال کر رکھنا اسے.....“

زریں ہنسنے لگی۔

”جہاں جاتی ہوں ادھر ہی پہنچ جاتا ہے۔ مجھے پتہ ہوتا یہ صاحب بھی تشریف فرما ہوں گے کبھی آتی ہی نہیں.....“ ریشم مسکراتے ہوئے زریں کے گال پر تھپکی دیتے ہوئے

بولی۔

”پتہ تو تھا۔“ زریں مسکرائی..... ”میں نے لکھا نہیں تھا کہ شہزاد کے آموں کے

باغ میں جارہے ہیں..... یہ سارا اہتمام اسی نے تو کیا ہے۔“

”ہوں.....“ ریشم نے سر ہلایا۔

”اور یہ بھی بتا دوں.....“ زریں شوخی سے مسکرائی۔

”کیا۔“ متحس لہجے میں ریشم نے پوچھا۔

”شاید تمہارے ہی لیے.....“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”کو نہیں۔“ ریشم نے ڈانٹا..... ”منگیتر تمہارا..... اور.....“

”منگیتر ونگیتر کچھ نہیں اب.....“ زریں بولی۔

”کیوں؟“ ریشم حیرت سے بولی۔

”بڑا لمبا واقعہ ہے۔“

”کیا ہوا.....؟“

”بتاتی ہوں.....“

زریں اور ریشم وہیں درخت تلے بیٹھ گئیں۔ بادل گھر گھر آئے تھے۔ ہوا میں آموں کی خوشبوئیں چرائے ہوئے تھیں۔ بھیگی بھیگی فضا بارش کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔

زریں نے ریشم کو اپنے سارے خاندانی حالات بتا دیے۔ نام نہاد منگنی کی بات ٹوٹنے پر دونوں گھرانوں کے تعلقات کچھ کشیدہ ہوئے تھے لیکن شہزاد نے دونوں خاندانوں کو اپنی کمزوری کی بھینٹ چڑھنے نہیں دیا تھا۔ کسی امریکن لڑکی کے چکر میں پھنسنے سے یہ ارادہ ٹوٹا..... قصور اس کا اپنا تھا۔ اس نے فراخ دلی سے قبول کرتے ہوئے رشتے سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا۔ امریکن لڑکی سے ابھی گلو خلاصی نہ ہوئی تھی لیکن ہو جانے کی امید تھی۔

ریشم ششدر سی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ لاشعوری طور پر موازنہ اپنے گھریلو حالات سے بھی کر رہی تھی۔ ایک یہ لوگ تھے کہ اتنے بڑے واقعے کیا سانحہ کے بعد بھی پلنکیں منارہے تھے۔ پروا تھی نہ فکر اور ایک اپنا گھر تھا کہ خالد بھائی کی پسند کی شادی پر ہی ہنگامہ بپا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جسے اس شادی سے دنیا کا سب سے بڑا ظلم اہل خانہ پر ہو جائے گا۔

زریں باتیں کرتی رہی۔ وہ شہزادے مگنی کی بات ختم ہو جانے پر بہت ہی خوش تھی۔  
 ”جان چھوٹی لاکھوں پائے۔“ ریشم نے ہنس کر کہا۔  
 ”اب وہ میرا بھائی ہے..... اور بھائی کے لیے اچھی سی لڑکی تلاش کرنا میرا فرض ہے.....“ زریں نے شوخ شوخ نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”اپنی گلو خلاصی کرا کے کس کا بیڑہ غرق کرنے کا ارادہ ہے.....“ ریشم نے بھی آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

زریں مسکرا کر چپ ہو گئی۔ ویسے بھی شہزاد انہیں تلاش کرتا ادھر آ رہا تھا۔ موضوع بدلنا ہی پڑا..... وہ ان کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ ریشم نے اسے پہلی بار بڑے غور سے دیکھا..... کریم کلر سلکی شلوار قمیص میں وہ اچھا خاصا وجیہ لگ رہا تھا۔ اس کے نقش و نگار خوبصورت تھے اور ڈیل ڈول میں مردانہ وقار تھا..... اس کے سگریٹ پینے کا سٹائل بھی پرکشش تھا۔

”شکل و صورت شریفوں کی سی ہے..... ہے کتنا بد معاش.....“ ریشم نے دل ہی دل میں سوچا..... اور نفرت کی ہلکی سی لہر اس کے من کو چھو گئی۔

-----○-----

ہوائیں بادلوں کو دھکیل جانے کس طرف لے گئی تھیں۔ آسمان پر کوئی بدلی تھی نہ بادل..... تپش نے نکھرے نیلے رنگ کے آسمان کی ساری خوبصورتی نگل لی تھی۔ دھوپ بھی جلاؤ لانے کی خاصیتیں لیے سارا دن چمکتی رہی۔ کل اور پرسوں ہونے والی بارشوں سے گیلے درو بام دھوپ سے سلگ اٹھے تھے اور بھڑاس جلے دل کی بھڑاس کی طرح چھوڑ کر فضا کو ناقابل برداشت بنا رہے تھے۔ ہوا بند تھی، کچھ اس طرح کہ ایک پتہ بھی مل نہ رہا تھا۔  
 سائرہ نے کمرے کے فرش سے قالین اٹھا کر خوب پانی بچھایا تھا۔ چھت کا پرانا پنکھا گھر گھر کرتے یوں ہوا بکھیر رہا تھا جیسے کوئی بوڑھا اپنی قوت و طاقت سے زیادہ کام کر کے احسان جتا رہا ہو۔ کھڑکیوں کے آگے پردے پڑے تھے۔ سائرہ نے روشنی کو دھندلانے کے پورے انتظامات کر دیئے تھے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر دونوں بہنیں زمین پر چادر بچھا کر لیٹ گئی تھیں۔ ٹھنڈا فرش خوب سکون پہنچا رہا تھا۔  
 ریشم کل کی پنک کے پر لطف قصبے سائرہ کو سن رہی تھی۔

”بابی آپ بھی چلتیں تو بڑا مزہ آتا۔ انہیں آپ کے جانے سے کونسا فرق پڑ جاتا۔“ ریشم نے اوندھے لیٹے لیٹے کہا۔

”تم نے ساری باتیں اتنی تفصیل سے بتائی ہیں کہ یوں لگتا ہے..... میں بھی تمہارے ساتھ ہی تھی..... رہی سہی کسر ان آموں نے پوری کر دی ہے۔ واقعی بہت عمدہ آم ہیں.....“ سائرہ نے دیوار کے ساتھ پڑے ٹوکے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو شہزاد نے زبردستی دے دیئے۔“ ریشم نے سر تکتے پر رکھ دیا۔ چند لمحے وہ چپ رہی پھر سر اٹھایا اور سائرہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”شہزاد جو ہے ناباجی.....“

”ہوں۔“

”زریں کا منگیتر تھا۔“

”منگیتر تھا؟“

”ہاں۔ اب منگنی ٹوٹ گئی ہے۔“ ریشم نے سارا قصہ سائرہ کو سنایا اور پھر بولی۔  
”بے حد امیر ہے لیکن کردار..... اچھا نہیں۔ شراب تو پانی کی طرح پیتا ہے۔ لڑکیوں کے  
چکر بھی خوب چلائے ہوئے ہیں..... کم بخت شکل سے اتنا شریف لگتا ہے کہ کیا  
بتاؤں..... شاید یہ ساری باتیں اس کے طبقے کی خاصیتیں ہیں۔“  
”عیاشی یہ لوگ اپنا حق سمجھ کر کرتے ہیں۔“

”ان عیاشیوں کے باوجود عزت دار کہلاتے ہیں۔ معاشرے میں ان کا جو مقام  
ہے، وہ ہمارے طبقے کے شریفوں کا تو نہیں..... ہر کوئی ان کی عزت کرتا ہے۔ انہیں.....“  
ریشم اسی موضوع پر دل کے پھپھو لے پھوڑنے کے موڈ میں تھی کہ سائرہ نے ہنستے  
ہوئے اس کی طرف سے کمر موڑ لی۔ ”اب لیکچر رہنے ہی دینا۔ مجھے تو آموں کا نشہ ہے۔ نیند  
آ رہی ہے.....“

ریشم بھی بازو کے حلقے میں سر رکھ کر پڑی رہی..... نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ پھر ان  
اونچے لوگوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔

شہزاد سے تلازم خیال اسے اشی کی طرف لے گیا اور وہ واقعہ یاد آ گیا جب شہزاد  
کی وجہ سے اشی اس سے روٹھ گیا تھا۔

”اگر کل اشی وہاں ہوتا تو جانے روٹھنے کے لیے کتنے حیلے اور بن جاتے۔“ ریشم  
نے بند آنکھوں میں کھلی سوچ مقید کی..... اور پھر اس کے ضمیر نے کئی بار اسے ملامت کی۔  
اشی کو شہزاد پسند نہیں تھا اور وہ کل پورا دن شہزاد کی معیت میں گزار کر آئی تھی..... گھبرا کے اس  
نے کروٹ بدلی..... اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے کل کے واقعات کو پھر سے  
چشم تصور سے دیکھنے لگی۔ شہزاد کے ساتھ کل پورا دن بے شک اس نے گزارا تھا لیکن یہ  
معت محض زریں کی وساطت سے تھی۔ اس کا اس سے کوئی تعلق تھا نہ واسطہ.....

ان ساری باتوں کے باوجود اس کا من مطمئن نہ ہوا تھا۔ اشی کی طرف سے ایک

مجرمانہ سے احساس سے ذہن میں کھلبلی مچی تھی..... اس نے کئی بار کروٹیں بدلیں۔ سو جانے  
کی کوشش کی لیکن نیند آئی نہ چین..... وہ اٹھ بیٹھی۔

”کیوں؟“ سائرہ نے پوچھا۔

”یونہی۔ نیند نہیں آ رہی۔“ ریشم نے جواب دیا۔ ”گرمی بہت ہے۔“

”نہا لیتیں۔“

”یہ ٹھیک کہا آپ نے۔“ ریشم اٹھ کر نہانے کو چل دی۔

جرم کا خفیف سا احساس ذہن پر جانے کیوں چھایا ہوا تھا۔

اسی شام شو، بجھی، شکو، آ صی اشی کے ساتھ آ گئیں..... ریشم نے دل ہی دل میں

خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ لوگ کل نہ آ پہنچے۔

سب اتنے تپاک سے ملے کہ لطف آ گیا۔ ریشم کو تو سب بہنیں دل ہی میں چھپا

لینا چاہتی تھیں..... اور اشی کا شوق دید اس کی خوبصورت آنکھوں کی چمک میں مچل رہا تھا۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ ملگجے سے اندھیرے تھے۔ دن بھر کی گرمی سے جھلے ہوئے

درود یوار جیسے سکھ کا سانس لے رہے تھے۔ ہوا ٹھنک ٹھنک کر چلنے لگی تھی اور مغربی افق سے

کالی کالی بدلیاں تیزی سے اٹھنے لگی تھیں۔

باہر لان ہی میں کرسیاں نکال لی گئی تھیں۔ سب کو بٹھا کر ریشم تیزی سے اندر آئی۔

”سائرہ باجی۔“

”ہوں۔“

”ایک بات۔“

”کیا؟“

”کل کی پلنک کا ان سے ذکر نہ کیجئے گا۔“

”کیوں؟“

”بس۔“

”پھر بھی؟“

ریشم پہلے ہچکچائی۔ پھر شر مارتے ہوئے بولی۔ ”اشی کو وہ لوگ پسند نہیں۔ برانہ مان جائے۔“

سارہ ستانے کو بولی۔ ”اتنا ہی خیال تھا تو جاتی ہی نہیں۔“  
 ”اللہ باجی..... آپ اپنی نہ چلائیں..... امی سے بھی کہہ دیجئے گا۔“

”اچھا۔“

ریشم تشکرانہ نظروں سے بہن کو دیکھتی..... کچھ جھپنی سی باہر نکل آئی۔  
 سارہ نے بہن کے الفاظ کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا۔ لپک کرامی کے پاس گئی۔  
 وہ الماری سے دھلا ہوا سفید دوپٹہ نکال کر اوڑھ رہی تھیں۔  
 ”شربت ہے کہ ختم ہوگئی بوتل؟“ انہوں نے سارہ سے پوچھا۔  
 ”ہے..... آم بھی بہت سے پڑے ہیں۔“  
 ”برف منگوا لو۔“

”منگوا لوں گی.....“ سارہ نے کہا اور پھر امی سے وہی بات کہی جو ریشم نے کہی تھی۔ امی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئیں۔  
 سارہ نے شربت پلایا۔ سب کو پیش کیا۔ برف منگوا کر آموں میں ڈال دی اور  
 بھری بالٹی باہر ہی اٹھالائی۔

بڑی اعلیٰ قسم کے آم تھے۔ برف میں پڑے رہنے سے خوب ٹھنڈے بھی ہو گئے۔ سب نے پسند کئے اور اشی نے تو اس رغبت سے کھائے کہ امی نے پلاسٹک کا لفافہ منگوا کر آٹھ دس آم ساتھ لے جانے کے لیے بھی رکھ دیئے۔

اور جس وقت اشی آم کھاتے ہوئے ان کے ذائقے کی تعریف کر رہا تھا۔ ریشم کو ہنسی آرہی تھی۔ سوچ رہی تھی، اسے ابھی پتہ چل جائے کہ آم کس کا تحفہ ہے تو ریلی منھاس اس زہر کی طرح گٹنے لگے جسے نگل جانا اس کے بس میں نہ رہے۔

رات گئے تک وہ لوگ ان کے ہاں رہے۔ کھانا تو محمودہ بیگم کے اصرار کے باوجود انہوں نے نہیں کھایا لیکن سب اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے رہے کہ ایک ہی خاندان کے فرد معلوم ہونے لگے۔

شمو بڑی ہمدردی سے محمودہ بیگم سے خالد کے متعلق پوچھ رہی تھی اور وہ بیٹیوں کے منع کرنے کے اشاروں کے باوجود اپنے دکھڑے انہیں سنارہی تھیں۔ شمو

کے علاوہ اشی بھی بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ محمودہ بیگم کے آنسو اس کے من میں ہلچل مچا رہے تھے۔

”تم سے کیا چھپانا بیٹی..... ہماری تو گزر بسر ہی تقریباً خالد کی تنخواہ پر تھی..... کم از کم سارہ کی شادی ہو جاتی..... تو اچھا تھا..... اب تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“

”حد ہوگئی امی..... جانی.....“ ریشم کو کچھ کچھ سخت سی محسوس ہوئی..... ”خالد بھائی کونسا ہزاروں بھیج دیتے تھے..... باجی کی شادی اللہ کے فضل سے اچھی ہی ہو جائے گی۔ اس کے بعد کی فکر نہ کریں..... میں پاس ہوگئی تو کہیں نوکری کر لوں گی..... ماں بیٹی ٹھاٹھ سے رہ سکیں گے..... کیوں شمو باجی..... نوکری کرنے میں کوئی حرج تھوڑا ہی ہے۔“  
 وہ ہنس دی لیکن اشی کچھ پریشان سا ہو گیا۔

شمو محمودہ بیگم کو تسلی دینے لگی لیکن انہیں تو جانے کیا ہو گیا تھا۔ روتے روتے بار بار یہی تذکرہ کئے جا رہی تھیں۔

اور جب مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد ریشم اور سارہ دونوں ماں کے پیچھے پڑ گئیں تو وہ بڑے افسردہ لہجے میں بولیں۔ ”تم ابھی نا سمجھ ہو..... میں نے جان بوجھ کر ان کے سامنے یہ باتیں کی تھیں۔“

”مصلحت کیا تھی؟“ سارہ نے پوچھا۔ ”انہوں نے دے جانا تھا کچھ آپ کو؟“

”مصلحت ہی تھی بیٹی۔“ محمودہ بیگم نے ایک گہرا سانس لیا۔  
 ”اپنا وقار بھی تو کچھ رکھنا چاہیے۔“ ریشم بولی۔ ”کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ؟“

”اسی لیے تو ساری باتیں کر دیں میں نے۔ کل کلاں کو ان کے ہاں رشتہ طے ہو ہی جاتا ہے تو پھر کچھ تو ہمارے حالات کا اندازہ ہوگا انہیں۔ بڑے جہیز کی توقع تو نہ رکھیں گے۔“

”بڑی سیانی ہیں ہماری امی.....“ سارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ڈپلومیٹ۔“ ریشم نے بھی ہنس کر کہا۔ ”ہم سمجھتے تھے امی جانی بس سیدھی سادی سی ہیں۔“

محمودہ بیگم نے پیار سے دونوں بیٹیوں کو دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ انہیں عشاء کی نماز پڑھنا تھی۔  
سائرہ اور ریشم کرسیاں اور برتن اٹھائے ہوئے اشی کی باتیں کرنے لگیں۔



انسانی طبع بھی عجیب شے ہے۔ نہ اثر لے تو سنگین سے سنگین واقعوں سے بھی نہ لے اور اثر لینے پر آئے تو معمولی سی بات بھی سنگ گراں بن جائے۔ اشی ریشم کے ہاں سے لوٹا تو طبیعت بکاش ہونے کی بجائے پژمردہ تھی۔ ریشم کے گھریلو حالات کی تلخیوں کا اندازہ اسے محمودہ بیگم کی باتوں سے بخوبی ہوا تھا۔ اسے ان دیکھے خالد پر بے پناہ غصہ آ رہا تھا جس نے اپنے حالات کو جانتے بوجھتے یوں آنکھیں پھیر لی تھیں۔ ریشم نے نوکری کر لینے کا بے شک ہنستے ہنستے کہا تھا لیکن اشی کا دل دکھ گیا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ عورتوں کے ملازمت کرنے کا بہت بڑا مخالف تھا۔ اس بارے میں تو کبھی سوچنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی لیکن ریشم کے ساتھ ملازمت کا لفظ وابستہ ہونا اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ محبوب سی ہستی تو دل میں چھپا لینے کے لیے تھی۔ حالات کی چیرہ دستیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے نہیں۔

اس رات وہ ٹھیک طرح سو بھی نہ سکا۔ پریشانیاں ذہن سے چھٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ ریشم کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے اس نے کس کس پہلو نہ سوچا تھا..... لیکن کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کرے۔ اپنے مالی حالات ایسے نہ تھے کہ ریشم کا بار ابھی سے اٹھا لیتا..... امتحان کی تیاری بھی مشکوک ہی تھی۔ کاش اس کے پاس بے پناہ دولت ہوتی۔ تلخیوں سے شکست کھاتے ہوئے اس نے جھنجھلا کر سوچا تھا۔ وہ کئی دن پریشان رہا۔ اس پریشانی میں وہ کتابوں سے بھی بیگانہ ہو گیا۔

اور اس رات جب وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا..... میز پر دونوں ٹانگیں رکھے کرسی میں پڑا سوچوں میں گم تھا..... کہ شہواندر آگئی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔  
”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔



”یہ سگریٹوں پر اتنا زور کیوں ہے؟“ شمو نے میز اور کرسی کے بازو پر سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ دیکھتے ہوئے کہا۔

”غصہ غلط کر رہا ہوں۔“

”دکس بات کا؟“

”حالات کا۔“

”اللہ نہ کرے جو حالات اتنے غمگین ہوں..... لگتا ہے پڑھائی وغیرہ کچھ بھی نہیں کی اور اب امتحان کے خوف سے فرار کے لیے سگریٹوں کا سہارا لے لیا ہے۔“

اشی نے ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے بالوں کو خفیف سے جھٹکے سے پیچھے ہٹایا اور ادھوری سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولا۔ ”امتحان میں تو گول ہو جانا یقینی ہو گیا ہے۔“

”بری بات ہے۔“

”سچ کہتا ہوں شمو۔ بالکل پڑھا نہیں جاتا..... پہلے بھی بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے اور اب تو.....“

”اب کیا؟“

”پریشان۔“

”کیسی؟“

وہ پھر زخم خوردہ سی مسکراہٹ لبوں پر لے آیا۔

”کچھ کہو گے بھی.....“ شمو الجھنے کو تھی کہ وہ بولا۔ ”ریشم کے ہاں تم پھر نہیں گئیں؟“

”نہیں..... کیوں؟“

”اس کے بھائی کی شادی کا کیا بنا؟“

”شادی کر لی اس نے.....“

”ہیں.....“ وہ آگے جھک کر بے تابی سے بولا۔

”آج نیمہ بتا رہی تھی..... خالد بضد تھا۔ اس لیے اس کی امی نے جا کر باقاعدہ دونوں کی شادی کر دی..... شاید دو چار دن میں وہ اپنی بیوی سمیت آ بھی رہا ہے..... لیکن

تمہیں اتنا تردد کیوں.....؟“

”اب تو ریشم کو ملازمت ضرور ہی کرنا پڑے گی۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”تم اسی لیے پریشان ہو.....؟“

”ہاں.....“

”پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر اس نے ملازمت کر بھی لی تو کوئی بری بات تھوڑا ہی ہے۔“

اشی نے بے قرار ہو کر کرسی پر پہلو بدلا اور پھر بے جان سی آواز میں بولا۔ ”مجھے یہ بات پسند نہیں.....“

”اجی صاحب۔“ شمو مسکرانے لگی۔ ”ابھی اس پر اپنی پسند و ناپسند ٹھونسنے کا اختیار تم کو کس نے دیا..... یہ حق تو ملنے میں بھی شاید ابھی کئی سال لگیں گے۔ امی کی شرط اپنی جگہ قائم ہے۔ اشی جب تک معقول روزگار نہیں پالیتے..... شادی..... نہیں ہو سکتی..... تمہیں تو چاہئے تھا محنت کرنے میں دن رات ایک کر دیتے.....“

اشی نے ماہی سے سر کو جھٹکا دیا۔ ”پاس ہونے کی امید بہت کم نظر آ رہی ہے۔“

”تو پھر چپ چاپ تماشا اہل کرم دیکھتے جاؤ۔“ شمو نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔ وہ مسکرایا نہ ہنسا۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے نکا دیا۔

”امتحان پاس کئے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔“ وہ بنجیدہ تھا۔

شمو کھلکھلا کر ہنس پڑی..... اور پھر اس کا سر پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ساڑھے تین سو روپے کی پرائیویٹ نوکری پر کوئی سر پھرا ہی ہوگا جو اپنی بیٹی تمہارے حوالے کرے گا۔ یہ پیسے تو تمہارے سگریٹوں پر ہی اڑ جاتے ہیں..... ہوٹل کے دو چار چکر ہی نگل جاتے ہیں..... کس خوش فہمی میں مبتلا ہواشی.....؟“

اشی چپ رہا..... شمو بنجیدگی سے بولی۔ ”ہم کوئی جاگیر دار ہیں نہ سرمایہ دار۔ ابو کی تنخواہ ہی تنخواہ ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو..... ایسی صورت میں شادی کا خیال بھی مضحکہ خیز ہے..... یوں شاید تم ریشم کو ملازمت کے چکر سے نجات دلانے کے متمنی ہو لیکن سوچو تو سہی ساڑھے تین سو میں کیا ہو سکتا ہے..... ایک جنجال سے چھڑا کر جنجالوں کے جہنم میں اسے



دھکیلنا چاہتے ہو.....“

شمو پیار سے اسے زندگی کے نشیب و فراز سمجھانے لگی۔ باتیں معقول تھیں۔ اشی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”ریشم کی بجائے تم اپنی زندگی بنانے کی فکر کرو۔ خالد کی شادی سے اس کے مالی حالات بے شک ناخوشگوار ہو جائیں گے لیکن میں سمجھتی ہوں، دلفگار نہیں ہوں گے۔ اس کی امی سمجھدار عورت ہیں۔ بھلا وقت دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس آبرو مندانہ زندگی گزارنے کو ضرور اثاثہ ہوگا۔ کچھ بھی نہ ہو جب بھی جائیداد کا سہارا موجود ہے۔ ہمارے پاس تو یہ بھی نہیں.....“

وہ دیر تک اسے سمجھاتی رہی..... وہ باتیں معقول کر رہی تھی۔

اشی معقولیت کا قائل تو ہو گیا لیکن دل و دماغ پر لہراتے پریشانی کے سائے چھٹ نہ

سکے۔

کئی دن گزر گئے..... شمو واپس چلی گئی اور یوں ریشم کے ہاں جانے کا وسیلہ ہی نہ رہا..... ویسے بھی عذرا بیگم کو وقت بے وقت ان کے ہاں اس کا جانا پسند نہ تھا۔ لوگ ذرا سی بات کا متنگز بنا لیتے ہیں۔ خود بھی بیٹیوں والی تھیں۔ بیٹیوں کی عزت کی نزاکت کا پورا پورا احساس تھا۔ منگنی ہوئی ہوتی یا نکاح تو بات بھی بنتی تھی۔

اشی بیچارہ اب حالات ہی کے رحم و کرم پر تھا اور اس دن مقدر شاید موج میں تھا۔ ریشم اسے ڈاکٹر کی دکان سے نکلتی مل گئی۔

وہ کھنچا ہوا اس کی جانب آیا۔ پر شوق نظروں کا تبادلہ طوفانی تھا۔ کتنی بے صبری سے وہ اسے دیکھ رہا تھا اور کیسی اپنائیت سے وہ ان بے صبر نگاہوں کو قبول کر رہی تھی..... کئی لمحے دونوں ایک دوسرے کو صرف دیکھتے رہے..... پھر اشی کو شاید گرد و پیش کا احساس ہوا..... سڑک پر زندگی رواں دواں تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ گاڑیاں، رکشے، ٹیکسیاں، تانگے سبھی گزر رہے تھے..... فٹ پاتھوں پر چھا بڑی والے بھی تھے اور ریڑھیوں پر سامان سجائے لوگ بھی..... خریداروں اور راہگیروں کا جھوم تھا۔

”خیریت؟“ وہ اس کے قریب آ گیا۔

”امی بیمار ہیں۔“ وہ بولی۔

”کیا ہوا انہیں.....“ اس نے پوچھا۔

”بہو کا غم.....“ وہ ہنسی۔ ”خالد بھائی نے شادی کر لی ہے نا۔“

”مجھے شمو نے بتایا لیکن خالد جان.....“

”امی بڑی حساس ہیں..... ہر بات کا جلد اثر لیتی ہیں۔ ظاہر تو نہیں کرتیں لیکن

طبیعت گری گری اسی لیے رہتی ہے.....“

دونوں باتیں کرتے کرتے ٹیکسی سٹینڈ کی طرف بڑھے۔ اشی کا جی کہاں بھرا

تھا..... وہ تو وقت کے اس حسین التفات کو گھنٹوں پر پھیلا نے کا متمنی تھا۔

”ریشم.....“ بس کے انتظار میں کھڑے چند منٹ ہوئے تھے کہ اشی ملتجیانہ بولا۔

”جی.....“

وہ جھجکا..... رکا اور پھر مسکرا دیا۔

”کچھ کہنا چاہ رہے ہیں آپ.....“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ایک التجا.....“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کہئے.....“ وہ مسکرائی۔

”ریسٹورنٹ وہ سامنے ہے..... کچھ دیر رک سکتی ہو.....“ اشی نے جھجکتے ہوئے

خواہش ظاہر کی۔

”کچھ باتیں کرنا ہیں۔“

ریشم ادائے دلربائی سے سرکوفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولی۔ ”شکریہ۔ مجھے

یہ پسند نہیں۔ باتیں گھر پر بھی ہو سکتی ہیں.....“

”شمو چلی گئی.....“ وہ کچھ نادم سا ہو گیا..... ”اب تو گھر پہنچنے کا بھی بہانہ نہیں

بنتا۔“

”نچھی تو ہے.....“ ریشم بولی۔

”تم بھی تو کبھی نہیں آتیں۔“ اشی نے گلہ کیا۔

”اگلے ماہ باجی کی شادی ہے۔ مصروفیت ہے۔ اس پر امی کی ناسازی

طبع.....“ وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکرائی۔ اس کے گال متمارہے تھے۔ فضا میں بھی حدت تھی اور قربت میں بھی..... سفید لمبل کی چادر میں لپٹی وہ بڑی پروقار لگ رہی تھی.....  
بس آگئی۔ ریشم نے غلت سے قدم اٹھائے۔ اشی نے بڑے عجز سے کہا۔  
”ریشم سٹورٹ میں نہ سہی، یہاں ہی کچھ دیر کے لیے رک جاؤ ریشم..... اگلی بس میں چلی جانا۔“ ریشم کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس نے مسکراتی نگاہ اس پر ڈال دی۔ بس آئی، اگلا بوجھ اگلا نیا لگلا اور اپنے راستے پر چل دی۔ سینڈ سے چند قدم ہٹ کر کسی پرانے بنگلے کی بوسیدہ دیوار کے قریب پرانے پیپل تلے دونوں رک گئے۔

اور پھر لمحوں میں کئی کہانیاں ترتیب پا گئیں..... اشی نے بہت سی باتیں کیں۔ اپنی پریشانیاں بتائیں۔ دوسوے گنوائے۔ ریشم دھیرے دھیرے مسکراتی اس کی باتیں سنتی رہی..... خالد کا فعل اشی کے نزدیک قابل معافی نہیں تھا۔ اسے وقت کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اپنی ذات میں سمٹ کر سوچنے کی بجائے ذات سے ہٹ کر سوچنا چاہیے تھا۔  
ریشم سنتی رہی۔ پھر مسکرائی اور بولی۔ ”آپ کی سوچ بھی امی کی سوچ ہے۔“  
”خالد جان حق بجانب ہیں۔“

”بات ساری پیسے کی ہے اشی.....“ ریشم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ٹومس تقدیر ہمارے مالی وسائل محدود ہیں۔ خالد بھائی جب بھی شادی کرتے۔ اپنی مرضی سے یا امی کی مرضی سے۔ حالات ایسے ہی ہونا تھے۔“

”خالد کو اپنی باتوں کا تواضع کا احساس ہونا چاہیے تھا۔“  
”احساس کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ شادی کا بھی نام ہی نہ لیتے..... جو شاید انتہائی غیر فطری بات ہوتی.....“

ریشم نے ایسے جہان دیدہ انداز میں کہا کہ اشی ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ریشم کو ہنسی آگئی۔ غور سے اشی کو دیکھا اور پھر خوشگوار لہجے میں کہنے لگی۔ ”جذباتی پن اصل بات سے انسان کو دور لے جاتا ہے..... حقیقت کو حقیقت کہنا چاہیے..... اس سے نپٹنے کی پوری ایمانداری سے کوشش کرنی چاہیے..... جذباتیت، گریز اور فرار کی راہیں دکھاتی ہیں۔“  
”تو بہ..... تم تو.....“

”مجھے بالکل نہیں لگتا کہ کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔ مالی حالات کا بوجھ کب تک خالد بھائی اٹھاتے۔ پھر کوئی قیامت بھی تو نہیں ٹوٹی..... امی کو تو جانے کیا ہو گیا ہے۔ الجھاؤ دور کرنے کا یہ طریق مجھے تو پسند نہیں کہ بیمار پڑ جاؤ.....“  
اشی مسکرانے لگا۔ ریشم سچی بات کہہ رہی تھی۔ دل ہی دل میں معترف تھا لیکن اپنی بات پر اڑا رہا۔ مصر تھا کہ خالد نے خود غرضی کی ہے۔ ریشم کئی لمحے اشی کے چہرے پر نظریں جمائے رہی.....

”کیوں.....“ اشی نے اشارے سے پوچھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“

”ہوں۔“

”خالد بھائی کی جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے.....“

اشی کھلبلا سا گیا۔ ریشم کے ہونٹوں سے ہنسی پھسلنے لگی۔ بڑا ظالم سوال تھا۔

”بتائیے نا..... آپ کیا کرتے.....“ وہ پیار سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

”میں حالات کو نارمل کرنے کی کوشش کرتا۔“ وہ بولا۔

”وہ کیسے؟“ ریشم نے پوچھا۔ وہ کئی ثانیے چپ رہا۔ ریشم اسے لا جواب کرنے کو مسکراتے ہوئے اصرار سے پوچھتی چلی گئی۔ ”خالد بھائی کی جگہ اپنے آپ کو فٹ کر کے بتائیے۔ آپ کا لائحہ عمل کیا ہوتا.....“

اشی چند لمحے سر جھکائے کھڑا مسکراتا رہا۔ پھر بڑے اعتماد سے سر اٹھایا۔ چمکتی شوخ آنکھیں ریشم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”بتاؤں؟“

”ہاں۔“

”برائیاں مانو گی نا۔“

”میں والدین اور بہنوں کی خواہشات کا گلا گھونٹ دیتا.....“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

ریشم نے بھونچکے ہو کر اسے دیکھا۔ وہ بڑا سنجیدہ تھا۔

”واقعی؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”بالکل.....“ وہ اسی اعتماد سے کہہ رہا تھا۔

ریشم کے ہونٹوں پر نرم پھوار کی طرح ہنسی آ گئی۔ ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اشی۔ آپ بھی وہی کرتے جو خالد بھائی نے کیا ہے..... قربانی ایسی آسان بھی نہیں کہ.....“

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو.....“ اشی نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔

”واقعی چھوڑیے۔ وہ دیکھئے میری بس آرہی ہے.....“ ریشم نے جلدی سے رخ موڑا۔ اشی بھی بے دلی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اس کا بس چلتا تو وہ ریشم کو اس بس سے بھی نہ جانے دیتا۔

-----○-----

محمودہ بیگم بیمار تو نہ تھیں۔ ہر وقت کے ذہنی الجھاؤ تھے جس سے بیماروں سے بدتر ہو رہی تھیں۔ خالد کا نکاح خود ملتان جا کر کر دیا تھا۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ خاندان نچلے متوسط طبقے کا تھا۔ لوگوں نے تو بڑھا چڑھا کر کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ لوگ ایسے برے بھی نہ تھے اور پھر خالد کا اصرار تھا۔ اپنے ہاتھوں یہ فریضہ سرانجام نہ دیتیں تو بعید نہ تھا، خود سری سے یہ کام لیا جاتا..... مصلحت یہی تھی، تقاضا یہی تھا۔

خالد کا نکاح تو تقریباً مفت ہو گیا تھا۔ مسئلہ تو سائرہ کی شادی تھی..... زیور مدتوں سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ کام آ گیا۔ کپڑا بھی تھوڑا بہت پاس تھا لیکن بیٹیوں کا ایک جنجال تو نہیں ہوتا۔ ابھی سسرال والوں کے کپڑے آنا تھے۔ فرنیچر لینا تھا۔ برتن پورے کرنے تھے اور پھر برات کا کھانا بھی تو اچھا خاصا خرچ تھا۔ علاوہ ازیں چھوٹے موٹے بے شمار اور بے حساب خرچ تھے۔ محمودہ بیگم کی تو راتوں کی نینداڑ چکی تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ مزاج بے حد چڑچڑا ہو گیا تھا۔

ایک تو ان اخراجات کا مسئلہ ہی حل طلب تھا۔ اس پر روزانہ کا خرچ جو ایک دم بڑھ گیا تھا، کچھ سمجھ نہ پاتیں کہ کیا کریں۔ شادی کا رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کو پتہ چل چکا تھا۔ کبھی ایک آ رہا تھا، کبھی دوسرا..... کوئی کھانے پر بیٹھا ہے، تو کوئی چائے پر۔ خاندان کے لڑکے لڑکیوں کو تو خدا نے موقع دیا تھا، جگہ ٹھٹھے لگے رہتے۔ بھگدڑ مچانا، مسرور ہنگامے رچانا تو ان کا شغل ہی تھا..... شوکی، راحت، اظہر بھی، ٹوٹو، شمع بھابھی، ثریا آ پا اور رابی وغیرہ تو روز ہی چلے آتے۔ کام کم باتیں زیادہ..... محمودہ بیگم جو مہمان نواز اور رکھ رکھاؤ والی عورت تھیں، مجبوری کے چنگل میں اس طرح جکڑی گئیں کہ ذہن ماؤف ہو ہو گیا۔

سائرہ بڑی حساس تھی۔ حالات کو سمجھتی تھی۔ بہت ہی افسردہ رہنے لگی۔ گم صم سی

بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے کھائی کے سرے پر کچے دھاگے سے لٹک رہی ہو..... اپنے آپ پر غصہ آتا۔ اپنے سے نفرت ہونے لگتی۔ وہ صاف طور پر محسوس کرتی تھی کہ اس کا وجود ایسا بوجھ ہے جو امی بچاری کے ناتواں کندھے سہارنے سے بے بس ہیں۔ چھپ چھپ کر روتی رہتی۔ شادی جس امنگ، ولولے اور رنگین رنگین خواہشوں کا نام ہے۔ ان کا دور دور نشان نہ تھا..... رشتہ کی بہنیں، سہیلیاں اور نئی بیاہتا بھابھیاں اسے چھیڑتیں، گدگداتیں جب بھی ان جاندار جذبوں سے اس کا من سویا رہتا۔

شادی کے ان اخراجات سے بخوبی نیپٹے کا ایک ہی حل تھا۔

اور

وہ تھا..... کوٹھی کے عقبی دو کوارٹروں والے حصے کو بیچنے کا۔

محمودہ بیگم ایک طرف تو اتنی مجبور تھیں کہ اسے بیچ دینے کے سوا چارہ نہیں تھا لیکن اسے وقار کا مسئلہ بھی بنائے ہوئے تھیں۔ رشتہ داروں اور عزیزوں میں وقار اور بھرم بھی رکھنا چاہتی تھیں۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ بس ہر وقت یہی سوچتی رہتیں۔

ریشم کا مزاج بھی ان دنوں بگڑا بگڑا رہتا۔ سائرہ کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل دکھتا۔ یہ پہلی لڑکی تو نہ تھی جس کی شادی ہو رہی تھی۔ اس نے نعرہ کو بھی دیکھا تھا۔ ثریا کی بھی شادی اس کے سامنے ہوئی تھی۔ شو بھی بیاہی گئی تھی اور رابعہ کا بھی بیاہ رچا تھا۔ کس طرح چمکتی پھرتی تھیں۔ ہنسی تھی کہ انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ دولہوں کے نام پر ہی باچھیں کھلی جاتی تھیں..... رنگ کس قدر نکھر گئے تھے۔ خوبصورت نہیں تھیں لیکن حسین لگنے لگی تھیں۔

اور ایک سائرہ باجی تھیں کہ اچھا خاصا سپید رنگ میالہ ہو گیا تھا۔ ہنسی ہونٹوں سے غائب ہی رہتی تھی۔ ہر وقت کی سوچ نے عمر سے دو چار سال آگے ہی بڑھا دیا تھا..... متفکر آنکھیں، بے رنگ چہرہ اور ٹھنڈی سانسیں..... کون کہہ سکتا تھا کہ ان کی شادی ہو رہی ہے۔ ریشم کا دل تڑپ جاتا۔ وہ سائرہ باجی کی خوبصورت غلامی آنکھوں میں خوبصورت خوابوں کے عکس ڈولتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی ہنسی میں کھنک محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اس کے جسم کی ایک ایک حرکت میں شوخی اور چنچل پن دیکھنے کی متمنی تھی۔

بہن کی حالت دیکھ دیکھ کر اسے امی پر غصہ آتا تھا۔ ہر وقت کی ہائے وائے نے ہی

اسے اس قدر رنڈ حال اور پرشمرہ کر دیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ دبے دبے لفظوں میں امی سے کہہ رہی تھی کہ باجی کے سامنے ہر وقت خرچ کا رونا نہ رویا کریں لیکن وہ شاید اپنی جگہ سچی تھیں لیکن ایک دن تو ریشم ان سے الجھ ہی گئی۔

شمع بھا بھی، شوکی، ثروت، رابی اور ٹوٹو نے دوپہر کا کھانا یہیں کھایا تھا۔ شام کی چائے پر عذرا بیگم، بڑی چچی اور نعیمہ تھیں..... وہ ابھی گئی بھی نہ تھیں..... کہ سائرہ کی دو سہیلیاں آگئیں اور شام اتر رہی تھی کہ رضیہ اور حامد پہنچ گئے۔

سارا دن مہمانوں کی آؤ بھگت میں گزر گیا۔ رات محمودہ بیگم بستر پر لیٹیں تو بڑی جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

”امی جانی،“ ریشم بھی انہی کے بستر پر آ لیٹی تھی۔  
”ہوں۔“

”یوں تو کام نہیں چلے گا۔ ذرا موڈ خوشگوار رکھا کریں۔“  
”کیا مطلب؟“

”مہمان تو آئیں گے ہی خرچ بھی ہوگا.....“  
”یہی تو فکر مجھے کھائے جاتا ہے۔ خرچ کہاں سے ہوگا۔“  
”کوٹھی کا پچھلا حصہ بیچ دیں۔“

”بیچنا ہی پڑے گا۔“

”خرچ بھی کیا ہے۔ اپنا ہی ہے، کسی کا تو نہیں۔ ضرورت پڑی ہے بیچ رہے ہیں، شرم کی بات ہے نہ کسی سے ڈرنے کی.....“

”یہ تو کہہ رہی ہے نا۔ ظاہر داری کا بھرم.....“

”اوہ امی جانی.....“ ریشم ماں کے پہلو میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”خدا کے لیے جھوٹی سچی..... ظاہر داریوں کے چکر سے نکل آئیے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اس وقت پیسے کی ضرورت ہے اور پیسہ نہ آپ کے پاس ہے۔ نہ خالد بھائی کے پاس..... شکر کریں جو جائیداد کی صورت میں یہ جگہ پڑی ہے۔ لوگوں کے سامنے خول میں چھپ کر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی مدد تو نہیں کر دے گا ہماری۔ جو کچھ کرنا ہے ہم نے خود ہی کرنا ہے۔ جو

کچھ سوچنا ہے، خود ہی سوچنا ہے۔ اس حصے کو بیچنے سے اتنی رقم تو مل ہی جائے گی جو باجی کی شادی اچھی طرح سے ہو جائے۔“

”تو تو صرف حال ہی کا سوچتی ہے نا..... جگہ بیچ تو دوں لیکن یہ بھی تو سوچ پھر کرایہ آنا بھی بند ہو جائے گا..... خالد کی طرف سے خرچہ پہلے ہی بند ہے۔ کرائے کا آسرا بھی نہ رہا..... تو کھائیں گے کہاں سے.....“

ریشم چند لمحے سر جھکائے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ”امی آپ حال سے تو پٹنیں۔ پھر مستقبل کا بھی سوچ لیں گے.....“

”ہونہ۔“ امی نے گہرا سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔  
”کہہ جو دیا امی جانی..... مستقبل کا فکر نہ کریں..... میں نے نوکری کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ ماں بیٹی کے لیے تنخواہ کافی ہوگی.....“  
”تو نوکری کرے گی؟“

”ضرور کروں گی..... عیب کی تو بات نہیں۔“

اور پھر ریشم ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ان کے پہلو ہی میں لیٹ گئی..... ماں کے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے بولی۔ ”امی جانی باجی بیچاری کا بھی کچھ احساس کریں..... کتنی گم صم رہنے لگی ہیں..... ہر وقت سوچتی رہتی ہیں.....“  
”اسے دیکھ دیکھ بھی تو کلیجہ جلتا ہے۔“

”خالی خولی کلیجہ نہ جلائیے۔ کٹھی کا عقبی حصہ بیچ دیجئے..... بہتر پیسے مل جائیں گے..... شکر کریں کہ خریدار بھی ہاتھ میں ہے..... کل ہی بات کریں۔“

ریشم ماں کو پیار کر کے سمجھاتی رہی..... محمودہ بیگم چپ چاپ سنتی رہیں..... دل ہی دل میں قائل ہوتی رہیں اور پھر انہوں نے سچ مچ جگہ بیچ دینے کا فیصلہ کر لیا..... لوگوں سے ڈرنے کی کوئی بات نہ تھی۔

وہ جگہ انتہائی معقول قیمت پر بک گئی..... محمودہ بیگم کے ذہنی الجھاؤ کسی حد تک ختم ہو گئے۔ ریشم تو انتہائی مسرور رہنے لگی..... سائرہ کے چہرے پر بھی شگفتگی کے عکس پڑنے لگے۔

پیسے ہاتھ میں آتے ہی ریشم اور سائرہ نے گھر اور بازار ایک کر دیا۔ جو جو چیز لانا تھی لے آئیں۔ کبھی درزی کے پاس جا رہی ہیں۔ کبھی فرنیچر والے کے پاس۔ کبھی سنار کی دکان کا چکر ہے تو کبھی کپڑے کی مارکیٹ کا۔

دنوں میں جہیز تیار ہو گیا۔ بے شک یہ ساز و سامان قابل نمائش نہیں تھا۔ پھر بھی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ چیزیں کم تھیں لیکن صاف ستھری۔ عمدہ ذوق کی علامت نظر آتی تھی۔ ریشم کا بس چلتا تو زمانے بھر کی چیزیں اکٹھی کر لیتی۔ ٹی وی کے لیے تو اس نے بہت زور مارا تھا لیکن محمودہ بیگم رضامند نہ ہوئی تھیں۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ اس پیسے میں سے اتنا بچا لیں کہ وقت بے وقت ضرورت آن پڑنے پر کسی کے سامنے دست مدعا نہ پھیلانا پڑے۔ کچھ ریشم کے لیے بھی پس انداز کرنا چاہتی تھیں لیکن مہنگائی کمر توڑ رہی تھی۔ ایک کی جگہ دس خرچ ہو رہے تھے۔ کچھ چارہ نہیں چلتا تھا۔ ہار کر یہی شکر کرتیں کہ سائرہ کی طرف سے سرخرو ہو جائیں گی۔ ریشم کا غم کھانے کو ابھی کافی وقت تھا۔

اشی اور اس کے گھر والوں نے دوڑ دھوپ میں برابر کا حصہ لیا۔ عذرا اور صغیر احمد تو خاص طور پر اپنی خدمات پیش کرنے آئے تھے۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں مالی اعانت کا بھی اشارہ کیا تھا۔

محمودہ بیگم ان کے خلوص اور ہمدردی سے بے حد متاثر ہوئی تھیں۔ شریفانہ پیشکش کا دل سے شکریہ ادا کیا تھا۔

”ہمیں غیر نہیں سمجھئے بہن.....“ صغیر احمد نے خلوص سے کہا تھا۔ ”سائرہ بھی اپنی بچی ہے۔ جو کام ہو بلاتا مل کہئے۔ ہم ہر خدمت کو حاضر ہیں۔ ریشم بیٹی کی وجہ سے آپ سب ہمیں عزیز ہیں۔“

عذرا بیگم نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ریشم کو تو وہ پورے خلوص اور نیک نیتی سے اپنی بیٹی بنا چکی تھیں۔ انکار محمودہ بیگم کو بھی نہیں تھا۔ معاملہ دنوں خاندانوں میں تقریباً طے پا ہی گیا تھا۔ منگنی تو دکھاوے کی ایک رسم تھی۔ اصل معاملہ تو نیتوں کا ہوتا ہے۔

محمودہ بیگم ان کے سلوک اور ہمدردی سے بے حد خوش ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ پھر بھی ان سے جہاں تک بن پڑا، ہر کام میں ہاتھ بٹایا۔ نجھی اور شگوسارا سارا دن

آ کر کام کرتی رہیں۔ باورچی خانے تک میں محمودہ کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ اشی نے بھی باہر کے چھوٹے موٹے کئی کام اہل خانہ کے تکلف کے باوجود کر دیئے..... فرنیچر دکان سے گھر لانے کا بندوبست کیا۔ چینی کے پرٹ بنوائے۔ گھی کنٹرول ریٹ پر لے کر دیا۔ چاول اپنے ایک زمیندار دوست کے گاؤں سے منگوا کر دیئے۔

محمودہ بیگم تو اٹھتے بیٹھتے ان لوگوں کے گن گار رہی تھیں۔ ریشم من ہی من میں پھولی نہ ساتی۔

رشتہ دار عزیز تھے تو بہت لیکن اس کام میں معاونت ظاہری حد تک ہی کی تھی..... کسی نے جھوٹے منہ آ کر نہ پوچھا تھا کہ پیسہ کہاں سے لوگی۔ خرچ کیسے چلے گا۔ ان لوگوں نے البتہ باتیں خوب بنائی تھیں۔ اشی اور اس کے گھر والوں سے میل جول خوب کھٹک رہا تھا۔ اشاروں کنایوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔

شادی سے ہفتہ بھر پہلے خالد بھی آ گیا۔ نئی دہن سلیمہ کی پذیرائی خاندانی شان سے ہوئی۔ محمودہ بیگم نے کچھ کپڑے اور ایک آدھ زیور اس کے لیے بھی رکھا تھا۔ ریشم اور سارہ نے بھی خیر مقدم خندہ پیشانی سے کیا۔ جیسی بھی تھی اب تو ان کی بھابھی تھی۔

خالد اشی سے پہلی بار متعارف ہوا تھا۔ شاید اسے بھی باقی خاندان والوں کی طرح اشی کا گھر میں آنا عجیب لگتا لیکن محمودہ بیگم نے پہلے ہی ساری بات اس پر واضح کر دی تھی۔ پھر اشی کی باغ و بہار شخصیت، بے لوث خدمت اور شریفانہ طرز عمل..... خالد کہتا بھی کیا۔ دوستی کا ہاتھ اس نے بھی بڑھا دیا..... سارا کام دونوں نے سکے بھائیوں کی طرح بانٹ لیا۔

-----O-----

رات رسم حنا تھی۔

لان میں مہمانوں کے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ اشی نے خاندان کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر چمن کو خوب سجایا تھا۔ رنگ برنگ قمقموں کے بار درختوں میں چمک رہے تھے۔ پاور فل بلب جگہ جگہ روشن تھے۔ رنگ برنگ کرسیاں، اترے میں پڑی تھیں۔ درمیان میں کچھ کھلی جگہ لڑکیوں بالیوں کے ناچنے گانے کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔

مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ اندر باہر ہلچل مچی تھی۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ کبھی کبھی تو ہوا کا جھونکا اتنا سرد ہوتا کہ کپکپی سی آ جاتی۔ ریشم نے سنہری رنگ کا خوبصورت لباس پہنا..... اس کے حسین بدن کی ساری رعنائیاں لباس کی بندش میں کسمسا رہی تھیں۔ اس کے بالوں کا بڑا خوبصورت جوڑا نجھی نے بنایا تھا۔ میک اپ کی اسے ضرورت نہ تھی۔ آنکھیں پہلے ہی کیا کم قاتل تھیں۔ اب تو ان میں اشی کی قربت کا جاں فزا احساس بھی چمک رہا تھا..... نگاہیں دیوانہ کر دینے کی ساری خاصیتیں لیے ہوئے تھیں۔

سلیمہ تو اسے دیکھ کر اچھی خاصی احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی۔ شوخ شوخ میک اپ اور بھڑکیلے لباس کے باوجود ریشم کے مقابلہ میں ماند ماند تھی۔

”بھابھی کیسی لگتی ہوں؟“ ریشم نے اترا کر پوچھا۔

”بھابھی..... بہت ہی پیاری لگ رہی ہو۔“ سلیمہ کی بجائے نجھی نے اس کے

کان میں سرگوشی کی۔

ریشم کے گالوں پر شفق پھوٹ گئی۔ وہ نجھی کو مارنے کو لپکی۔ نجھی

بھاگی..... بھاگتے بھاگتے کہے گئی۔

”آج تو بار بار کہوں گی۔“



”میں تم سے سمجھوں گی نجھی کی بیٹی.....“ ریشم دروازے سے باہر آ گئی۔  
نجھی منہ چڑاتے ہوئے چھلانگ لگا کر چمن میں کود گئی۔

”واہیات۔“ ریشم نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کون..... میں“ آواز پر ریشم ایک دم پلٹی۔ اس کے پیچھے اشی کھڑا تھا۔ شاید دوسرے دروازے سے ادھر آ رہا تھا۔ وہ کوک اور سیون اپ کے کریٹ اندر رکھوا کر آ رہا تھا۔ ریشم کی جج جج نے ایک لمحہ کو تو سحر زدہ کر دیا۔ پھر شوق و آرزو کے طوفان آنکھوں میں لیے کچھ اس انداز سے اسے دیکھا کہ وہ شرمائی گئی۔

”یہ واہیات کے لقب سے کسے نوازا جا رہا ہے.....“ اشی نے چشم شوق سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے بھائی جان۔“ نجھی نے ریشم کی پشت پر آتے ہوئے دونوں بانہیں پیار سے اس کے گلے میں ڈال دیں۔

”کیوں؟“ اشی نے پوچھا۔

”بتا دوں؟“ نجھی نے ریشم کے کان کے قریب منہ کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”اللہ نجھی تم بہت بدتمیز ہو۔“ ریشم گلے سے اس کے بازو نکالتے ہوئے پٹٹائی گئی۔

”کیا بات ہے نچھو..... بڑے القابوں سے نوازی جا رہی ہو۔“ اشی نے شوق

تجسس سے پوچھا۔

نجھی اس کے گلے میں بازوؤں کا ہار ڈالے اس کی پشت سے چبٹی برابر ہنسنے جا رہی تھی..... ریشم پٹٹا رہی تھی۔ چہرہ لال بھسوکا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس نے جج جج ہی اشی کے سامنے کہہ دیا..... تو..... اس نے شکر ہی کیا جو مزدور اور کریٹ لے کر آ گئے۔ اشی ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور ریشم نجھی سے جان چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔

مسرور و شاداں نجھی بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔

رات بھی خوب ہی لطف رہا۔ رسم حنا خاصی دلچسپ تھی..... موسم نے اچانک ہی خوشگوار کروٹ لے لی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوائیں خوشبو سے لدی تھیں۔ بادلوں نے فضا میں

خنکی کا رچاؤ کر دیا تھا۔

ماحول رنگ و نور کا امتزاج تھا۔ رنگ برنگے لباس روشنیوں میں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ چہرے پر چڑھی میک اپ کی تھیں بھی ناگوار نہیں لگ رہی تھیں..... بہت سے لوگ تھے..... نشستیں کم ہو گئی تھیں..... چمن ہی میں سب لوگ بکھر گئے تھے۔ کوئی کھڑا تھا۔ کوئی بیٹھا..... کوئی ادھر آ رہا تھا تو کوئی ادھر جا رہا تھا..... ہنسی، مذاق، قہقہے بکھر رہے تھے۔

مہندی کے تھال لڑکیوں کی دن بھر کی محنت سے سجے تھے۔ رنگ برنگی چمکتی پینیاں تھالوں پر لگائی گئی تھیں۔ موم بتیاں روشن تھیں۔ ریشم، رابی اور فرحت..... شمع بھا بھی، نعیمہ اور ثریا کو تھال تھما دیئے گئے۔ شمع بھا بھی نے پوت کی سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بڑا سا جوڑا اور جڑاؤ زیورات تھے۔ ثریا آ پاسبز غرارہ سوٹ میں تھیں۔ بھاری سادو پیٹہ بمشکل سنبھالے تھیں۔ زیورات تو ان کے پاس بھاری تھے ہی۔ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ نعیمہ کا پاؤں بھاری تھا۔ کھلے کھلے کپڑوں میں بھولی بھالی سی لگ رہی تھی..... زرد کپڑوں کے ساتھ اس نے پرانی طرز کے بڑے بڑے جھمکے پہن رکھے تھے۔ ساتھ مالا بھی پہنی تھی۔ تینوں نے تھال اٹھالیے..... خوبصورت دھنوں والا ریکارڈ بجنے لگا اور تینوں کے قدم سرتال پر تھرکنے لگے۔ نعیمہ نے تو دو ہی چکروں کے بعد تھال صائمہ کو تھما دیا۔ شمع بھا بھی البتہ کافی دیر تک ناچتی رہیں..... لوگوں کو قہقہے لگانے کو اپنی شوخ حرکتوں کا مواد دیتی رہیں..... تھال کئی سہاگنوں کے ہاتھ میں آئے۔ موم بتیاں کئی بار گریں۔ بجھی اور جلائی گئیں..... سہاگنوں کے بعد لڑکیوں نے تھال لے لیے..... اور مختلف رمقوں کو توڑ جوڑ ناچ کو نیا انداز دے کر حاضرین کو محظوظ کیا۔ ریشم بھی تھال لے کر ناچی..... لیکن شرمائی شرمائی..... لجائی لجائی..... چمن میں اشی کی موجودگی کا احساس جو تھا..... وہ بہانے بہانے ارد گرد ہی گھوم رہا تھا۔

رات گئے ساڑھ کے ہاتھوں پر مہندی سجائی گئی..... اس کے بالوں میں تیل ڈالا گیا۔ نئی بیاہتا بایوں اور بھابیوں نے اسے خوب خوب چھیڑا۔ شمو شادی پر خاص طور پر پنڈی سے آئی تھی۔ وہ اس کے کانوں میں اپنے تجربوں کا جانے کیا کیا انڈیلتی رہی..... ساڑھ مسکراتی رہی شرماتی رہی۔

مسرور سا ہنگامہ تھا۔ لکڑی کی چوکی پر ساڑھ سادہ کپڑوں میں سر جھکائے بیٹھی



تھی..... اس کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے جن کی مہک بڑی پیاری لگ رہی تھی ہاتھوں پر مہندی تھوپی گئی تھی۔ تھوپی جا رہی تھی..... شوکی اور اظہر بھی عورتوں میں گھس آئے تھے۔ سائرہ کے ہاتھوں پر وہ بھی مہندی لگا رہے تھے۔ کوئی ان کے سر پر تھپڑ لگا رہا تھا۔ کوئی عورتوں میں گھس بیٹھنے پر دھکے دے رہے تھے۔ وہ بھی پکے ڈھیٹ تھے۔ خوب خوب جواب دے رہے تھے اور قفل کرتے قہقہے برس رہے تھے۔

ایسے میں کہیں سے مرانیں آئیں۔ ڈھولک کے ساتھ بابل کے گیت گانا شروع کر دیئے۔ بابل کی لاڈلی۔ بھائیوں کی پیاری آج وداع ہو رہی تھی۔ پرانے ناطے توڑ کرنے رشتے جوڑ رہی تھی۔ بابل کا گھر چھوڑنے کی تڑپ اور جیون ساتھی کے دوارے کی لگن تھی..... ایسے اداس گیت تھے کہ قہقہے تھم گئے..... آنکھیں نم ہو گئیں۔ سائرہ کی تو روتے روتے گھٹی بندھ گئی..... مجبوریہ بیگم دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے دور ہٹ گئیں..... اور روتی ہوئی ریشم کو شمو نے بازوؤں میں بھر لیا۔

ان لمحوں میں ابا کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی گئی..... بڑا رقت انگیز منظر تھا..... ریشم اور سائرہ تو یوں رو رہی تھیں جیسے ابا کے چھڑنے کی بد قسمتی کا پہلی بار احساس ہوا ہو۔

مہمان چلے گئے..... کچھ عورتوں نے یہیں رہنا تھا..... رات آنکھوں ہی میں گزر گئی..... بڑی بوڑھیاں برابر برابر لیئے زمانوں پرانی یادیں دہرانے لگیں۔ جن لوگوں میں میناروں والی کوٹھی میں ہونے والی تقریبات آنکھوں دیکھی تھیں۔ وہ پارینہ قصے دوسروں کو سنانے لگیں۔

خالد، اشی، شوکی اور راحت وغیرہ رات بھر جاگتے رہے۔ بارات کے لیے چمن سجایا۔ عورتوں کے لیے الگ جگہ بنائی۔ میز نکائے۔ کراکری صاف کرائی..... پچھلے حصے میں جہاں کھانا پکنا شروع ہو گیا تھا..... نگرانی کرتے رہے۔

بارات کا دن بھی خوب گزرا۔ ریشم کو سائرہ کے سسرال والے کچھ خاص پسند نہ تھے۔ نہ ہی وہ سائرہ کی شادی ایسی جگہ ہونے کی قائل تھی لیکن متوسط طبقے کے یہ لوگ خاصے سلجھے ہوئے تھے۔ ریشم کو بارات میں آنے والے لوگوں سے مایوسی نہیں ہوئی..... اور تسنیم

نے تو اسے خاصا مرعوب کیا..... سائرہ اور تسنیم کی جوڑی بے جوڑ نہ لگی۔

باراتیوں کی خاطر مدارت اس طرح کی گئی..... کہ خاندان کے لوگ تعریف کئے بغیر نہ رہے..... کسی کو محسوس نہ ہونے دیا گیا کہ یتیم بچی کی شادی ہے..... کسی پر ظاہر نہ ہوا کہ اس سارے پر شوکت مظاہرے میں خالد نے کوئی مالی سہارا نہیں دیا۔

سارا کام بخیر و خوبی نیٹ گیا۔ باراتی بھی مسرور تھے اور خاندان والے بھی..... ہر کوئی واہ واہ کر رہا تھا۔ جہیز بھی معقول تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ تعداد میں بہت زیادہ نہ سہی۔ پھر بھی صاف ستھری چیزیں تھیں۔ دولہا والے بھی مناسب مناسب سی بری لائے تھے۔ جوڑے زیادہ نہیں تھے لیکن جتنے بھی تھے، بنانے والے کے ذوق کی علامت تھے۔ زیور کے ہلکے پھلکے سیٹ تھے۔ ریشم اور سائرہ کی توقع سے کچھ زیادہ ہی تھا، کم نہیں۔ سفید پوشی کا بھرم ان لوگوں نے بھی خوب نبھایا تھا۔

رخسختی کے وقت پھر وہی رقت انگیز نظارہ تھا۔

”کوئی نہیں رونا دھونا“، شمع بھا بھی نے سائرہ کا چہرہ دونوں ہاتھ میں تھام کر پیار سے کہا۔ ”سارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔“

”اسی لیے تو زیادہ میک اپ کیا ہی نہیں۔“ سائرہ کی سہیلی فرحت بولی۔

”بس اتنا ہی کافی ہے۔“ رابی بولی۔ ”چندے آفتاب چندے مہتاب ہے۔“

”بہت پیاری لگ رہی ہے ماشاء اللہ۔“ ثریا آ پا بولی۔ ”واقعی رونا دھونا نہیں.....“

پرانی رسمیں ہیں سب.....“

سب سائرہ کے گرد گھیرا ڈالے تھیں..... سرخ عروسی جوڑے اور طلائی زیوروں میں سائرہ کا صبیح چہرہ چمک رہا تھا..... سب کے بہلاوے میں آ رہی تھی۔ رونا دھونا واقعی فضول سی بات تھی۔ بہت جی کڑا کر لیا تھا۔

لیکن

جب وداع ہونے لگی۔ خالد نے گلے لگایا اور امی نے سر پر ہاتھ پھیرا تو بہلاوے دلا سے جانے کہاں گئے۔ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا..... ریشم اور وہ تو یوں لپٹ گئیں جیسے ایک دوسرے کو چھوڑیں گی نہیں۔ چچا،

پھوپھیاں، خالائیں، ممانیاں سبھی کے آنسو بہہ نکلے تھے لیکن اتنا رونا دھونا بھی اچھا نہیں تھا۔ حمیدہ چچی محمودہ بیگم کو ایک طرف لے جا کر دلاسہ دینے لگیں۔ آسیہ پھوپھی نے ریشم کو سینے سے لگا کر تسلی دی۔

سارہ بابل کے دوارے سے پھوٹ پھوٹ کر روتی جدا ہو گئی۔ خدا جانے کس بات کو رو رہی تھی۔ یہ گھر چھوڑنے کا غم تھا یا ان حالات کو رو رہی تھی جو اہل خانہ کو پونجی ختم ہونے پر پیش آنے تھے۔ بہر حال حساس دل میں درد کی لہریں لیے وہ رخصت ہو گئی۔ اس کی نیک نصیبی اور ازدواجی زندگی کی مسرتوں کی دعائیں کرتے مہمان بھی جانا شروع ہو گئے۔ محمودہ بیگم آنسوؤں بھری مسکراہٹ بکھیرے انہیں رخصت کرنے لگیں۔ ریشم کو خچھی اور زریں وغیرہ اندر لے گئیں۔ جتنا وہ چپ کراتیں اس کے آنسو بہے جا رہے تھے۔

وہ روتی رہی۔۔۔۔۔ رونے سے اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں اور بھی حسین لگنے لگیں۔ گال سرخ انگارہ ہو گئے۔۔۔۔۔ اور بار بار ناک رگڑنے سے کوئل سے نتھنے گہرے گلابی نظر آنے لگے۔

زریں کے کسی کام سے باہر جانے پر خچھی نے چپ کرانے کا دوسرا طریقہ استعمال کیا۔ اسے جھپٹنے ستانے لگی۔

”بھائی جان کو بلاؤں۔۔۔۔۔ ہائے ریشم اللہ قسم اس اور نخ غرارے میں تو تو آج قیامت بنی تھی۔ پتہ نہیں میرے بھیا بیچارے کے دل کا کیا ہوگا۔۔۔۔۔ بیچارے بھائی جان آج اتنے اداس ہو رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے، آج تو گھر واپس جانا ہی پڑے گا۔ بھئی چپ بھی ہو جاؤ اب۔ نہیں تو میں بلاتی ہوں بھائی جان کو۔ بھائی جان بھی آج کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ دیکھا تھا انہیں نہیں دیکھا تو بلاؤں۔“

وہ بلانے تو خیر نہیں گئی۔ شمو اور اشی اچانک ہی ادھر آ گئے۔

”ہائے اللہ۔ یہ اب تک رو رہی ہے۔“ شمو نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے پٹالیا۔ ریشم نے اس کے سینے میں منہ چھپالیا۔

اشی دل گرفتہ سا تو تھا لیکن ہنس کر بولا۔ ”کوئی رونے کا سبب بھی تو پوچھے۔۔۔۔۔“

”میں تو تھک گئی۔۔۔۔۔ پاگلوں کی طرح روئے جا رہی ہے۔“ خچھی نے کہا۔  
”اور کیا کرے۔“ اشی نے مسکرا کر کہا۔

”بھئی اس کے رونے کا مطلب یہ ہے۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔“ اشی چبا چبا کر بولا۔ ”سارہ چلی گئی، میں رہ گئی۔ اللہ جانے میری باری کب آئے گی۔“

شمو اور خچھی ہنس پڑیں۔۔۔۔۔ ریشم کسمائی لیکن اسی انداز میں بیٹھی رہی۔  
”نہ روؤ ریشم نہ روؤ۔۔۔۔۔“ اشی جیسے بچی کو بہلانے لگا۔۔۔۔۔ ”بہت جلد تمہیں بھی لے جاؤں گا۔۔۔۔۔ خدا قسم یہ گھر والے ظالم ہیں۔ امتحان کی ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ۔۔۔۔۔ رونا آتا ہے۔“ وہ رونی آواز بنا کر جانے ابھی کچھ اور بھی کہتا۔۔۔۔۔ کہ کچھ عورتیں اندر آ گئیں۔ وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ شمو اور خچھی بھی ہنسی ہونٹوں میں دبائے ریشم کو پیار کرنے لگیں۔

ریشم کو بھی اشی کی باتوں پر ہنسی آرہی تھی۔

-----○-----

ننگے آسمان پر سورج بڑے جلال سے چمک رہا تھا۔ رت بدل چکی تھی لیکن دو پہر اب بھی خاصی گرم تھی۔ گھر کے اندر تو خیر فضا خوشگوار تھی لیکن باہر پیش اچھی خاصی محسوس ہوتی تھی۔

ریشم ایمپلائمنٹ ایجنسی کے دفتر سے باہر نکلی تو جھنجھلائی ہوئی تھی۔ چہرے کی معصوم دکاشی ایک مضحکہ خیز شکل سے دب گئی تھی۔ آنکھوں میں سہمی ہوئی سوچ تھی۔ غصے کا ہلکا سا غیر محسوس سا دباؤ تھا جو جھنجھلاہٹ بن رہا تھا۔ معاشی نا انصافیوں پر اس کے انقلابی خیالات میں طوفانی بہاؤ آرہا تھا۔

کاغذات کو اچھی طرح چیک کئے بغیر بیگ میں ٹھونس کر اس نے دوپٹہ ٹھیک اوڑھا اور فٹ پاتھ پر آ کر کھڑی ہو گئی..... کوئی ٹیکسی، رکشایا تاکہ نظر نہیں آ رہا تھا اور انتظار کوفت کے لمحوں میں مزید اضافہ تھا۔ پھر بھی اسے کھڑا ہونا ہی تھا۔ اتنی دور پیدل تو جانے سے رہی۔

ملازمت کی تلاش نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ کئی سکولوں، کئی دفاتروں سے رسائی ہوئی تھی لیکن ملازمت کے وعدے کے سوا کچھ نہ ملا۔ سکولوں میں ٹرینڈ ٹیچر کی مانگ تھی اور دفاتروں میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ جاننے والوں کی ضرورت اور پھر بات صرف یہی ہوتی تو کچھ بات نہ تھی۔ ریشم نے معمولی سے معمولی ملازمت کے متعلق بھی یہی تجربہ کیا تھا کہ پیسے بغیر کام نہیں ہونے کا۔ یا تو اس کے لیے بڑی بڑی سفارش ہو یا پھر رشوت..... اور یہ دونوں کام ہی مشکل تھے۔ سفارش تو مسئلہ نہ تھی۔ ریشم کے کئی عزیز اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ سرکاری مشینری کے کئی اہم کل پرزے تھے۔ جاننے والے بھی اتنے تھے کہ چھوٹی موٹی ملازمت کا حصول ناممکن نہیں تھا۔

لیکن بات وہی بھرم کی تھی۔ انا کی تھی۔ وقار کی تھی۔ محمودہ بیگم اس بات پر رضامند نہ ہوتی تھیں کہ کسی کے سامنے ملازمت کا ذکر بھی کیا جائے۔ ان کا بس چلتا تو ریشم کی تلاش ملازمت پر بھی پابندی لگا دیتیں لیکن ریشم حالات کی تلخی کو یوں نگل نہ سکتی تھی۔ اپنے طور پر نوکری ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھی۔ خالد کے بمشکل سو روپے بھیجنے سے تو ماں بیٹی کا گزارا ہونے سے رہا۔ کنبہ قبیلے میں بیٹھی تھیں۔ کہیں آنا جانا بھی تھا۔ خوشی غمی میں بھی شرکت کرنی پڑتی۔ مہمان بھی آتے جاتے۔ سارہ کے سسرال والوں سے بھی رشتہ داری نبھانا پڑتی۔ پھر یہ سب کہاں سے ہو پاتا۔

ریشم کا بس چلتا تو خالد سے سو روپیہ بھی منگوانا بند کر دیتی۔ اس سو روپے کے لیے خالد اور سلیمہ میں جوتو تو میس ہوئی تھی، اس کو جانتی تھی۔

خالد یہ پیسے مستقلاً بھیجنا چاہتا تھا اور سلیمہ مالی تنگی کا رونا رونے لگتی تھی۔ پچھلے دنوں دونوں آئے ہوئے تھے اور اٹھتے بیٹھتے ریشم کئی مرتبہ اس موضوع پر ان کی بحث سن چکی تھی۔ ایک دو دفعہ تو اچھی خاصی لڑائی بھی ہو چکی تھی۔

ریشم کو سخت کوفت ہوتی۔ مجبوری تھی..... اور اسی لیے وہ جلد از جلد کوئی ملازمت پانا چاہتی تھی۔ جہاں جہاں ضرورت ہوتی، وہ اپنی درخواست لے کر پہنچتی اور مایوسی کا بار لے کر پلٹ آتی۔

اپنی ان کوششوں میں ابھی تک اس نے کسی کو بھی شریک نہیں کیا تھا۔ اشی اور اس کے گھر والوں کو تو خیر کسے بتانا تھا، اس نے تو سارہ اور تسنیم سے بھی کھل کر ذکر نہیں کیا تھا۔

سارہ نے دو ایک دفعہ اس کے بیگ میں سے کاغذ نکال کر دیکھے تھے۔ اس کا دل بڑا دکھا تھا لیکن وہ ماں کی طرح جذباتی نہیں تھی کہ جہاں ریشم نے نوکری کا نام لیا، ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے..... ہاں اس نے تسنیم سے کہہ کر نوکری کا بندوبست کرنے میں پیشکش ضرور کی۔

”بری بات ہے باجی۔ نئی نئی تو آپ ان لوگوں میں گئی ہیں۔ کیا سوچیں گے وہ..... میں خود ہی کوشش کر رہی ہوں۔ مل ہی جائے گی کہیں نہ کہیں۔ آپ تسنیم بھائی سے فی الحال کچھ نہ کہئے گا.....“

ریشم نے سائرہ کی پیشکش ملائمت سے رد کر دی تھی اور الہڑ..... لا پروا اور بے دھڑک اوٹ پٹانگ کہہ دینے والی ریشم کے منہ سے ایسی ٹھہری ہوئی باتیں سن کر سائرہ افسردگی سے مسکرا دی تھی۔

فٹ پاتھ پر کھڑے کئی منٹ گزر گئے۔ گاڑیاں زن سے گزر جاتیں۔ رکشا ایک بھی خالی نہ گیا..... تانگے کا تو خیر اس سڑک پر سوال ہی نہ تھا..... ٹیکسی ایک آدھ گزری بھی تو رک نہیں.....

تھک ہار کر ریشم بدلی سے فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ یوں کھڑے رہنا ٹھیک نہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ جوان جوان لڑکے خواہ مخواہ ہی فٹ پاتھوں پر آکھڑے ہوئے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے ان کی نگاہیں اس کے سراپا پر بڑی بے باکی سے پڑ رہی تھیں۔ سکوڑ والے ایک نو جوان کو بھی اس نے تیسری مرتبہ سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ اسی کے لیے ادھر چکر لگا رہا تھا۔

سڑک کے ارد گرد دکانیں ہوتیں تو بھیڑ بھاڑ ہوتی..... لیکن یہاں تو سڑک دونوں طرف سے تقریباً سنان تھی۔

سر جھکائے ریشم متوازن قدموں سے چلتی گئی۔

ایک بڑی سی گاڑی تیزی سے قریب سے گزری..... اور ایک جھٹکے سے کچھ ہی دور جا کر رک گئی..... چر..... چیں..... کی آواز پر ریشم نے گردن قدرے موڑ کر دیکھا۔ گاڑی پیچھے کی طرف لوٹائی جا رہی تھی۔

ریشم ابھی تجسس سے دیکھ رہی تھی کہ گاڑی اس کے قریب آ کر رکی۔

”ہیلو“ شہزاد مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوہ..... آپ۔“ ریشم نے چہرے پر بشارت کے آثار لاتے ہوئے کہا۔

”کہاں جا رہی ہیں؟“

”گھر.....“

”آئیے..... میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“

”جی..... جی شکریہ..... میں چلی جاؤں گی۔“

”بڑا تکلف کرتی ہیں آپ..... آئیے.....“

اس نے ہاتھ بڑھا کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا..... ریشم ہچکچائی۔ اس نے انکار کیا..... تو شہزاد کسی قدر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”کمال کرتی ہیں آپ۔ کھا تو نہیں جاؤں گا آپ کو۔ دوپہر کا وقت اور پیدل چل جا رہی ہیں.....“

”کوئی رکشا، ٹیکسی ملا ہی نہیں.....“ ریشم جلدی سے بولی۔

”آئیے.....“ شہزاد نے تیز آواز میں کہا۔

تینوں چاروں نو جوان جو بہانے بہانے اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر رک گئے..... ریشم کی نظر ان پر پڑی..... بہتر یہی سمجھا کہ شہزاد کے ساتھ چلی جائے۔

”کیا سوچ رہی ہیں۔ آئیے بھی۔“ شہزاد کو اس کی ہچکچاہٹ پر قدرے تاؤ آ گیا۔ ریشم کو ہنسی آ گئی۔ کتنی اپنائیت سے وہ غصہ کر رہا تھا۔

مسکراتے ہوئے وہ آگے بڑھی..... اور سمٹ کر سیٹ میں دھنس گئی..... دروازہ بند کرتے ہوئے وہ اس طرف اور کھسک گئی..... محتاط انداز اچھا تھا۔

شہزاد نے گاڑی چلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا..... ”دروازہ لاک کر دیں..... کہیں گر نہ جائیے گا.....“

ریشم نے دروازہ لاک کر دیا۔

”ادھر کس کے ہاں گئی تھیں.....“ اس نے پوچھا۔

”ایمپلائمنٹ ایجنسی.....“ ریشم کے منہ سے نکل گیا۔

”کیوں؟“ شہزاد نے حیرانگی سے دیکھا۔

ریشم چند لمحے چپ رہی، پھر کچھ سوچا اور بولی۔ ”ملازمت ڈھونڈ رہی ہوں۔“

”آپ؟“

”جی ہاں۔“

”وہ کیوں؟“

”ضرورت ہے۔“

”لگتا تو نہیں.....“

”چہرے پر تو لکھا نہیں ہوتا.....“

”ہوتا ہے.....“

”پھر ایک ہی بات ہے کہ آپ پڑھ نہیں سکتے.....“

ریشم جھنجھلاہٹ میں کہہ گئی۔ شہزاد کو ریشم کے حالات کا علم نہیں تھا۔ اس نے تو اسے جتنی بار بھی دیکھا، زریں کے ہاں دیکھا تھا۔ ہمیشہ الہڑ انداز سے ہنستے مسکراتے۔ لیکن آج ریشم کا نیاروپ سامنے تھا۔ اس لیے کرید اور تجسس فطری تھا۔

ایئر کنڈیشنڈ گاڑی ڈھلان پر بہنے والے پانی کی سی روانی سے چلی جا رہی تھی۔ شہزاد نے پوری ہمدردی سے اسے کریدا۔ جانے وہ بھی کس موڈ میں تھی۔ شہزاد نے بار بار پوچھا تو اس نے بھی کھل کر ملازمت کی ضرورت اور اہمیت کا بتا دیا۔ حرج بھی کیا تھا، چھپانے کی ضرورت بھی کون سی تھی۔ ملازمت عیب تھی نہ جرم اور حالات بھی تو اب بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

ریشم رک رک کر بتا رہی تھی۔ لاشعوری طور پر شہزاد سے اس سلسلے میں امداد کی توقع تھی۔ شاید کہیں وہ اس کا کام بنادے.....

شہزاد کو ساری روئیدار دن کردھ ہوا اتنے باوقار خاندان کی بیٹی کو حالات نے اس موڑ پر لاکھڑا کیا تھا کہ وہ چھوٹی سی ملازمت کے حصول کے لیے دن رات سرگرداں تھی۔ وہ گم صم گاڑی چلاتا رہا..... سوچتا رہا..... ذہن میں کوئی تجویز آئی۔ ریشم کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہا لیکن کہا نہیں۔

”سلکو والوں کو آپ جانتے ہیں۔“ ریشم نے کئی لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔

”کون.....“

”سلکو..... کپڑے والے۔“

”اچھا اچھا۔ سلکو۔ ہاں، کیا بات ہے؟“

”ان کے دفتر میں ایک جگہ.....“

”نہیں نہیں..... وہاں آپ نہیں جائیں..... وہ جگہ آپ کے لائق نہیں۔“ شہزاد

جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ریشم ہنس پڑی..... اس کے خوبصورت دانت گلابی گلابی ہونٹوں کی گرفت سے بے قابو ہو گئے۔ شہزاد نے ایک نگاہ غلط انداز سے اس پر ڈالی۔

”ہنس کیوں دیں؟“

”آپ نے بات ہی ایسی کی شہزاد صاحب۔ ملازمت کرنا ہے۔ جگہ میرے لائق ہونہ ہو۔“

”یہ بات نہیں ریشم..... میرا مطلب ہے وہ لوگ اچھے نہیں..... شریف لڑکی ہیں آپ۔“

ریشم چپ ہو گئی۔

شہزاد چند لمحے گوشہ چشم سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے بولا۔

”ریشم.....“

”جی۔“

”مجھے آپ کے حالات جان کر دکھ ہوا ہے۔ اگر میں آپ کی کچھ مدد کرنا چاہوں تو؟“

”جی.....“

”میرا مطلب ہے۔ میں آپ کو ملازمت دلادوں۔“

”آپ؟“

”ہاں۔“

ریشم قدرے آگے کو جھک گئی۔ آنکھوں میں روشنی چمکی اور چہرے پر خوشگوار سائے لہرانے لگے۔

”آپ دلادیں گے ملازمت۔“

”ہاں۔“

”کس قسم کی؟“

”مناسب سی۔“

”کوشش کر دیکھئے۔“

”یوں کریں آپ کل میرے آفس آجائیں۔“

”آپ کا آفس کہاں ہے؟“

شہزاد نے دائیں ہاتھ سے شیئرنگ تھا مے رکھا اور بائیں ہاتھ سے سامنے والے چھوٹے خانے میں کاغذات پلٹ کر ایک کارڈ نکالا..... ”یہ لیں۔“ ریشم کارڈ پڑھنے لگی اور شہزاد اسے اپنے دفتر کا محل وقوع بتانے لگا۔

گاڑی چوک میں روکنا پڑی۔ چوک کی سرخ بتی رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔  
”آپ کل دس بجے کے قریب آجائیے گا۔“ شہزاد نے رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”ضرور..... ضرور۔“ ریشم خوش نظر آنے لگی..... ”خدا کرے کچھ کام بن جائے۔“  
”بن جائے گا۔“ شہزاد نے اعتماد سے کہا..... ”نہ بنا جب بھی بنا دیا جائے گا۔“  
”شکر یہ شہزاد صاحب۔“ وہ مسکرائی۔ شہزاد بھی مسکرانے لگا۔

ریڈ لائٹ کے بعد گرین لائٹ ہوئی۔ گاڑیاں ریگنے لگیں۔ ٹریفک زیادہ ہونے کے باوجود شہزاد گاڑی نکال کر لے گیا۔

اور

ریشم نہ شہزاد..... کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ چند گز کے فاصلے پر ٹریفک کے ہجوم میں اشی اپنے سکوتر پر بیٹھا انہیں دیکھ کر حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ ششدر، حیرت زدہ اور پریشان وہ تیزی سے جاتی گاڑی کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

-----○-----

کوئل سی لڑکی کے کندھوں پر حالات کا ایسا گراں بار تھا۔ چند سو روپے کی ملازمت کے حصول کے لیے وہ اتنی سرگرداں تھی۔ شہزاد کو دولت کی غیر مسادی تقسیم کا پہلی بار اتنی شدت سے احساس ہوا۔ ایک اس کا اپنا طبقہ تھا جہاں سینکڑوں تو کیا ہزاروں، لاکھوں، پل بھر میں اڑا دینا کوئی بڑی بات ہی نہ تھی۔ سودو زیاں کا احساس ہی نہ تھا..... سامانِ تعیش، تفریحی دورے، پارٹیاں..... کلب، جم خانہ، شراب..... ہزاروں کا اصراف تھا۔ زندگی ان کے بغیر بھی گزر سکتی تھی۔ وہ اپنا موازنہ ریشم سے کر رہا تھا۔ پانچ سات سو کی ملازمت اس کی خوشیوں میں بے بہا اضافہ کر سکتی تھی۔ اتنی حقیر رقم سے اس کے ذہن سے کوفت کے بادل چھٹ سکتے تھے۔ اس کے چہرے کی رعنائیاں لوٹ سکتی تھی۔ اس کا حال محفوظ ہو سکتا تھا۔ اس کا وقار قائم رہ سکتا تھا۔

اپنے خوبصورت بیڈروم میں وہ بے چین سا بیٹھا تھا۔ کتنے ہی سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ کبھی کرسی میں پھیل جاتا..... ریشم کی پریشانی اس کے اعصاب پر مسلط تھی۔ آج وہ دانستہ کلب بھی نہیں گیا تھا۔ بڑا شاندار فنکشن تھا لیکن وہ وہاں نہیں گیا تھا..... سوچ اس کے ذہن میں متلاطم تھی۔ وہ ریشم کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔

کرنا تو اتنا کچھ چاہتا تھا..... اتنا کچھ..... کہ جس کی حد تھی نہ حساب لیکن ریشم کوئی گری پڑی لڑکی نہ تھی۔ ایک اچھے اور باوقار خاندان کی بیٹی تھی۔ حالات نے جن حالات سے دوچار کر دیا تھا، ضرورت بے شک اہمیت اختیار کر رہی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ وقار اور عزت نفس کو داؤ پر لگا دے گی۔ شہزاد کو احساس تھا کہ اونچے خاندانوں کے ایسے لوگ اپنی عزت اور بھرم کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتے ہیں۔

زریں ان دنوں سوات گئی ہوئی تھی ورنہ وہ ریشم کے بارے میں ضرور اس سے



مشورہ کرتا۔ اب اسے خود ہی فیصلہ کرنا تھا۔ ریشم کی ملازمت کا بندوبست کرنا تھا۔ کل وہ آفس آ رہی تھی۔

وہ کرسی گھما کر میز کے قریب لے آیا۔ ماربل کا ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ اس نے بہت سے کاغذات میز پر پھیلا دیئے اور پھر ان پر جھک کر اطمینان سے دیکھنے لگا۔ گھنٹے بھر کے تردد کے بعد وہ کرسی کی پشت سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے سائے لہرانے لگے۔ نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ سوچ کو تکمیلی رنگ دینے لگا۔

ریشم کے لیے آبرومندانہ کام اس نے طے کر لیا تھا۔ وہ اسے اپنے آفس میں ہی ملازم رکھنا چاہتا تھا۔ پندرہ بیس آدمیوں میں اضافے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن ریشم کے لیے اس نے جگہ بنائی تھی۔ آفس میں تین لڑکیاں پہلے ہی ملازم تھیں۔ اس لیے ریشم کے لیے یہ پیش کش اچنبھے کا باعث بھی نہ بنے گی۔

تنخواہ کا بھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ مس بشیر، رخسانہ اور مسز عاطف کے برابر ہی تنخواہ کافی تھی۔ دل تو ہزاروں ریشم کے قدموں میں ڈال دینے کا متمنی تھا لیکن وہ اس کے وقار کو بھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ نہ ہی اعتماد کی کرچیاں کرنے کا حامی تھا۔

ہر پہلو بڑے آرام سے جانچنے، پرکھنے اور سوچنے کے بعد وہ مطمئن ہو کر کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ خوشی کی سکون بخش لہر اسے اپنے رگ و پے میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

وہ کرسی سے اٹھا اور بستر پر آ گیا۔ تکیہ چھاتی تلے دبائے وہ اوندھا لینا اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے لگا۔

کیا ریشم کے لیے اس نے یہ سب کچھ ازراہ اخلاقی ہمدردی کیا تھا۔

یا

یا

وہ مسکراتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ تکیہ پر بے پھینک کر وہ اٹھ بیٹھا۔ انگلیاں بالوں میں ڈالے وہ ہتھیلیوں پر سر گرائے اپنی سوچوں پر آپ ہی مسکراتا رہا۔

اس کی زندگی میں عجیب سی تبدیلی آ رہی تھی۔ یہ پہلی لڑکی تھی جس کے متعلق وہ اس انداز سے سوچ رہا تھا۔ اس کے احساس کا اتنا خیال رکھ رہا ہے۔ اس کے حالات کی

تلمیحوں کا دکھ سینے میں اتار رہا تھا۔

صبح وہ وقت پر دفتر پہنچا۔ ہر لمحہ انتظار بنا تھا۔

دس بجے کے قریب ریشم آ گئی..... ایسا عالیشان دفتر دیکھ کر وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں پر امید ہو گئی تھی۔

ملازم نے شہزاد کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔

”انہیں یہیں لے آؤ۔“ شہزاد کہتے ہوئے فائلیں کھولنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد ریشم ملازم کے ہمراہ اندر آ گئی۔ اس نے سفید سادہ سا لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں کاغذات والا بیگ تھا۔

شہزاد نے نگاہ اس پر ڈالی۔ ہلکی سی مسکراہٹ سے اسے خوش آمدید کہا۔

ریشم نے قدرے سر جھکاتے ہوئے تعظیم دی۔

”بیٹھئے۔“ اس نے فائلوں پر نظریں جماتے ہوئے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

ریشم فوم کی خوبصورت کالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

کئی لمحے وہ فائلوں میں الجھنے کی نمائش کرتا رہا اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار مقصود نہ تھا۔

ریشم نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ لکڑی کی چمکتی دیواریں،

خوبصورت فرنیچر..... قیمتی ساز و سامان..... ٹیلی فون، آٹو بینک کھنٹی..... شیشے کی بڑی

میز..... اور اس پر پھیلے ہوئے کاغذات اس نے ایک بار نہیں کئی بار دیکھے۔

”ہوں.....“ شہزاد نے کئی لمحوں کے بعد کاغذات سمیٹتے ہوئے اس کی طرف

دیکھا..... ”تو آپ آ گئیں؟“

”جی۔“

”پکا پکا ارادہ ہے ملازمت کرنے کا؟“

”بالکل.....“

ریشم نے شہزاد کی طرف دیکھا۔ اس نے بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا۔ بڑا باوقار

نظر آ رہا تھا..... چہرے پر عامیانہ پن نہیں تھا۔ ہلکی ہلکی سنجیدگی کی تہہ اس کے مردانہ پن میں خوبصورت اضافہ تھی۔

کچھ دیر دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ریشم کوئی جھجک محسوس کر رہی تھی نہ شہزاد..... عام سی باتیں تھیں۔

اور پھر باتیں ملازمت کے متعلق ہونے لگیں۔ چند تمہیدی جملے کہنے کے بعد وہ بولا۔ ”میں نے اپنے آفس میں آپ کے لیے جگہ نکالی ہے۔“

ریشم کا دل جیسے تھم جانے کو تھا..... شاید رنگ بھی متغیر ہو گیا۔ آ رہا ہو جانے والی نظروں سے شہزاد کی آنکھوں میں دیکھا۔ کانوں میں زریں کی ساری باتیں جو اس نے مختلف موقعوں پر شہزاد کے متعلق کہی تھیں، جھنجھناہٹ بن کر اترنے لگیں۔

وہ کوئی تلخ و ترش جملہ کہنے کو ہی تھی کہ وہ بولا۔ ”مس بشیر، مس رخسانہ اور مسز عاطف پہلے ہی یہاں کام کر رہی ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کو منسلک کر دیا جائے گا۔ میں نے بمشکل یہ جاب نکالی ہے۔ تنخواہ اور دیگر باتیں آپ کو میری سیکرٹری بتا دیں گی..... یہ ملازمت آپ کو قبول کرنا پڑے گی..... اس لیے کہ مجھے پرائیویٹ فرموں اور دیگر ایسے اداروں کی کارکردگی کا آپ سے کہیں زیادہ تجربہ اور علم ہے..... آپ کے لیے کہیں اور بھگتنا قطعاً مناسب نہیں ہوگا.....“

وہ کچھ ایسے متین اور سنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا کہ ریشم کو اس پر کسی خاندانی بزرگ کا گمان ہونے لگا..... تھوڑی دیر پہلے جو اس کی پیشکش پر خون میں ابال آیا تھا، وہ بیٹھنے لگا۔

”کیا خیال ہے؟“ اسے کئی لمحے چپ دیکھ کر شہزاد نے پوچھا۔

ریشم نے سر اٹھایا..... اس کی طرف دیکھا..... انکار کر سکی نہ اقرار، صرف دیکھتی رہی۔

”ریشم اگر ملازمت کرنے پر آپ مجبور ہی ہیں تو یہی ملازمت آپ کو کرنا ہوگی..... کسی اور پرائیویٹ ادارے میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ ہاں کسی سکول وغیرہ میں جگہ نکل آئے تو بے شک یہ ملازمت چھوڑ دیجئے گا..... میں خود بھی کوشش کروں گا کہ کوئی ایسی جگہ مل جائے.....“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ریشم کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ شہزاد کے کردار کا انوکھا پہلو اس کے سامنے تھا..... انسانیت اور خلوص کو رد کر دینا تو انسانیت کا شاید بدترین فعل تھا۔

اسے تذبذب میں دیکھ کر شہزاد نے قدرے سختی سے کہا۔ ”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”جی..... کچھ نہیں.....“

”آئیے میں آپ کو اپنی سیکرٹری سے ملوادوں..... میں نے ادھر تھوڑا سا کام بھی کرنا ہے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بلاتال بولی۔ ”شہزاد صاحب..... میں اپنی امی سے مشورہ کر لوں۔“

شہزاد نے ایک مجروح نگاہ اس پر ڈالی۔ آہستگی سے بولا۔ ”ضرور کر لیجئے لیکن ایک نصیحت یاد رکھئے گا۔ کسی انجانی فرم، ادارے یا کارخانے میں نوکری کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا.....“

ریشم سر جھکائے اپنے بیگ کو ناخنوں سے کھرچنے لگی۔ امی سے زیادہ اسے اس وقت اشی کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اس شخص سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہاں ملازمت کرنا اسے کسی طرح نہ بھائے گا۔

”آپ کا تجربہ صفر ہے مس ریشم۔ زمانے کے تیور آپ نہیں سمجھتیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

ریشم کا جی چاہا کہ کہہ دے ”آپ کون سے شریف ہیں۔“ لیکن الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل سکے۔ اسے اس وقت ایسا سوچنا بھی برا لگا۔ شہزاد مرقع شرافت نظر آ رہا تھا..... وہ کچھ نہ بولی..... شہزاد اسے ملازمت سے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے لگا۔ کچھ باتیں کھل کر کہیں، کچھ اشاروں کنایوں میں۔ ریشم گھبرا گھبرا گئی۔ ملازمت کے جنون میں ایسی باتیں سوچنے کی اسے ضرورت ہی کب تھی۔

وہ باتیں کرتا رہا اور ریشم سر جھکائے کھڑی سوچتی رہی۔ اس کے ذہن میں ساری باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں..... تذبذب کے عالم میں تھی۔ اشی کا خیال آ رہا تھا۔ مالی حالات

مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ ملازمت کی ضرورت اور اہمیت امنٹ حقیقت کی طرح سامنے تھی۔ سامنے حالات جن کا صحیح نقشہ شہزاد نے کھینچا تھا، وہ بھی درگزر نہ کئے جاسکتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے دونوں ریٹائرنگ روم میں آ گئے۔ شہزاد نے ملازم سے چائے لانے کو کہا۔

”آپ کو ملازمت کی تلاش تھی یا ایسے ہی شغل کہہ رہی تھیں۔“ شہزاد نے چائے کے دوران پوچھا۔  
ریشم پھیکسی مسکراہٹ لبوں پر لے آئی..... ”ملازمت میری ضرورت ہے۔“  
”تو پھر کس سوچ میں ہیں.....“  
”جی؟“

”شہزاد پیالی میز پر رکھ کر صوفے کی پشت سے کمر لگاتے ہوئے گہری گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر آہستگی سے بولا۔“ شاید میرے پاس ملازمت کرنے میں آپ سبکی محسوس کرتی ہیں۔

”جی..... نہیں شہزاد صاحب ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گھبرا کر جلدی سے بولی۔  
شہزاد سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔  
وہ پھر بولی۔ ”ملازمت ہی کرنا ہے تو غیروں سے آپ بہتر..... آپ مجھے جانتے ہیں، میں آپ لوگوں کو یقیناً یہاں زیادہ محفوظ بھی رہ سکتی ہوں۔“  
”تو پھر۔“

”پھر؟“  
وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔ ”امی سے مشورہ کر لوں۔“  
”بہتر۔ کہیں تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کر دوں..... کہ محترمہ کو کسی ایرے غیرے کے پاس ملازمت کے لیے نہ بھیجیں۔“  
ریشم مسکرائے لگی۔

وہ دونوں کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے۔ شہزاد کا انداز تکلم اتنا محتاط اور اتنا مہذب تھا کہ ریشم نے ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا..... وہ اس کی باتوں سے چھلکنے والی شریفانہ

اپنائیت سے بھی مرعوب تھی۔

فیصلہ یہی ہوا کہ فیصلہ امی پر چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے دن صورتحال سے مطلع کرنے کا وعدہ کر کے ریشم واپس آ گئی۔  
امی نے تو فیصلہ کیا کرنا تھا، ریشم فراغت سے سوچنا چاہتی تھی..... اشی کا خیال بار بار آ رہا تھا.....

وہ ساری رات یہی سوچتی رہی..... اشی ایک مستقل مزاجت تھا..... ضرورت اپنی جگہ اٹل تھی۔ زمانے کے رنگ اپنی حقیقت تھے..... وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی۔

دوسرے دن حسب وعدہ وہ شہزاد کے پاس جا بھی نہ سکی..... لیکن اسی دن اک بظاہر معمولی لیکن بہت اہم واقعہ پیش آ گیا کہ ریشم نے نوکری کر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔  
خالد کا خط آیا تھا جس میں اس نے بکنے والی جائیداد میں سے اپنے حصے کی کچھ رقم مانگی تھی۔ سلیہ اچانک بیمار ہو گئی تھی اور اسے پیسے کی فوری ضرورت پیش آ گئی تھی..... یہ جاننے کے باوجود کہ پیسہ سارے کا سارا خرچ ہو چکا ہے۔ اس نے مطالبہ کر دیا تھا۔

امی نے تو خط پڑھ کر روتے روتے برا حال کر لیا تھا اور ریشم دوسرے دن شہزاد کے دفتر جا پہنچی تھی۔ اشی کو وہ بعد میں بھی سمجھا سکتی تھی۔ اس وقت ضرورت کا منہ بند کرنے کے سنہری موقع سے استفادہ کرنا ہی عقل مندی تھا۔

ریشم نے شہزاد کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا..... تو اس نے خوشی کا اظہار قطعاً نہیں کیا۔ حالانکہ اس کا دل انہونی کے ہو جانے پر لبالب پیانے کی طرح چھلک رہا تھا..... بجائے خود بات کرنے کے اسے اپنی سیکرٹری کے پاس بھیج دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ریشم اس کے جذبات سے آشنا ہو کر کسی بدظنی کا شکار ہو جائے۔

ریشم کو شہزاد کی سیکرٹری نے سارے کوائف سے آگاہ کر دیا۔ معقول تنخواہ تھی۔ کام بھی کوئی ایسا پیچیدہ نہیں تھا۔ اس نے قبول کر لیا۔

اور جب وہ شکریہ ادا کرنے شہزاد کے آفس میں آئی تو وہ بولا..... ”مس ریشم آپ کو آفس کے ڈسپلن کا خیال رکھنا ہوگا.....“

”جی۔ ضرور.....“

”اور ہاں۔ آپ چار بجے کے بعد مجھ سے بے شک بے تکلفی سے پیش آ سکتی ہیں۔ آفس ٹائم میں آداب و اصول کا خیال رکھنا ضروری ہے..... میں..... ذرا سخت قسم کا اصول پرست واقع ہوا ہوں۔“

”آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی سر۔“ وہ کہتے کہتے ہنس پڑی۔  
”ٹھیک ہے۔“ شہزاد بھی منانت سے مسکرا دیا۔

دفتری کارروائی میں کچھ وقت لگا۔ یہ رسمی سی بات تھی۔ پھر بھی ضروری تھی۔ ایگریمنٹ طے پا گیا۔ کاغذات پر دونوں نے دستخط کر دیئے۔ ایک کاغذ شہزاد نے فائل میں لگا دیا۔ دوسرا ریشم کو دے دیا۔  
”شکریہ۔“ ریشم اٹھتے ہوئے بولی۔

”کل سے نوبتے کام پر آ جائیے گا۔ کچھ دن آپ کو مسرخسانہ کی شاگردی کرنا پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے.....“

”اور ہاں.....!“

”جی۔“

”آپ آیا جایا کیسے کریں گی؟“

ریشم نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ چپ ہو گئی۔ وہ خود ہی بولا۔ ”میری گاڑی آپ کو لے آیا کرے گی..... اور شام کو چھوڑ آیا کرے گی.....“ ریشم انکار و اقرار کے بین بین تھی۔ شہزاد اٹھتے ہوئے مسکرایا۔ ”یہ سہولت صرف اس لیے کہ آپ زریں کی دوست ہیں.....“  
ریشم پھینکی سی مسکراہٹ سے شکریہ ادا کرنے لگی۔  
یہ سہولت اس نے اپنا حق سمجھ کر قبول کر لی۔

-----○-----

آسمان سر پر آن گرے

یا

زمین پاؤں تلے سے نکل جائے۔

بات ایک ہی ہے۔ ہوش و حواس زائل کر دینے کو دونوں ہی ایک جیسی خاصیت رکھتی ہیں۔

اشی کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا..... ریشم کو اس نے شہزاد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے دیکھا تھا تو اس کا دماغ گاڑی کے پیسے کی طرح گھوم گیا۔ کنپٹیوں سے آگ سی نکلنے لگی تھی..... دل بیٹھنے لگا تھا اور سارا جسم پتھر کی طرح بے جان سا ہو گیا تھا۔ اضطراب انتہا کو چھو کر سکتے کی صورت میں ڈھل گیا تھا۔

ساتھ ریشم کا کوئی عزیز یا شہزاد کا کوئی رشتہ دار ہوتا تو سانحہ اتنی قیامت خیزی نہ دکھاتا۔ اکیلی ریشم اور شہزاد کے ساتھ..... کیوں؟ یہ سوال پتی سلاخوں کی طرح ذہن کو داغ رہا تھا۔ وہ امی کے کسی کام کے لیے بازار گیا تھا لیکن کام کیا خاک کرنا تھا۔ وہ تو اپنا سکون و اطمینان ہی لٹا آیا تھا۔

گھائل کی تڑپ دید کے قابل تھی..... جانے چھٹی حس اندر کون سے دکھ کو پگھلا رہی تھی جو وہ اتنا بے چین ہو رہا تھا اور نہ بات ایسی بھی تو نہ تھی۔  
ہو سکتا ہے ریشم زریں کے ہاں گئی ہو اور شہزاد اسے گھر چھوڑنے آ گیا ہو۔  
یار استے میں اس نے کہیں لفٹ لے لی ہو۔

یہ باتیں اس نے سوچیں ضرور..... لیکن من مطمئن نہ ہو سکا..... درد کی لہریں تھم نہ سکیں..... کبھی غصہ آیا اور کبھی بے بسی کا نشانہ بنا..... رات اس نے جاگتی نیند اور

سوتی بیداری میں کاٹی۔

صبح اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ دفتر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کا جی تو چاہ رہا تھا کہ سیدھا ریشم کے پاس جائے..... اور بے دھڑک پوچھ لے۔ تکلفات کی دیواریں مسمار کر دے۔ بر ملا کہہ دے کہ مجھے سولی پر کس جرم کی پاداش میں لٹکا دیا ہے۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہے کہ جو بات مجھے ناپسند ہے، تم نے جانتے ہوئے بھی وہی کیوں کی؟ لیکن اتنی جرأت، ایسی بے باکی ممکن ہی کہاں تھی..... بے شک دونوں گھرانوں میں آنا جانا تھا۔ بے تکلفی بھی تھی اور آزادی بھی۔ لیکن اس مقصد کے لیے فضا کہاں سازگار مل سکتی تھی.....

بستر پر اوندھا لیٹا وہ یہی سوچ رہا تھا۔

عذرا بیگم کمرے میں آئیں تو اسے یوں پڑے دیکھ کر پیار سے اس پر جھک گئیں۔ ”اشی بیٹے۔“

”جی امی۔“ وہ اٹھ بیٹھا اور انگلیوں سے بالوں کو سہلانے لگا۔

”دفتر نہیں جاؤ گے؟“

”دل نہیں چاہ رہا۔“

”کیوں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”جی۔ ٹھیک ہوں۔“

”پھر اٹھو نا۔ تیار ہو جاؤ۔ نوٹونج چکے ہیں۔“

”اچھا امی۔“ کہتے ہوئے وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ بے دلی سے تیار ہو کر وہ

دفتر جانے کو تھا کہ نجھی اخبار لیے اندر آئی۔

”آپ کا رزلٹ آ گیا بھائی جان.....“ وہ شوخی سے بولی۔

”سچ.....“ اشی نے بے صبری سے اخبار لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ نجھی نے اخبار پیچھے کر لیا۔

”آپ کی تیسری پوزیشن ہے۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”جھوٹ.....“ اشی نے چڑ کر کہا۔ ”اخبار دو۔“

”نہیں دیتی.....“ نجھی نے چھیڑنے کو کہا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے.....“ وہ خلاف معمول غصے میں آ گیا۔

نجھی نے اسے شوخی سے ستانا، چھیڑنا چاہا لیکن اشی کے تیر دیکھ کر چپ ہو گئی۔

”میں تو یونہی چھیڑ رہی تھی۔ رزلٹ ابھی کہاں۔“ نجھی نے اخبار اس کی طرف

بڑھا دیا۔

”ایسا مذاق ذرا سوچ سمجھ کر کیا کرو۔ جانتی ہو، میرا ایک پرچہ بہت خراب ہوا

تھا.....“ اشی بھنائے ہوئے انداز میں بولا۔

”پاس تو ہو ہی جائیں گے.....“ نجھی نے دل رکھنے کو کہا۔

”کچھ مشکوک ہی ہے۔“

”اللہ نہ کرے۔“

نجھی اس کا کمرہ ٹھیک کرنے لگی۔ کمرے میں جگہ جگہ سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے

تھے۔ پلنگ کے قریب تو راکھ دان کے اندر اور باہر کئی ادھ جلے سگریٹ پڑے تھے۔ وہ

حیران ہو کر بولی۔ ”اتنے سگریٹ؟“

اشی نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

”یہ سب آپ ہی نے پئے؟“ وہ حیرت زدہ تھی۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”کہتے ہیں پریشانی دور کرنے کا اچھا ذریعہ ہے۔“

”پریشانی؟“

”ہاں.....“

”آپ کو کس بات کی پریشانی تھی؟“

وہ چپ رہا۔

”نو کری تو نہیں چھوٹ گئی؟“

وہ ہنس پڑا..... نجھی اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اشی کی بے خوابی کی غماز آنکھیں

سرخ سرخ تھیں۔

وہ بڑے پیار سے اس سے پریشانی کا سبب پوچھنے لگی۔ وہ کچھ کہنے اور نہ کہنے کے درمیانی خلاء میں چند لمحے معلق رہا..... پھر نجھی کی طرف خوشامدانه نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا..... ”ریشم کے ہاں چلو گی؟“

”کیوں؟“

”وکیلوں کی جرح تو کر لو پہلے۔“

”اس میں جرح کا کیا سوال ہے.....؟ کوئی خاص بات ہے کیا.....؟“

”بس..... تم نے جانا ہے تو میرے آنے تک تیار رہنا۔“

”دفتر سے آتے ہی جاؤ گے..... چار پانچ بجے.....“

”ہاں.....“

”اچھا.....“

”تیار رہنا.....“ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا..... نجھی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے منہ بنایا..... اور پھر کمرہ ٹھیک کرنے لگی..... ریشم سے ملے اسے بھی بہت دن ہو گئے تھے۔ کل ہی وہ امی سے اس کے ہاں جانے کا کہہ رہی تھی۔

لیکن

شام کو وہ جاسکی نہ اشی۔ دونوں کو ریل کار سے پنڈی جانا پڑا تھا۔ دوپہر پنڈی سے شمو کا فون آیا تھا۔ نجھی کو فوری طور پر بلا بھیجا تھا۔ کوئی رشتے کا چکر تھا۔ شعیب کے کسی امیر کیر دوست کے لیے شمو نجھی کے رشتے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔

نجھی اکیلے نہ جاسکتی تھی۔ اسے چھوڑنے اشی کو جانا پڑا۔

تیسرے دن وہ بمشکل جان چھڑا کر واپس آیا۔ جگہ اور ماحول کی تبدیلی نے کافی خوشگوار اثر کیا تھا۔ نجھی کے رشتے کی کچھ کچھ امید بندھ جانے سے بھی سکون ملا تھا۔ اپنی الجھن سے کسی حد تک چھٹکارا پالیا تھا۔ ریشم کو اس نے بخشا تو نہیں تھا..... ہاں غصہ پکھل کر ملائمت سے گلہ بن گیا تھا۔ نجھی پنڈی ہی رہ گئی تھی۔ ریشم سے گلہ کرنے کا مناسب موقع اس کی وساطت سے مل سکتا تھا۔ وہ اس کی واپسی کے انتظار میں رہا۔

لیکن اشی کی قسمت کا ستارہ شاید گردش میں تھا..... عشق کی گہرائیوں اور گیرائیوں

کی پرکھ کے لیے ذہنی دھچکے ضروری تھے۔ اس شام دفتر سے واپسی پر چند پرانے دوست مل گئے۔ سڑک کے کنارے ہی چاروں کھڑے ہو کر گپ شپ لگانے لگے۔

اچانک

اشی ٹھنک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر اسلم کی دکان کے سامنے شہزاد کی گاڑی رک چکی تھی۔ ڈرائیور نے نکل کر پچھلا دروازہ کھولا..... ریشم باہر نکلی۔

وہ خوبصورت جو گیارنگ کے لباس میں تھی۔ آنکھوں پر کالا بڑے بڑے شیشوں کا چشمہ تھا..... اور کالا بیگ کا ندھے پر لٹک رہا تھا۔ وہ دکان کے اندر چلی گئی۔

دوستوں کی باتوں سے بے خبر وہ ایک ٹک ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کا تعاقب دائیں ہاتھ کھڑے رشید نے بھی کیا تھا۔ دوسرے دوست کو آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا تھا۔ ”بس گیا۔“

سب ہنس پڑے تھے لیکن اشی نے مذاق سمجھا ہی نہ تھا۔ اس کی تو جان پر بنی تھی۔ برف کی برودت اندر ہی اندر پھیل گئی تھی۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئی تھیں۔ اس دکان سے ریشم اپنی امی کی دوا لینے آیا ہی کرتی تھی۔

لیکن

شہزاد کی گاڑی؟

تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکل آئی۔ ڈرائیور نے مؤدبانہ ایک طرف ہٹتے ہوئے دروازہ کھولا اور وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اشی ایک ہنگامی خیال کو عملی صورت دینے کے لیے آنا فانا دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی کی طرف لپکا لیکن گاڑی اس کے آدھی سڑک عبور کرنے پر ہی نکل گئی..... وہ کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

پیادہ پا گاڑیوں میں جانے والوں سے ہمیشہ ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔ اشی چند لمحے گم صم کھڑا رہا..... دوستوں کے تمسخرانہ قہقہوں نے اسے چونکا دیا..... تیز تیز قدم اٹھاتے وہ دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر ہولیا۔

یہ نیا دھچکا اک خوفناک زلزلے کی نوعیت کا تھا۔ اس کی ساری ہستی لرز گئی۔



شام دھواں دھواں تھی۔ رت بدل رہی تھی اور بچھڑ جانے کی کیفیت کا احساس فضا میں گھلتی ہوئی اداسی سے خواہ مخواہ ہی ہو رہا تھا۔ اک پر اسرار سی چپ ماحول میں تحلیل ہو گئی۔

ریشم چمن میں ایزی چیئر پر بیٹھی تھی۔ سامنے چھوٹی سی میز پر چائے کی خالی پیالی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں رنگین تصاویر والا کوئی مقبول ماہنامہ تھا۔ قریب ہی گھاس پر ٹرانزسٹر پڑا تھا۔ فرمائشی گانے تھے۔ جانے فرمائش کرنے والے ہی کو رذوق تھے یا ریشم کا ذہن کسی اور طرف منتقل..... اسے ایک گانا بھی من نہ بھایا تھا۔ دھیمے سروں میں گیت اب بھی نشر ہو رہے تھے لیکن وہ سن نہ رہی تھی۔ فضا کی اداسی اور ماحول کی چپ کو دور کرنے کے لیے شاید ٹرانزسٹراس نے دانستہ کھول رکھا تھا۔

رسالہ بند کر کے اس نے میز پر رکھ دیا۔ ذہن منتشر منتشر تھا۔ طبیعت میں الجھاؤ ہی الجھاؤ تھے۔ سوچیں اکھڑی اکھڑی تھیں۔

کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے پاؤں اوپر تلے رکھ کر میز کے سرے پر ٹکا لیے۔ دونوں ہاتھ باندھ کر سر تلے رکھے اور سیاہی مائل آسمان کو دیکھنے لگی۔

آج دفتر سے واپسی پر بازار چلی گئی تھی۔ دو قیصوں کا کپڑا خریدا۔ دوسری دکان سے چائے کے ڈبے اور ٹوتھ پیسٹ لی۔ پرفیومز دیکھ رہی تھی کہ اسے اشی کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اشی شاید اپنے دوستوں کے ساتھ آیا تھا..... پرلے کاؤنٹر پر وہ سب ریڈی میڈ شرٹس دیکھ رہے تھے۔

خوشی اس کے گالوں کی متمتاہٹ بن گئی۔ کتنے ہی دن ہو گئے تھے۔ اس نے اشی کو نہیں دیکھا تھا۔

لیکن یہ خوشی عارضی تھی۔ اشی کی نگاہیں اس پر پڑیں..... تو ان نگاہوں میں عشق

کی گرمی تھی نہ محبت کی حلاوت، اچانک ملنے کی چمک بھی نہیں تھی..... اپنائیت کا ولولہ بھی نہ تھا۔ نظریں اس پر پڑتے ہی جامد ہو گئی تھیں۔ ہر جذبے سے عاری اور ہر احساس سے خالی نظریں ایسے بار کی طرح تھیں جسے ریشم کے وجود نہیں اس کی روح نے محسوس کیا۔

ریشم مسکرائی..... لیکن اپنی یہ ادا ڈھٹائی کی مسکراہٹ لگی۔ اس کے اندر ہی اندر سنائے پھیل گئے۔ وہ چاہنے کے باوجود اشی کے قریب نہ آ سکی۔ اس سے کوئی بات نہ کر سکی۔ اشی نے رخ موڑ لیا اور کاؤنٹر پر رکھی قیص کو دیکھنے لگی۔ بے اعتنائی کا اظہار اس سے بڑھ کر شاید نہیں ہو سکتا تھا۔

ریشم بے دلی سے اپنی چیزیں اٹھائے دکان سے باہر نکل آئی..... وہ گاڑی میں آ بیٹھی اور ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

ریشم نے دیکھا دکان سے باہر اشی کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ محسوسات کے آلے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ اشی کی خفگی ریشم نے نظروں کی ٹھنڈک ہی سے محسوس کر لی تھی۔ یوں ویران ویران کھڑے ہو کر گاڑی کو دیکھنا اس کی خفگی کا دوسرا بڑا ثبوت تھا۔ ان دنوں ریشم ویسے بھی پریشان تھی۔ امی نے تو غم کو روگ بنا کر پال لینے کا شاید عزم کر لیا تھا۔

کبھی کوئی تکلیف ہو جاتی تو کبھی کوئی..... ڈاکٹر اسلم کے علاج سے بھی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اب وہ انہیں سول ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کو دکھانے کے متعلق سوچ رہی تھی..... علاج معالجے کی سہولت تو بے شک وہ اب فراہم کر سکتی تھی لیکن نظر نہ آنے والے دکھوں کا کیا علاج..... خالد کی بے اعتنائی کا دکھ تو اپنی جگہ تھا سو تھا، انہیں تو ریشم کی ملازمت کا بھی دکھ تھا۔ ایسی الہڑسی لاپرواہی اتنی ذمہ داریوں تلے دب گئی تھی..... اوپر سے رشتہ داروں، عزیزوں کی دل کو ریزہ ریزہ کر دینے والی باتیں..... اس ملازمت کو کئی رنگ دے لیے گئے تھے۔

یہ باتیں محمودہ بیگم دے دے لفظوں میں اکثر ریشم کے گوش گزار کر دیتیں۔ ریشم کبھی چپ ہو جاتی کبھی بھڑک اٹھتی..... ملازمت عجیب تھی نہ جرم۔ رشتے دار باتیں بناتے تھے تو بناتے رہیں۔ اس نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی تھی۔ اپنے قول و فعل کی وہ خود مختار

تھی۔ اسے زندگی سے پیار تھا اور بھرپور زندگی گزارنے کا حق اس سے کوئی نہ چھین سکتا تھا۔ اسے بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے والوں کی مطلق پروا نہ تھی۔ پریشانی تو صرف امی کی۔ لیکن

آج کے واقعہ نے پریشانی کا بالکل نیا باب کھول دیا۔ اشی کا اظہار اجنبیت اس کی بے پناہ خفگی کا اظہار تھا۔

کل ہی تو نجھی اور عذرا بیگم اس کے ہاں آئی تھیں..... اس نے اپنی ملازمت کے بارے میں نجھی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

”ریشم تم نے ملازمت بھی کی تو شہزاد کی فرم میں۔“ نجھی نے شوخی سے کہا تھا۔

”زریں کی سالگرہ کا قصہ بھول گئیں.....“

ریشم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ”اس کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا..... اشی کو یقیناً یہ بات اچھی نہ لگے گی.....“

”تو پھر۔“

”مجبوری ہے۔ کیا کرتی.....“

”بڑے نازک مزاج ہیں بھائی جان.....“

”میرے خیال میں انہیں پتہ چل چکا ہے۔ بہت دنوں سے پریشاں پریشاں رہتے ہیں۔“

”تم میری طرف سے صفائی پیش کر دینا.....“

”وہ تو کروں گی..... لیکن مانیں گے نہیں۔ شہزاد سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر ہے۔“

”تو انہیں کہنا کہ کہیں اور میرے لیے اچھی سی ملازمت کا بندوبست کر دیں۔ میں یہاں سے چھوڑ دوں..... گی.....“

اور پھر نجھی نے ہنستے ہوئے کہا تھا..... ”اچھی سی ملازمت اپنے لیے انہیں نہیں مل رہی تھی۔ تمہارے لیے کہاں سے ڈھونڈیں گے..... آج کل چکر ہی چکر ہے۔ لگتا ہے بھائی جان اپنے نتیجے سے بھی مایوس ہیں..... جگہ جگہ درخواستیں دیتے پھرتے ہیں.....“

اور پھر دونوں مالی دشواریوں کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ نجھی کا انداز تو خیر اہلڑ تھا لیکن ریشم بڑے جہان دیدہ انداز میں مالی مسائل کا ذکر کر رہی تھی۔

ریشم نے وضاحت سے ساری باتیں محض اسی لیے کی تھیں کہ نجھی اشی کے گوش گزار کر دے گی..... اور وہ مجبور یوں کا اندازہ کرتے ہوئے شہزاد کی ذات کو نظر انداز کر دے گا۔

لیکن

آج اس کا رویہ کتنا تلخ اور کیسا آزرہ تھا۔ ریشم اسے حق بجانب گردانتے ہوئے بھی دکھ رہی تھی..... اداسیاں اس کی ذات کے اندر پھیلتی جا رہی تھیں اور اس کی سوچیں اشی اور شہزاد کے ارد گرد بھٹک رہی تھیں۔

شہزاد اس کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوا تھا۔ اس نے نظروں سے نہ حرکات سے کوئی ایسی بات کی تھی جو قابل گرفت ہوتی..... دفتری معاملات میں وہ واقعی بڑا سخت قسم کا اصول پرست تھا..... اس کا تجربہ چند دن ہوئے وہ کر چکی تھی۔ اپنے کو لیگ علی رضا سے باتیں کرتے ہوئے جانے وہ کس بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی..... شہزاد نے اسے دیکھ لیا تھا۔

اپنے کمرے میں واپس جاتے ہی اس نے ریشم کو طلب کر لیا تھا اور کو لیگ کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے دفتر کے اندر ہنسنے پر وارنگ دی تھی۔

علی رضا کو تو اس نے ملازمت سے برطرف کر دینے کی دھمکی دے دی تھی۔ چند دن پہلے بھی ایک واقعہ ہوا تھا جس نے ریشم کی نظروں میں شہزاد کی عزت بڑھادی تھی۔

اس دن اس نے بڑے بھڑکیلے اور جدید فیشن کے کپڑے پہن رکھے تھے..... بالوں..... کا خوب صورت سا جوڑا بنایا تھا۔ دفتر ہی سے اسے نعیہ کے ہاں جانا تھا..... اس کے بیٹا ہوا تھا۔ امی کی طرف سے مبارکبادی کا فرض انجام دینا تھا۔

شہزاد کے کمرے میں وہ فائل لے کر گئی تھی تو اس نے اس کے سرپا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔ ریشم کو کچھ کوفت بھی ہوئی تھی۔

لیکن

یہ نگاہ تو صغی نہ تھی۔ فائل پر جھکتے ہوئے اس نے بڑے متین انداز میں کہا تھا۔

”مس ریشم دفتر میں رنگ برنگے لوگ ہوتے ہیں۔“

اختصار میں بھی وضاحت تھی۔ ریشم کے گال گلابی ہو گئے تھے..... آئندہ دفتر میں سادگی سے آنے کا اس نے عزم کر لیا تھا۔

چھوٹے موٹے کئی واقعات اس کی نظروں میں تھے جن کی روشنی میں شہزاد کا کردار اس کے لیے عظیم تھا۔ کوئی گھٹیا حرکت یا عامیانہ بات اس نے نہیں کی تھی..... اس کی نظروں میں اپنے لیے اس نے ہمیشہ اپنائیت بھرا احترام پایا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا جیسے شہزاد اس کی ذات کے ارد گرد پھیلا ہوا وہ حصار ہے جو اس کو محفوظ رکھنے کا پورا پورا ذمہ دار ہے۔ کوئی رذیل نگاہ اس پر نہیں پڑ سکتی۔ کوئی گستاخ ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس صورتحال میں اشی کا رویہ..... اظہار ناراضگی..... ریشم کب سے کرسی میں پڑی یہی بات سوچ رہی تھی۔

کیا اسے اشی کی خوشنودی کے لیے ملازمت چھوڑ دینی چاہیے؟

یا

عزت سے زندہ رہنے کے لیے کام کرتے رہنا چاہیے۔

وہ کوئی بھی فیصلہ نہ کر سکی..... اشی محبت تھا اور ملازمت ضرورت۔ ضرورت اور محبت اپنی اپنی جگہ دونوں ہی اہم تھیں۔ اتنی اہم کہ ایک کو دوسرے پر قربان کرنے کا جذباتی فیصلہ تو شاید ہو سکتا تھا لیکن عملی ممکن نظر نہ آتا تھا۔

-----O-----

وہ اس تقریب میں شریک ہی محض اس خیال سے ہوئی کہ اشی کے وہاں آنے کا یقین تھا..... وہ اس سے مل کر غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ اپنی ضرورت کو شدت و اہمیت کا احساس دلا کر اس کے ذہن سے غلط سلط مفروضے نکالنا چاہتی تھی۔ ہوٹل کا وسیع ہال مہمانوں سے کچھ کھج بھرا تھا۔

ریشم کی متلاشی نگاہوں نے ایک بھرپور جائزہ لیا..... خاندان کے بہت سے لوگ تھے۔ کچھ جان پہچان والے تھے۔ اجنبی چہرے بھی تھے اور ایسے بھی جنہیں اس قسم کی تقریبوں میں کبھی کبھی دیکھا تھا۔

اشی اسے کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مایوسی پڑ مردگی بن کر اس کے سراپا پر چھا گئی۔ لوگوں سے ہٹ کر وہ ایک کونے میں جا بیٹھی۔ اس تقریب میں شامل ہونا بیکار رہی لگا۔ وہ ہجوم میں بھی اکیلی تھی..... سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ہاتھوں کی ملائمت سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ کسی لڑکی کے ہاتھ ہیں لیکن وہ جان نہ سکی۔

یہ نجی تھی..... ریشم نے اس کے ہاتھ ہٹائے تو وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

ریشم کا دل دھڑک اٹھا..... اشی بھی اب ضرور آیا ہوگا۔

”تم اب آئیں.....“ ریشم نے پوچھا۔

”نہیں تو.....“

”کہاں تھیں؟“

”ذہن کے پاس والے کمرے میں۔“

”میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔“

”مجھے.....؟“

”تو اور کسے۔“

”نچھی بڑے معنی خیز انداز میں ہنس پڑی.....“ جھوٹ مت بولو۔ جنہیں تم ڈھونڈ رہی تھیں، وہ تو آئے ہی نہیں۔“

ریشم کا مسکراتا ہوا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ آہستگی سے بولی..... ”اشی نہیں آئے؟“  
نچھی نے نفی کے انداز میں سر ہلا دیا اور پھر رازداری سے بولی۔ ”اللہ قسم ریشو، بھائی جان تم سے بڑی سنجیدگی سے ناراض ہو گئے ہیں۔ سارا دن منہ پھلائے پھرتے ہیں..... ہنستے ہیں، نہ بولتے۔ ہمیں بھی اتنا بور کرتے ہیں۔ بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔“

ریشم نے اپنی خوبصورت سیاہ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ سیاہیوں میں اداسیاں گھل رہی تھیں۔ سبزی مائل سنہری لباس میں اس کا چہرہ پھیکا پھیکا پڑ گیا..... ”نچھی کو اس پر بڑا پیار آ گیا۔ اس کی ٹھوڑی کو پیار سے چھوتے ہوئے بولی۔“ ”قصور تمہارا اور سزا مل رہی ہے ہمیں..... کہیں باہر لے جاتے ہیں نہ گھر میں ہنسی مذاق..... میرا تو جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ تم نے بھی تو اچھا نہیں کیا۔ بھائی جان سے مشورہ ہی کر لیا ہوتا۔“

ریشم سر جھکائے اپنے پالش شدہ لمبے ناخنوں سے میز کی سطح کھرچ رہی تھی، نچھی بولے گئی۔ ”ویسے ایک طرح سے بھائی جان بھی حق بجانب ہیں ریشو۔“

ریشم نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
”سچ کہتی ہوں..... شہزاد کے بارے میں لوگ اچھی رائے ٹھیک ہی تو نہیں رکھتے۔ ابھی ابھی ہم ادھر بار کی طرف گئے..... تو وہاں بیٹھا خوب جام پر جام چڑھا رہا تھا۔“

”شہزاد۔“ ریشم نے حجبانہ کہا۔

”جی ہاں۔ جناب کا باس۔ ساتھ کوئی سنہری رنگت والی الہڑ ماڈرن سی لڑکی بھی تھی۔ دونوں خوب چڑھا رہے تھے۔ ایسے کردار کا آدمی.....“

نچھی کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ چند آشنا چہرے ان کے قریب آ گئے تھے۔ ریشم

بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور رسمی سی تکلفاتی گفتگو سب میں ہونے لگی۔

ریشم کی الجھنوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ پریشانیاں ان دنوں ویسے بھی بہت تھیں۔ امی کی بیماری کچھ سنجیدہ ہی ہوتی جا رہی تھی۔ بلڈ پریشر تھا اور پتے کی تکلیف بھی شوگر کے بھی کچھ آثار تھے۔

محمودہ بیگم یوں لگتا تھا جیسے بار زندگی اٹھائے اٹھائے تھک گئی ہیں۔ ریشم پیار سے ان کے گلے میں بانٹیں ڈال دیتی..... ”امی جانی خوش باش رہا کریں.....“ بڑے والہانہ انداز میں کہتی..... حوصلہ افزائی کی باتیں کرتی لیکن امی تھیں کہ ڈھلتے سورج کی پرچھائیں بنتی جا رہی تھیں..... خالد کا غم دل کا روگ بن گیا تھا۔ وہ من مانی کر کے اپنے گھر میں خوش و خرم رہتا تو بات گوارا ہوتی لیکن اس کے ازدواجی حالات لڑائی جھگڑوں کی نذر ہو رہے تھے۔ محدود آمدنی پر سلیمہ نے لامحدود خرچے شاید اس لیے ڈال رکھے تھے کہ جانتی تھی۔ خالد ایک امیر اور باوقار خاندان کا آدمی ہے لیکن خالد امارت کے کھوکھلے تابوت کو کندھوں پر اٹھائے کب تک بھرم قائم رکھتا۔ بیٹا تھا، ماں کی حالت دیکھ کر دکھتا بھی تھا۔ بہن کی ملازمت سے غیرت پر تازیانے بھی لگتے تھے۔ جوانی کی دیوانگی جتنی تیزی سے آئی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے فرزانگی کی راہیں بھی دکھا گئی لیکن اب کچھ اس طرح جکڑا گیا تھا کہ فرار کے سارے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ کھینچا تانی تھی۔ بیوی کو گوارا نہیں تھا کہ وہ ماں اور بہنوں کے نام بھی لے اور وہ تھا کہ اب باقاعدگی سے ماں کو خط لکھنے لگا تھا۔ دوسرے مہینے ایک آدھ دن کے لیے آ بھی جاتا۔ یہ بات محمودہ بیگم کے لیے وجہ تسکین نہ تھی۔ بیٹے کے حالات کا انتشار اس کے چہرے پر رُف ہوتا اور مامتا کی باریک نگاہیں ایک ایک واقعہ پڑھ لیتیں.....

ریشم کو خالد پر بڑا ترس آتا۔ اس کی طرف داری وہ ہمیشہ سے کرتی آئی تھی لیکن اس کی سوچیں زخم خوردہ ہو جاتیں۔ محبت کیا صرف ایک ابا ل کا نام ہے۔ آیا اور بیٹھ گیا؟ خالد جس نے سلیمہ کے لیے زمانے سے ٹکر لے لی تھی۔ اب اسی کے ہاتھوں نالاں تھا..... وہ جوش جنون..... وہ عشق کی گرمی..... وہ وفا کے قصے کیا ہوئے.....؟

سارہ جب بھی آتی ریشم یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیتی۔ وہ تلخی سے کہتی۔ ”یہ

سب دماغی خلل ہے۔ کچھ لوگ جذبات کے ریلے میں بہہ جاتے ہیں۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ راستے کا تعین نہیں کر پاتے.....“

”تو پھر محبت کیا چیز ہے؟“ ریشم معصوم گھبراہٹ سے پوچھتی۔

”آج کے دور میں کچھ بھی نہیں.....“ وہ جل کر کہتی اور ریشم کے پہلو میں ٹیس سی اٹھتی..... محبت ایک آفاقی قدر ہے..... اس کا دل کہہ اٹھتا۔

دن گزر گئے۔ بے کیف، بے رنگ اور بے سکون دن۔ یہ ریشم ہی کا احساس تھا ورنہ ان دنوں تو خوب گہما گہما رہی۔ خاندان میں کتنی شادیاں ہوئیں۔ شوکی کی منگنی ہوئی۔ شمع بھابھی کے بیٹے کی سالگرہ منائی گئی..... سارہ کے میاں کو ترجیاں ملیں..... اور امی کی احوال پر سی کو آنے والوں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا۔ گہما گہمی، ہلچل اور رونق کے باوجود ریشم کے من میں ویرانیوں کی دھول اڑتی رہی..... اشی اس سے ناراض تھا..... اس حد تک کہ اسے یوں لگتا جیسے وہ دونوں اجنبی ہیں۔ وہ سوچتی، کیا ناطے اتنی جلدی ٹوٹ بھی جاتے ہیں؟

لیکن

یہ ناراضگی!

وہ جانتی تھی کہ ناطوں کے ٹوٹ جانے کی دلیل ان کے مستحکم ہونے کا نشان ہے۔ اسی لیے وہ افسردہ اور پشیمردہ رہنے کے باوجود اشی سے مل کر غلط فہمیوں کے ازالے کی سبیل سوچتی رہتی۔

اس دن امی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی۔ ریشم نے سارہ کو بلا بھیجا۔ اس کا میاں یوں بھی ان دنوں دورے پر تھا۔ وہ اطلاع ملتے ہی آگئی۔ ہفتہ بھر رہنے کا پروگرام تھا۔ ماں اور بہن کے ساتھ رہنے کی امنگ فطری تھی۔ ان سات آٹھ دنوں میں وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے ملانے کے پروگرام بھی بنا کر آئی تھی..... اشی کے ہاں جانے کا بھی اسی نے ریشم سے کہا تھا۔

”بہت مدت ہو گئی انہیں ملے..... عذرا خالہ تو آتی جاتی ہیں نا؟“

”کبھی کبھی۔“

”تم بھی تو نہ گئی ہو گی۔“

نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ منموم صورت بنا کر بولی۔ ”جانے کو دل ہی نہ چاہا۔“

”جھوٹی۔“

”اللہ قسم۔“

”کیوں؟ کیا بات ہے۔ کچھ..... ان بن تو نہیں ہو گئی؟“

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اشی کو میری

ملازمت پر اعتراض ہے۔“

”سچ؟“

”ہاں۔“

”تو پھر۔“

”پھر کچھ بھی نہیں۔“

ریشم نے تو بظاہر مسکراتے مسکراتے بات کی لیکن سارہ سنجیدہ نظر آنے لگی۔ فوری

طور پر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی..... اپنی چوڑیوں سے کھیلنے ہوئے وہ سوچ میں گم ہو گئی۔

”آج شام ان کے ہاں چلیں گے۔“

”آپ اکیلے ہی جائیے گا۔“

”تم؟“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟“

”مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔“ ریشم نے ہنستے ہوئے سارہ کے کندھے سے سر لگا

دیا۔

”پنگی۔“ سارہ بھی مسکرا دی۔

شام سارہ کے اصرار پر بھی وہ اس کے ساتھ اشی کے ہاں نہیں گئی۔ انا کا بت توڑ دینے

کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اتنا بڑا گناہ تو اس سے سرزد نہیں ہو گیا تھا جواشی یوں بگڑ بیٹھا تھا۔

سارہ ملازمہ کے ساتھ چلی گئی۔ ریشم نے ہولے سے سارہ کے کان میں کہا۔

”میں بھی ناراض ہوں۔ اسے خفا ہونا آتا ہے تو بگڑنے میں میں بھی پیچھے نہیں۔ اسے بے شک بتا دینا۔“

ریشم نے اس کا تیرا سی پر چلایا تھا..... توقع تھی کہ یہ پیغام پا کر وہ خود ہی دوڑا آئے گا۔ ریشم کو زریں والا واقعہ بھولا نہیں تھا۔

وہ سوچ رہی تھی۔ جب اشیٰ خود بخود آجائے..... تو پھر ساری رنجشیں دور ہو جائیں گی۔ وہ صاف گوئی سے ساری بات اسے بتا دے گی۔

لیکن سائرہ پیغام دے ہی نہ سکی۔ صبح ہی اشیٰ کا نتیجہ نکلا تھا۔ بد قسمی سے وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا..... گھر کی فضا میں سوگ کی سی کیفیت تھی۔ خود اشیٰ اتنا پریشان تھا کہ سائرہ کو کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔

ریشم بڑی بے صبری سے اس کے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔ امی کے پاس چچی اور نعیمہ بیٹھی تھیں..... انہیں باتوں میں مشغول دیکھ کر وہ اپنی بے تابیوں کو سینے سے لگائے باہر آ گئی تھی۔

سائرہ اور ملازمہ رکشے سے اتریں تو وہ لپک کر ان کے پاس گئی۔ تجسس سے بہن کو دیکھا۔

پھبکی سی مسکراہٹ سے اس کا دل ڈوب گیا۔

”جلدی آ گئیں باجی۔ نجھی گھر پہنچی تھی نا..... سب اچھے تو تھے..... انکل اور

آئی نے میرا پوچھا ہوگا..... اور.....“

”آج تو جا کر بور ہوئی۔“ سائرہ نے چمن میں پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ گھبرا کر ریشم نے پوچھا۔

سائرہ نے ٹھنڈی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا..... پھر گوگو کے عالم میں اپنی انگلی میں پڑی انگٹھی کو دوسرے ہاتھ سے گھمانے لگی۔

”کیا بات ہے باجی۔“ ریشم کرسی کے ہتھے پر جھک گئی۔ ”کسی نے لفٹ نہیں کرائی۔“

”نہیں تو..... سب بڑے خلوص سے ملے۔“

”پھر.....“

”اشیٰ کا نتیجہ آج ہی نکلا ہے۔“

”فیل ہو گیا۔“

”ہاں۔“

ریشم چپ ہو گئی..... سائرہ بھی خاموشی سے انگٹھی گھماتی رہی..... کئی لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ ”ہماری قسمت ہی خراب ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”دیکھو نا۔ اشیٰ فیل ہی ہو گیا۔ تین چار سو کی ملازمت کر رہا ہے۔ خالی خولی ایم اے کی آج کل کیا قدر ہے۔“

ریشم کچھ نہیں بولی۔ بہن کو جھپنی جھپنی نگاہوں سے دیکھا اور پھر آسمان کی سیاہ رنگت کو دیکھنے لگی۔

سائرہ اٹھ کھڑی ہوئی..... ریشم کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے بولی۔ ”جنابہ کو تو تسنیم پسند نہیں تھا کہ معمولی تنخواہ دار ہے۔ اب اشیٰ کے متعلق کیا خیال ہے۔ پسند بدل تو نہ جائے گی۔“

”باجی۔“ ریشم نے سائرہ کی مسکراہٹ اور مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے یہ کیا بے تکلی بات کہہ دی۔“

سائرہ مسکرانے لگی۔

”جانے لوگ حقیقت پسند کیوں نہیں ہوتے؟“ ریشم رخ موڑتے ہوئے بولی۔

”پسند اپنی جگہ ضرورت اپنی جگہ۔ باقی رہی اشیٰ کی ناکامی تو ابھی کیا بگڑا ہے۔ پھر امتحان دے سکتا ہے۔ اسے دینا ہی پڑے گا بلکہ پاس کرنا پڑے گا..... اس لیے کہ ضرورت..... اس کی متقاضی ہے۔“

”ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ اسے امتحان ضرور پاس کرنا چاہیے۔“

”اتنی جلدی کس بات کی؟“

”جلدی تو انہیں بھی نہیں..... شاید نجھی کی شادی کے بعد ہی اشیٰ کا نمبر آئے گا۔“



”اچھی بات ہے۔“

”نچھی کے رشتے کی بات کہیں ہو رہی ہے۔ انکل بتا رہے تھے۔ شمو کے شوہر کے دوست..... بہت امیر کبیر ہیں..... بہت بڑا کاروبار ہے۔ اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی۔“

”بچی؟“

”بتا تو یہی رہے تھے۔ لڑکے کا باپ متوسط طبقے کی سلجھی ہوئی لڑکی کو بہو بنانا چاہتا ہے۔ سنا ہے۔ بڑے بیٹے کی شادی اپنے کسی ہم پلہ کے ہاں کی تھی۔ وہ لڑکی شوہر کو لے کر الگ ہو گئی..... اب وہ چاہتے ہیں کسی ایسی لڑکی کو بہو بنا کر لائیں جو ان کے بڑھاپے میں خدمت گزار بھی ثابت ہو۔ شمو انہیں بہت پسند آئی۔ اسی لیے شمو نے نچھی کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی.....“

”اچھی بات ہے نچھی کا رشتہ ضرور وہاں ہونا چاہیے۔“

سارہ اس کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ ریشم دلچسپی سے سنتی رہی۔

”ہے بڑی چالا کو بی..... مجھے تو بتایا ہی نہیں.....“ ریشم نے نچھی کے متعلق کہا۔

”کبھی ملے تو سمجھوں گی اس سے.....“

”کبھی کیا۔ کل ہی ہو آنا..... امی بھی ہو آئیں تو اچھا ہے۔ اشی کے فیل ہونے سے بھی پریشان ہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھ لیں..... کہ.....“

”اوہ باجی.....“ ریشم نے اس کی بات کاٹ لی۔ اس نے برملا کہنا چاہا..... کہ دل

کے معبد خانوں میں سچے بت ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے نہیں ٹوٹا کرتے..... لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ سارہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی..... جہاں نعیمہ، چچی اور امی اب بھی باتوں میں مشغول تھیں۔

-----○-----

”امی جانی۔“

”ہوں۔“

”میں ہسپتال جا رہی ہوں ایک سرے لے کر۔“

”جاؤ بیٹی۔“

”دیر ہو جائے تو گھبرانہ جائیے گی..... چچی کو بلا لیجئے گا۔“

”کوئی بات نہیں.....“

”خدا حافظ امی جانی.....“

”خدا حافظ.....“

ریشم ماں کے گال پر پیار کر کے باہر آ گئی۔ آج اس نے دفتر سے رخصت لی تھی..... دس بجنے والے تھے۔ وہ تیار ہو کر ہسپتال جا رہی تھی۔ کندھوں پر ہلکی سی شال لیے وہ باہر آ گئی..... گیٹ پر رک کر رکشے کا انتظار کرنے لگی۔ رکشا ملنے کے آثار نہیں تھے۔ ریشم پیدل ہی چل دی۔ سڑک کے اگلے موڑ پر تانگے رکشے وغیرہ مل جانے کی توقع تھی۔

آج موسم ایک اکی بدل گیا تھا۔ رات وقفوں سے بارش ہوتی رہی تھی۔ مطلع اب بھی ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

ریشم خیالوں میں گم شال اچھی طرح لپیٹے سڑک کے کنارے کنارے چلتی گئی۔ موڑ پر کوئی سواری نہ ملی۔ وہ دائیں ہاتھ ہو لی اور پھر سڑک عبور کر کے ایک کوشی کی عقبی گلی پار کر کے دوسری بڑی سڑک پر آ گئی۔

رکشا یہاں بھی نہیں ملا۔ چند لمحے رک کر اس نے دونوں طرف دیکھا۔ گاڑیاں تو نظر آ رہی تھیں لیکن رکشا وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ مایوس ہو کر وہ پھر پیدل چلنے لگی۔ ابھی چند قدم

ہی گئی تھی کہ سامنے سے آنے والی گاڑی پر نگاہیں جم گئیں۔ دل ایک دم زور سے دھڑکا اور گال گلابی ہو گئے۔ گاڑی میں اشی تھا۔ دیکھے بغیر ہی اس کے دل نے یہ بات برملا کہہ دی۔ اشی شاید زن سے گزر جاتا..... لیکن وہ رک گیا..... ریشم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا تھا..... کیوں؟ یہ وہ خود بھی نہ سمجھ پائی تھی..... کیونکہ جب وہ گاڑی سے اتر کر اس کی طرف آیا تو مارے گھبراہٹ کے اس کی بری حالت ہو گئی۔

”جی فرمائیے۔“ اشی نے بالکل بیگانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اجنبی لہجے میں کہا۔

ریشم نے اس کی طرف دیکھا..... آنکھوں کا سارا فسوں اگلے ہوئے اس نے نگاہیں جھکا لیں.....

”آج گاڑی کہاں گئی۔“ اشی نے زہریلے طنز سے کہا۔

”آج میں چھٹی پر ہوں اور گاڑی دفتر کی ہے۔“ ریشم نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“

”کہیں جانا ہے تو میں خدمت کو حاضر ہوں۔“ اشی مڑتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

”اشی۔“ ریشم سٹپٹا کر جھلا کر جیسے چیخ اٹھی۔

اشی نے دو قدم کے فاصلے سے گردن موڑ کر دیکھا۔ ریشم کی حسین آنکھوں میں قہر مانی تناؤ تھا۔

”آخر آپ کا مطلب کیا ہے۔“ وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

اشی نے اسی انداز میں گردن موڑے اسے سر تاپا دیکھا۔ بھرپور اور آ رہا ہو جانے والی نظروں سے۔ ریشم نے اس کی نظروں کا پورے اعتماد سے سامنا کیا۔ اشی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ چہرہ ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں جذبات کی پرچھائیاں کے عکس دیکھے جاسکتے ہیں یا ایسا نقاب ہوتا ہے..... جو جذبات اور محسوسات کو بڑی خوبصورتی سے ڈھانپ لیتا ہے۔

اس نے سر جھکا لیا جیسے اعتراف شکست کر رہا ہو۔ ریشم تیزی سے قدم اٹھاتی

آگے بڑھی۔ اشی نے بنا کچھ کہے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا..... ریشم ہچکچائی نہیں گاڑی میں جا بیٹھی۔ گھوم کر اشی دوسری طرف آیا اور بیٹھتے ہوئے ریشم کی طرف روٹھی روٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”جہنم میں۔“ ریشم جل کر بولی۔ اشی کے ہونٹوں کے گوشے متبسم ہو گئے۔

”میرا تو وہاں جانے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں۔ اکیلی جاسکتی ہو تو.....“ اشی بولا۔

”جہاں جاؤں گی۔ آپ کو ساتھ ہی گھسیٹوں گی۔“ ریشم نے اس کی بات کاٹ کر تلخی سے کہا۔ وہ اب کے مسکرایا نہیں۔ بڑی بڑی گہری نظروں سے ریشم کو دیکھا۔

”آپ بہت برے ہیں.....“ ریشم نے شاکی لہجے میں کہا۔

”وہ تو میں جانتا ہوں.....“ اشی نے بنجیدگی سے کہا اور گہری سانس لیتے ہوئے گاڑی چلا دی۔ کئی لمبے دونوں خاموش رہے۔ ریشم گود میں رکھے بیگ کے فیتے کو مسلتی رہی اور اشی شیشے پر نظریں جمائے سلیٹی سڑک کو دیکھتا رہا۔

”اشی۔“ ریشم نے سکوت توڑا۔

”ہوں۔“

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ اشی نے مضطرب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”یہ حق مجھے پہنچتا ہے؟“

ریشم کا جی چاہا۔ اشی کو جھنجھوڑ ڈالے۔ کیسا پتھر بنا بیٹھا ہے۔ کیسی دل جلانے والی باتیں کر رہا تھا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں جانتی ہوں..... لیکن پوچھ سکتی ہوں کہ میرا قصور کیا ہے۔“ ریشم نے دلفگار لہجے میں کہا۔

اشی کی شاکی نظریں ریشم نے روح میں اترتی محسوس کیں۔ بے قراری سے پہلو بدلا..... اور گلو گیر آواز میں بولی۔ ”آپ سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔“

”میں؟ ہونہہ.....“ اشی طنز سے بھرپور مسکراہٹ سے بولا۔

”جی ہاں آپ۔“ ریشم لڑنے پر آمادہ تھی۔

”اپنے متعلق کیا خیال ہے۔“ اشی نے کئی لمحوں کے توقف کے بعد اس کی طرف

دیکھے بغیر کہا۔

”اعتماد بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ وہ بولی۔

اشی نے پھر بھر پور نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا اعتماد ہی تو چور چور ہو گیا تھا۔ چہرے سے کیا اخذ کرتا۔ اسے تو ریشم کا چہرہ کچی روشنائی سے لکھے اس کاغذ کی طرح نظر آ رہا تھا جس پر پانی پڑ چکا ہو..... اور الفاظ پھیل کر معافی دینے سے قاصر ہو گئے ہوں۔

”آپ نے مجھے بہت دکھ دیئے ہیں۔“ ریشم روہانسی تھی۔

”مجھے الزام دے کر اگر تمہیں تسکین مل سکتی ہے تو یہ دوسری بات ہے ورنہ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی..... سارے دکھ اپنی ہی ذات میں سمیٹ لیے ہیں.....“ شدت جذبات سے اس کی آواز بوجھل ہو گئی..... اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت سٹیرنگ پر شدت اختیار کر گئی۔

”میری مجبوری سے آپ بے خبر نہیں تھے۔“ ریشم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی..... ”ملازمت میں نے شوقیہ نہیں کی۔“ وہ ہنس پڑا..... ہنسی کا کھوکھلا پن ریشم نے بری طرح محسوس کیا۔

”میں نے ملازمت کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں کہا۔ شاید یہ تمہاری مجبوری تھی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لیکن.....“

وہ رک گیا۔ ریشم نے اس کی طرف دیکھا۔ آگے کچھ سننے کی وہ منتظر رہی۔

”خیر چھوڑو اسے..... ادوہ..... ہم بہت دور نکل آئے۔ تم نے کہاں جانا تھا.....“ وہ گاڑی روکتے ہوئے بولا..... سڑک بالکل سنسان تھی۔ وہ واقعی شہر سے دور نکل آئے تھے۔

”آپ راست گو کیوں نہیں ہیں؟“ ریشم نے اچانک سوال کیا۔

وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔

”کہہ کیوں نہیں دیتے۔ شہزاد کے پاس ملازمت کرنے پر آپ کو اعتراض

ہے۔“ وہ کہہ گئی۔

”ہاں ہے.....“ اشی نے اتنے زور سے کہا کہ ریشم گھبرا گئی۔ اشی کے چہرے کے تاثرات ہی بدل گئے۔ غصہ، نفرت اور بیزارگی اس کی آنکھوں اور پھڑکتے نتھنوں سے عیاں تھی۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ ”ملازمت کہیں اور بھی کی جاسکتی تھی..... تم جانتی ہو۔ اس شخص کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا اور ناپسند کرنے کی وجہ بھی تم سے مخفی نہیں.....“

وہ رخ کھڑکی کی طرف موڑ کر باہر دیکھنے لگا۔ ریشم اس کی پشت پر نگاہیں جمائے رہی۔ پھر اس نے ملازمت سے کہا۔ ”بس اتنی سی بات تھی؟“

اشی نے پلٹ کر اسے گھورا..... ریشم مسکرا دی..... ”اشی ملازمت میری ضرورت ہے۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے یہ سہارا لینا ضروری ہے..... میرے حالات اس کے متقاضی ہیں۔ مجھے کہیں اور ملازمت دلادیں۔ میں شہزاد کی فرم میں کام کرنا چھوڑ دوں گی۔“ اشی کچھ نہیں بولا۔ بس اسے دیکھتا رہا۔

”اشی۔“ ریشم نے سر جھکا لیا..... اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہم بچے نہیں ہیں کہ ضرورت اور محبت کو متصادم کر دیں..... اتنے نا سمجھ بھی نہیں..... کہ جذبات کے بہاؤ میں تنکے بن کر بہہ جائیں..... مجھے حقائق سے چشم پوشی کرنے سے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔“

وہ چند لمحے چپ رہی۔

اشی ایک نلک اسے دیکھتا رہا۔

”چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل و دماغ پر یوں مسلط کر لیا جائے تو زندگی کٹھن ہو جاتی ہے۔“ وہ بولی اور پھر رخ کھڑکی کی طرف پھیرتے ہوئے بڑی پرسوز آواز میں بولی۔ ”میں سمجھتی ہوں۔ محبت کے معاملہ میں آپ کا ذہن ابھی نا پختہ ہے۔“

”ریشم۔“ اشی طنز کے اس تیر سے تملٹا اٹھا۔

ریشم نے چہرہ اس کی طرف کر کے بڑے باوقار طریق سے اسے دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کا یقین اور اعتماد متزلزل کیوں ہو گیا..... شک

نے آپ کے ذہن کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہو گئے.....“  
اشی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہیل پر دونوں بازو رکھے وہ گردن موڑے اسے  
دیکھتا رہا۔ چہرے کے تاثرات پر خفت و ندامت کا رنگ غالب آ رہا تھا۔

”شہزاد پر بے اعتمادی سے زیادہ آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے تھا..... آپ نے  
میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی..... آپ نے یہ سوچا ہی کیوں کہ میں..... میں.....“ آگے وہ  
کچھ نہ کہہ سکی۔ دونوں ہاتھوں پر چہرہ گراتے ہوئے وہ بے اختیار ہو کر رو دی۔

اشی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دم رو کے وہ ششدر سا ریشم کو دیکھنے لگا۔  
مجرمانہ احساس نے پہلو میں کچوکے دیئے۔ کیا واقعی وہ ناپختہ ذہن تھا جو وہ اتنی معصوم اور عزیز  
روح کے لیے وجہ اذیت بنا ہوا تھا۔ جن جذبوں کی اساس تقدیس پر اٹھائی گئی ہو..... وہ  
رذالت سے کبھی ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ اس سے کتنی بڑی حماقت سرزد ہوئی تھی..... کتنا بڑا  
قصور کر بیٹھا تھا۔

وہ ریشم کو دیکھتا رہا۔ سپید بے داغ شال میں لپٹی ریشم پاکیزگی اور عظمت کا ایسا  
نشان لگ رہی تھی جس کے سامنے جیں سجدہ ریزی کو تڑپ اٹھتی تھی۔

اور

واقعی

اس نے سر جھکا لیا۔

”مجھے معاف کر دو ریشم۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا اعتراف

ہے۔“

ریشم اسی انداز میں چہرہ ہاتھوں میں لیے جھکی جھکی بیٹھی روتی رہی۔ جانے کون کون  
سادھ تھا جو پگھل پگھل کر آنکھوں کی راہ بہرہا تھا۔

اشی نے پھر ملتجیانہ لہجے میں معافی چاہی۔

ریشم روتی رہی۔

”میں نادم ہوں ریشم..... آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ ہوگی۔ جانتا ہوں قصور ناقابلِ

تلافی ہے لیکن ناقابلِ معافی تو نہ بناؤ.....“ اشی آہستگی سے بولا۔

اور جب ریشم نے چہرے سے ہاتھ نہ ہٹائے تو اشی وہیل سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے  
اس کے قریب ہو گیا..... بازو اس کی پشت پر لے جاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے  
ریشم کے نرم و ملائم بھیکے بھیکے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف گھما  
لیا۔

”معاف نہیں کروگی۔“ اس نے ریشم کی بڑی بڑی بیگی بیگی سیاہ قاتل آنکھوں  
میں جھانک کر پوچھا۔

”نہیں۔“ ریشم سختی سے کہتے ہوئے مسکرا دی۔

آنسوؤں میں چمکتی مسکراہٹ اشی کے صبر و ضبط کے لیے کھلا چیلنج تھی۔ اس کے  
بازو کی گرفت ریشم کے گرد سخت ہو گئی۔

شاید وہ کوئی حسین سی گستاخانہ حرکت بھی کر بیٹھتا کہ ریشم اس کی گرفت سے نکلتے  
ہوئے پرے ہٹ گئی۔ اپنی لابی لابی انگلیوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے  
ہسپتال جانا ہے..... دیر ہو رہی ہے۔“

اشی نے نشے سے ڈولتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر سنبھل کر اپنی جگہ پر سرک  
آیا۔ خاموشی سے وہیل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے گاڑی چلا دی۔

اور

جب کئی لمحوں کی پر زور کاوش کے بعد اس کے جذبات کا ابال معمول پر آیا تو وہ  
اس سے ہسپتال جانے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔

-----○-----

”زریں۔“

”جی۔“

”وہ..... تمہاری دوست ہے نا۔“

”کوئی۔ ریشم؟“

”جی ہاں۔“

”کئی دنوں سے دفتر نہیں آ رہی۔“

”کیوں؟“

”شاید اس کی امی بیمار ہے۔“

”اچھا!“

”تم.....“

”جی.....“

”تم انہیں دیکھنے نہیں جاؤ گی؟“

”چلی جاؤں گی۔“

”کب..... آج؟“

”آج ہی سہی۔“

”چار بجے چلیں گے۔“

”آپ بھی.....“

”ہاں۔“

زریں نے شہزاد کو بغور دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چل گئی..... ریشم

کے حسن کا جادو اس پر بھی چل گیا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ شک اسے پہلے بھی تھا۔  
”کیوں کیا بات ہے؟“ شہزاد نے رسالہ میز پر ڈالتے ہوئے صوفے پر پہلو  
بدلتے ہوئے زریں کو دیکھا۔

وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھی پنک بے بی وول سے منی سی بھتیجی کا سویٹر بن رہی  
تھی۔

”یہ تو آپ ہی بتائیں کہ کیا بات ہے۔“ وہ شوخی سے ہنسی۔

شہزاد نے بڑی مخمور نگاہوں سے گرد و پیش دیکھا۔ مسکرایا اور پھر سر صوفے کی  
پشت سے نکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

زریں اسے دیکھ کر چپکے چپکے مسکراتی رہی۔ شہزاد کی ریشم سے دلچسپی اس سے پوشیدہ  
نہ تھی۔ وہ اکثر اس کے پاس آ کر ریشم کی باتیں کیا کرتا تھا۔ لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں۔  
زریں یہ بھی جانتی تھی۔ اس لیے ریشم کے متعلق باتیں سن کر اس نے کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا  
تھا..... بلکہ ریشم سے مل کر یہ کہنے کی خواہش ہوئی تھی کہ وہ شہزاد سے محتاط ہی رہے۔

ریشم کی امی بیمار تھی۔ شہزاد اسی بہانے اس کے ہاں جانا چاہتا تھا۔ زریں نے چاہا  
کہ اسے ٹوک دے۔ معاملہ دفتر تک ہی رہے، اس سے آگے نہ بڑھے..... وہ کچھ کہنے ہی کو  
تھی کہ شہزاد سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”زریں..... میں کئی دنوں سے تم سے ایک بات  
کہنا چاہ رہا تھا.....“

”کس کے متعلق؟“ وہ جان کر انجان بن گئی۔

”ریشم کے.....“ وہ سنجیدہ تھا۔

”کیوں؟ کام و ام ٹھیک نہیں کرتی؟“ وہ شوخی سے مسکرائی۔

”گولی مارو کام کو۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔“ وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں  
الجھاتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھ گئی جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔“

”کیا سمجھیں.....؟“

”یہی کہ..... آپ ریشم کو پسند کرنے لگے ہیں..... ہیں نا؟“

”میں سنجیدہ ہوں زریں.....“

”سنجیدہ اور آپ؟“ زریں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”زریں..... میرا تسخر نہ اڑاؤ۔“ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

زریں حیرت زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔ ”تو گویا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟“

”قطعی۔“ وہ بولا اور پھر اٹھ کر کمرے میں بے تابی سے ٹہلنے لگا۔

زریں بغور اس کی حرکات کا مطالعہ کر رہی تھی۔

”زریں۔“

”جی۔“

”میرے سابقہ ریکارڈ سے تم شاید میرا مذاق اڑانے میں حق بجانب ہو۔“ وہ

مسکراتے ہوئے بولا۔

”لیکن۔“

”ہوں۔“

”ریشم کے بارے میں پورے خلوص اور ایمانداری سے سنجیدہ ہوں۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”تم سمجھیں نہیں.....“

زریں گوگو کے عالم میں اس کا منہ بکنے لگی۔ وہ درمیانی میز پر ایک پاؤں رکھے

اپنے گھٹنے پر بازو ٹکائے قدرے جھکا اور پھر آہستگی سے بولا۔ ”یہ لڑکی میرے حواس پر چھا گئی

ہے۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ زریں ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ ”اس سے پہلے یہ حادثہ

آپ کے ساتھ اتنی دفعہ بیت چکا ہے کہ اس کی تو اب اہمیت ہی نہیں رہی چاہیے.....“

”تم اب بھی مذاق ہی سمجھ رہی ہو.....“

”کچھ بھی ہو شہزاد آپ کو اتنا خیال ضرور رکھنا ہوگا کہ ریشم گری پڑی لڑکی نہیں۔ مالی

حالات نے نوکری پر مجبور کر دیا ہے لیکن وہ اپنے خاندانی وقار کو بہت عزیز رکھنے والی لڑکی ہے.....“

”میں اس وقار کو بقاء دینا چاہتا ہوں۔“

”مطلب؟“

”شادی۔“

زریں نے انتہائی بے یقینی سے جیسے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے

تن کر اس کے سامنے کھڑا تھا..... زریں سلامیاں گود میں رکھ کر جیسے بننا ہی بھول گئی۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں.....“ وہ اب بھی بے یقینی کے عالم میں تھی۔

”ہاں۔“ وہ قدرے رخ موڑتے ہوئے بولا۔ ”میں قطعاً سنجیدہ ہوں زریں۔“

زریں خاموش ہو گئی۔ جذباتوں کی صداقت شاید اپنا آپ خود ہی منوالیتی ہے۔

”یہ پہلی لڑکی ہے۔“ شہزاد نے مستحکم لیکن نرم آواز میں کہا۔ ”جس کے متعلق میں

نے اتنی سنجیدگی سے سوچا ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے احترام ہے، خلوص ہے، محبت

ہے..... میری نگاہوں نے آج تک اس کے لیے کسی برے اظہار کی جرأت نہیں کی۔ شاید۔

شاید اس لیے کہ محبت جذباتیت سے ہٹ کر کوئی علیحدہ ہی چیز ہے..... یا شاید اس

لیے کہ وہ پاکیزہ اور مقدس ہے.....“

زریں بڑی مرعوب ہوئی۔ اس کی ساری ہمدردیاں شہزاد کے لیے جاگ اٹھیں۔

”آپ اس سے شادی کرنا چاہتے تو یہ انتہائی خوشی کی بات ہے۔“ زریں جگمگاتی

آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”لیکن.....“

”لیکن..... کیا۔“ وہ بے صبری سے بولا۔

”ریشم آپ کی ہسٹری جانتی ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔

وہ چند لمحے چپ رہا۔ پھر بولا۔ ”تم اس کی دوست ہو..... میرے مخلصانہ

جذبات اس تک پہنچا سکتی ہو۔“

زریں سر جھکائے سوچنے لگی۔ شہزاد دیوار گیر پینٹنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا.....

”اچھا۔“ زریں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”تو آج شام چلوگی اس کے ہاں؟“ شہزاد رخ موڑتے ہوئے بولا۔

”ضرور.....“ وہ سلامیاں اٹھاتے ہوئے بولی۔

شام شہزاد زریں کو ساتھ لے کر ریشم کے ہاں جا پہنچا۔ اس نے بہترین سوٹ



پہن رکھا تھا..... آسائش کی آسودگی اس کے سراپا سے پھوٹ رہی تھی۔

محمودہ بیگم کی بیماری خاصی الجھی ہوئی تھی۔ بلند پریش اور زیابطیس کا جوڑ قابل تشویش تھا..... خالد بھی چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ خاندان کے کئی افراد بھی احوال پرسی کو آئے ہوئے تھے۔ اشی تھوڑی دیر ہوئی واپس چلا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے چکر لگانے میں وہ خالد کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔

ریشم پہلے تو ہچکچائی لیکن پھر لا پرواہی ہو گئی۔ شہزاد کو اس نے خالد سے متعارف کرایا..... سائرہ سے ملا یا اور امی کے پاس لے گئی۔ محمودہ بیگم کافی کمزور ہو گئی تھیں۔ شہزاد نے بڑی اپنائیت اور محبت سے ان کی احوال پرسی کی۔

وقت چہرے پر بیٹے دنوں کی ساری تاریخ رقم کر دیتا ہے۔ شہزاد عالی نصبی کے نشان ان کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔

زریں محمودہ بیگم ہی کے پاس بیٹھی رہی اور شہزاد ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ خالد سے وہ بیماری کی نوعیت اور علاج کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ ریشم بھی آ بیٹھی۔

”کسی دوائی سے افاقہ ہی نہیں ہو رہا۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”آپ انہیں ہسپتال داخل کیوں نہیں کروا دیتے؟“ شہزاد نے کہا۔

”ہسپتال کے اخراجات کا کون متحمل ہوتا۔“ ریشم کے کچھ کہنے سے پہلے خالد بولا۔ ”ہسپتال میں کمرہ ہی نہیں مل رہا۔ وارڈ میں رہنے سے گھر ہی بہتر ہے۔“

”میں بندوبست کر دوں گا۔“ وہ بولا۔ ”ڈاکٹر غنی کے کلینک میں داخل کروا دیتے ہیں۔“

ریشم نے تشکرانہ اسے دیکھا۔ ڈاکٹر غنی کے کلینک کے شاہانہ اخراجات کا اسے علم نہ تھا۔ خالد جانتا تھا، چپ ہی رہا۔

”وہاں دیکھ بھال اچھی طرح سے ہوگی..... ڈاکٹر ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔“ شہزاد نے کہا۔

”بندوبست ہو سکے تو اچھی بات ہے۔“ بے دلی سے خالد نے کہا۔

”ڈاکٹر اسلم نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔“ ریشم سادگی سے بولی۔

”کل ہی بندوبست ہو جائے گا۔ ڈاکٹر غنی میرا دوست ہے۔“ شہزاد نے یقین سے کہا۔

سائرہ چائے بنا کر لے آئی۔ مہمان کی حیثیت کے پیش نظر اہتمام کیا تھا۔ ریشم زریں کو بھی بلالائی۔ سب نے پر تکلف چائے بے تکلفی سے پی۔

دوسرے دن ہی ہسپتال میں الگ تھلگ کمرہ مل گیا۔ شہزاد اپنی گاڑی میں انہیں ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر غنی اور دوسرے سپیشلسٹ آ گئے..... باہمی صلاح مشورے سے علاج شروع ہو گیا۔ محمودہ بیگم کی دیکھ بھال بڑی اچھی طرح ہونے لگی۔ کنسلٹیشن فیس شہزاد نے ادا کی۔ کمرے کا خرچ بھی پیشگی دے دیا۔

شہزاد کا یہ بہت بڑا احسان تھا جس سے اہل خانہ مرعوب ہوئے۔ پھر کتنی ہی قیمتی قیمتی دوائیاں وہ خود لے آیا تھا۔ ریشم اور سائرہ کے اصرار کے باوجود اس نے پیسے نہیں لیے تھے۔

”ماں سب کی ماں ہوتی ہے۔“ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”مجھے بھی خدمت کا موقع ملنا چاہیے۔“

”کتنا عظیم انسان ہے۔“ اس کے جانے کے بعد سائرہ نے کہا۔

”بہت عظیم ہے باجی۔“ ریشم نے تائید کی اور پھر دل ہی دل میں سوچا۔ ”جانے لوگ اسے عظیم کیوں کہتے ہیں۔“

شہزاد روزانہ باقاعدگی سے محمودہ بیگم کو دیکھنے آنے لگا۔ ڈاکٹروں سے ملتا، نرسوں کو ہدایت دیتا۔ چھوٹی موٹی ضرورتوں کا سائرہ سے پوچھتا۔ ریشم کو اس نے دفتر سے دو ہفتے کی چھٹی دے دی تھی۔ زریں کو بھی وہ اکثر ہمراہ لاتا۔

محمودہ بیگم کا علاج بڑے ہی تسلی بخش طریق سے ہونے لگا۔ شہزاد ان کے لیے فرشتہ رحمت تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنی دعاؤں سے اسے نوازتی رہتیں۔

سب ٹھیک تھا۔

صرف

اشی اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ ریشم دانستہ اس کے قریب تر رہتی۔ شاید معاملے کا

توازن یوں برقرار رکھنا چاہتی تھی۔  
گواشی کا اعتماد ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔  
پھر بھی

کوئی شے اس کے اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کر بکھرتی رہتی۔ خطرے کے الارم تو اس شدت سے بج اٹھتے کہ بے اختیار ہو کر وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔  
بظاہر کچھ بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی اتنا کچھ تھا کہ اس کے اعصاب پر ہر وقت ہلکا ہلکا خوف مسلط رہتا۔ کچھ نہ کچھ ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا۔ چھٹی حس گھنٹیاں بجا بجا کر خبر داری کا اعلان کرتی رہتی۔

-----○-----

حادثات زندگی میں دبے پاؤں آتے ہیں۔  
اور

دندنا تے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

یہ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ شاید اس خوفناک تباہی کو دیکھنے کی خود بھی تاب نہیں رکھتے  
جو پھیلا کر وہ دندنا تے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

کئی دنوں سے گھر میں ایک ہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ اشیائے منگنی کی باقاعدہ رسم ادا کرنا چاہتا تھا۔ جانے کون کون سے وسوسے اور دھڑکے اسے گھیرے رہتے تھے۔ وہ ڈھکی چھپی بات کا اعلان کر کے ریشم کو اپنے لیے پوری طرح محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے شمو سے یہ بات کہلوائی۔ پھر خود امی اور ابو سے کہہ دیا۔

امی حسب عادت پرانی دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ اشی بھی چپ چاپ سن لیتا اور کبھی دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیتا۔ صغیر احمد بین بین تھے۔ ان کی نظر میں منگنی کر دینے میں کوئی حرج بھی نہ تھا۔ اشی بچہ نہیں تھا جو اس کی انگلی پکڑ کر متعین راہوں پر چلایا جائے۔ معمولی آمدنی تھی تو کیا ہوا، لوگ جی ہی لیتے ہیں اور پھر اب تو اشی نے پھر سے امتحان کی تیاری شروع کر دی تھی۔ بہت سنجیدگی سے پڑھ رہا تھا۔ شادی کے لیے امتحان کی کامیابی کا انتظار کیا جاسکتا تھا۔

ویسے

عذرا بیگم کے دلائل بھی رد کرنے کے نہ ہوتے۔ وہ کونسا سرمایہ دار تھے۔ بینک بیلنس تھے، نہ کچھ اور لے دے کے تنخواہ ہی تنخواہ تھی۔ شمو کی شادی پر لیے گئے قرض کی قسطیں ابھی تک نہ اتری تھیں۔ خدا جانے ذاتی مکان کس طرح بنوا لیا تھا۔ ابھی اس کا قرض بھی

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کو ادا کیا جا رہا تھا۔ ادھر نجی کی بات لگنے کی بھی کچھ کچھ امید نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ لوگ واقعی رشتے پر آمادہ ہو گئے تو اس کی شادی بہت بڑا مالی مسئلہ بننے والی تھی۔ ایسی صورت حالات تھی۔ عذرا بیگم منگنی کر کے کیسے بندھن باندھ لیتیں۔ منگنی کر کے سالوں تو بات لٹکائے نہیں رکھنا تھی۔

روز ہی یہ مسئلہ زیر بحث ہوتا اور بنا کسی فیصلہ کے بات چیت ختم ہو جاتی۔

لیکن اس دن تو اشی خاصا الجھ گیا۔ وہ محمودہ بیگم کے ہاں گیا ہوا تھا۔ وہ اب روبہ صحت تھیں۔ پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آ رہی تھیں۔ شاید کھانے پینے سے کہیں زیادہ ہم امیدوں کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ اشی کو محمودہ بیگم کو دیکھ کر یہی محسوس ہو رہا تھا۔ شہزاد نے ان کی بہت خدمت کی تھی۔ اس کا اعتراف وہ اشی کے سامنے جس انداز میں کر رہی تھیں۔ ان میں امید کا پہلو بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔

وہ بجھے دل سے اٹھ آیا تھا اور جب روز والی لے دے کھانا کھاتے ہی شروع ہوئی تو اس نے دو ٹوک فیصلہ کر دیا۔ ”میں اور ریشم آپ پر بار نہیں بنیں گے۔ زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرتے ہی رہیں گے۔ آپ یہ معاملہ طے کر دیں۔ ذمہ داری میری اپنی ہے۔“

”اشی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ صغیر احمد نے کہا۔ ”بات ٹھکانے تو لگے گی۔ یہ نہ ہو ہم آس ہی لگائے رہیں اور.....“

”اس کا امکان بھی ہے۔“ اشی دل جلے لہجے میں بولا۔

عذرا بیگم فکر مندی سے اس کا منہ تکتے لگیں۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے محمودہ بیگم سے ہم وعدہ لے چکے ہیں۔“

”تو امی اس وعدے کو ڈھکا چھپا رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ شو بولی۔ ”بہتر یہی ہے کہ نشانی کر دی جائے۔ اس طرح اور اگر کوئی خواہش مند ہوا بھی تو اس کی زبان بند کی جاسکتی ہے۔“

”لگتا ہے شہزاد کا کچھ کچھ ارادہ ہے۔“ نجی بولی۔ ”زریں کی باتوں سے میں تو یہی اخذ کر پاتی تھی۔“

اشی کا دل دھک سے رہ گیا۔ نجی سے وہ زریں کی باتوں کا بے صبری سے پوچھنے لگا۔ اشی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آنکھوں میں کرب کی کیفیت لہرانے لگی۔ شاید صغیر احمد نے اس کی بدلتی حالت بھانپ لی۔ اٹھ کر اس کے قریب آئے اور اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بڑے پیار سے بولے۔ ”فکر نہ کر دو دوست۔ ہم یہ فریضہ ادا کر ہی دیتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ محنت اور ہمت شرط ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی اچھا وسیلہ بنا ہی دے گا۔“

اشی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ابا جان۔“ وہ خوشی سے ہنستے ہوئے بولا۔  
صغیر احمد نے بازو پھیلا دیئے اور وہ منے سے بچوں کی طرح باپ کی چھاتی سے لگ گیا۔

”یہی تو باتیں خراب ہیں آپ کی۔“ عذرا بیگم بھی خوشی سے چپکتے ہوئے بولیں۔  
”نہیں بیگم۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اگلے جمعہ کو یہ پرمسرت تقریب ادا ہو جائے گی۔“

”لو اور سنو۔ اتنی جلدی، لڑکی والوں سے صلاح مشورہ تو کر لیں۔“

”یہ آپ کا کام ہے۔“

”اور کوئی جوڑا وغیرہ! انگٹھسی۔“

”سب ہو جائے گا۔ ابھی تو پانچ دن باقی ہیں۔“

”مبارک ہواشی۔“ شمو نے پیار سے مغلوب ہو کر اشی کے سر پر بوسہ دیا۔ ”اب تو خوش ہونا۔“

”میری اچھی بہن۔“ اشی نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

نجی، شگو اور آصی بھی خوشی سے چپک اٹھیں۔ ایک ہی ایک بھیا کی خوشی کتنی سہانی تھی۔ وہ تو اس وقت اپنے اپنے کپڑوں کا حساب کرنے لگیں۔ کونسا ڈریس بنوانا ہے۔ کون سے کپڑے لینے تھے۔

”کل مجھے تو لائل پور جانا ہے۔ بیگم آپ اور شمو جا کر محمودہ بہن سے دن وغیرہ طے کر لیں۔ زیادہ شور شرابے کی ضرورت نہیں۔ بس منگنی کا اعلان کرنا ہے۔ ان پر کسی قسم کا

بار نہ پڑے۔ یہ کھل کر کہہ دیجئے گا انہیں، کہیں فضول رسماًں میں نہ پڑیں۔“  
اشی کے من سے جیسے کوئی بوجھ اٹھ گیا۔ چاروں بہنوں کو وہ اسی خوشی میں گھمانے لے گیا۔ سب کو ہوٹل میں کافی پلائی اور آخری شو میں پکچر بھی دکھائی۔

لیکن انتہا شاید ابتدا کا سراہوتی ہے۔

خوشی کی انتہا غم کی ابتدا بھی بن جاتی ہے۔ دوسرے دن صغیر احمد تو دفتری کام کے سلسلے میں صبح صبح لائل پور روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے بھی تاکید کی کہ محمودہ بیگم فضول تردد نہ کریں۔ جمعہ کا مبارک دن بھی انہوں نے تجویز کیا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی کہ شمو اور عذرا بیگم تیار ہونے لگیں۔ شمو نے بڑے بھڑکیلے کپڑے پہنے۔ شوخ میک اپ کیا اور سارا زیور پہنا۔ تیار ہو کر وہ آمدے میں آئی۔ اشی کا انتظار تھا۔ وہ اپنے کسی دوست سے گاڑی لینے گیا ہوا تھا۔ اپنی گاڑی تو ابولے گئے تھے۔

گاڑی آ گئی۔ اشی کے قدم خوشی سے بہک رہے تھے۔ وہ لپک کر شمو کی طرف آیا۔ ”واہ واہ۔ کیا جگہ نکالی ہے۔ اچھی خاصی خوبصورت لگنے لگی ہو۔“

”گاڑی لے آئے؟“ عذرا بیگم بولیں۔ کریم کلر لباس میں بڑی پروقار لگ رہی تھیں۔

”جی امی۔ بس جلدی کیجئے۔“ اشی بولا۔

”ہم تو تیار ہیں۔“ وہ بولیں۔

”چلو۔“ شمو نے کہا۔

اور عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو۔“ اشی نے فون اٹھایا۔

”جی۔“ اس کے منہ سے جیسے چیخ نکل گئی۔ عذرا بیگم اور شمولپک کر آئیں۔ اشی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ہونٹ بالکل سپید پڑ گئے تھے۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ عذرا بیگم نے اسے تھامتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔ شمو نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ اشی تو کچھ بتانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بات کی۔

”ہائے۔ امی۔“ شمو کی لمبی چیخ فضا کو تھرا گئی اور وہ سہارا لینے سے پہلے گر گئی۔  
”نچھی، شگو اور آ صی اور ملازمہ سب بھاگے آ گئے۔“ کیا ہوا۔ کیا ہوا؟“ سب کی زبان پر یہی تھا۔

”ابو۔“ اشی چیخ اٹھا۔ ”ایکسڈنٹ۔ ابو۔ مر گئے۔ امی۔“

فون بینک سے آیا تھا۔ کار کا تصادم ٹرک سے ہوا تھا۔ صغیر احمد نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ ان کا اسسٹنٹ بچ گیا تھا اور ڈرائیور شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا۔

کاروان حیات اتنی خاموشی سے لٹ گیا تھا۔ ہنستا بستا گھر آنا فانا تباہ ہو گیا تھا۔ ایک محشر بپا تھا۔ بچیوں کی چیخیں درود یوار کا کلیجہ چیر رہی تھیں۔ عذرا بیگم ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں اور اشی پر سکتے کی کیفیت طاری تھی۔

چیخ و پکار سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ عزیزوں کو خبر ہوئی۔ رشتہ دار آ گئے۔ رات دس بجے کے قریب صغیر احمد کی خون میں لتھڑی لاش گھر پہنچ گئی۔ میدان حشر تھا جیسے لوگ رو رہے تھے۔ بیٹیاں تڑپ رہی تھیں۔ ماں کو غش پہ غش آ رہے تھے۔ اشی تو باپ کے خون آلود سینے سے اس طرح لپٹا کہ جدا کرنا مشکل ہو گیا۔ مرد ہو کر بھی صبر و ضبط کا یارا نہ رہا تھا اس میں۔

گھر والے تو گھر والے صغیر احمد کی غیر متوقع موت پر تو غیر بھی آنسو بہا رہے تھے۔ اتنا سنگین حادثہ تھا کہ دل دہل رہے تھے۔ ریشم تو سر بالین بیٹھ کر اس طرح روئی۔ گویا باپ کا سایہ آج ہی سر سے اٹھا ہے۔ وہ بھی تو اس شفقت کو رو رہی تھی جس سے وہ آج دوسری بار محروم ہو گئی تھی۔ صغیر احمد تو مرقع شفقت ہر ایک کے لیے ہی تھے لیکن ریشم تو انہیں دل سے پیاری تھی۔ اس پیار کو ریشم اچھی طرح محسوس کرتی تھی۔ بعض اوقات تو اسے یوں لگتا جیسے اس کے اپنے ابو صغیر احمد کے روپ میں واپس آ گئے ہیں۔

وقت خوشی کا اثر لیتا ہے نہ غمی کا۔ بس اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ اس چال کی پلیٹ میں کچھ ہی آ جائے، یہ تھم کر نہیں دیکھتا۔ بڑا بے حس بڑا سرد مہر ہے یہ۔

زندگی کی بساط ہی پلٹ گئی۔ صغیر احمد تو ایسا ستون تھے جس پر سارے گھر کی خوشیوں، بے فکر یوں اور آسائشوں کے محل کھڑے تھے۔ ستون کیا گرا۔ سب کچھ درہم برہم

ہو گیا۔ ہر چیز یوں گڈ ہوئی کہ سوائے لمبے کے کسی چیز کا وجود قائم ہی نہ رہا۔

کوٹھی خالی کرنا تھی۔ آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا تھا۔

اشی کے ناتواں کندھوں پر استطاعت سے کہیں زیادہ بوجھ آن پڑا تھا۔ وہ تو بوکھلا ہی گیا۔ ایسا ہوتا بھی کیوں نہ۔ ذمہ داریوں کا تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ ایک اکیلا ہونے کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ ہی لاڈلا تھا۔ جہاں قدم رکھتا ماں باپ اور بہنیں آنکھیں بچھاتے تھے۔ کئی دن تو وہ پاگلوں کی طرح رات رات بھر ٹہکتا رہتا۔ خواب آور دوائیوں سے بھی نیند نہ آتی۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر چل جاتا۔ ”ہم کیا کریں گے امی۔“ اس سے زیادہ حوصلہ مند تو شوہن تھی۔ وہ اور شعیب ہی بھاگ دوڑ کرتے رہے۔

کوئی اچھی سماعت تھی جو مکان کا منصوبہ بنا تھا۔ سر چھپانے کی جگہ بھی نہ ہوتی تو کیا بنتا۔ صغیر احمد کے فنڈ گریجویٹی وغیرہ ملنے پر مکان کے قرضے کی اقتضا ادا کی جاسکتی تھیں۔ شو کی شادی کے بقایا جات سنبھال کر رکھے ہوئے چھوٹے موٹے زیورات سے ختم کرنے کا سوچا جاسکتا تھا۔

تبدیلی بتدریج وارد ہو تو ذہن مانوس ہو کر اسی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لیکن اس خاندان پر افتاد اس قدر اچانک اور آنا فانا ٹوٹی تھی کہ مانوس ہونا ایک طرف ذہن سانچے کو ہی قبول نہ کر رہے تھے۔ تبدیلی کو قبول نہ تو بڑی بات تھی۔

آہیں اور آنسو سب کا مقدر بن گئے۔ اشی کی محدود تنخواہ جو اس کا جیب خرچ ہوا کرتی تھی، سارے اخراجات کا منہ کیونکر بند کر سکتی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔ اشی کا تو دماغ سوچ سوچ کر ماؤف ہونے لگتا۔



سردی کی شدید ترین لہر آئی ہوئی تھی۔ ریشم ایئر کنڈیشنڈ دفتر سے باہر نکلی تو جسم کپکپا اٹھا۔ کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھی۔ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی وہ چھٹی کر آئی تھی۔ بازار سے اسے کچھ اون خریدنا تھی۔ انہی دنوں خالد کی سلیمہ بیگم اس کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ سسرال آئی ہوئی تھی۔ بارانہی پر ڈالنا تھا۔ تھی ہی پھوٹا جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔ بچے کے لیے ایک چیز بھی نہ بنائی تھی۔ کوئی کپڑا، کوئی ادنی سیٹ نہ لیا تھا۔ محمود بیگم نے بھی کیا بنانا تھا۔ ساری ذمہ داری ریشم کے کندھے پر آ پڑی تھی۔ چھوٹی موٹی چیزیں وہی اکٹھی کر رہی تھی۔ اسے خالد سے ہمدردی تھی لیکن کبھی کبھی غصہ بھی آ جاتا۔ وہ سوچتی محبت کی ایسی بے تکلی شادی کا فائدہ کیا ہے۔ اسے دکھ بھی ہوتا کہ ان کا محبت کا جذباتی دور ختم ہو چکا ہے۔ حقائق کی تلخیاں ابھر کر دونوں کو اکثر ایک دوسرے کے وجود تک سے بیزار کر دیتی ہیں۔

محبت کا یہ روپ بھی ہوتا ہے۔

وہ سوچ کر کانپ جاتی۔

ریشم کی عمر کے تقاضے یہ تھے کہ وہ ذہن کو ایسی ایسی سوچوں سے گھرا رکھتی لیکن اس عمر میں اس کو تجربات کی چکی میں پسنا پڑا تھا۔ ذہنی عمر بلوغ کو پہنچ کر بہت آگے نکل چکی تھی۔

شاہنگ کے بعد اس کا ارادہ اشی کے ہاں جانے کا بھی تھا۔ صغیر احمد کی موت نے اسے بد نصیب خاندان سے بہت قریب کر دیا تھا۔ وہ اکثر ان کے ہاں جاتی۔ نجھی، شگو اور آصی کے ساتھ گھنٹوں رہتی۔ تسلی دیتی۔ زندہ رہنے کے گر سکھاتی۔ اپنی مثال پیش کرتی۔ کم و بیش ویسے ہی حالات اب ان بچیوں کو درپیش تھے۔

اشی بھی اس کی باتوں سے بڑا متاثر ہوتا اور زندگی سے پوری جرأت سے پنپنے کی

لگن پیدا ہو جاتی۔ کسی اچھی سی ملازمت کے لیے تنگ و دو اس نے ریشم کی حوصلہ افزائی پر ہی شروع کی۔ جہاں کہیں ضرورت کا اشتہار دیکھا، درخواست دے ڈالی۔ بینک کی وجہ سے ابا کی ملاقات بڑی بڑی اسامیوں سے تھی۔ وہ تو ان کے پاس جاتے بچکچکا تا تھا لیکن ریشم نے اسے مجبور کیا۔ ”اس میں شرم کی بات ہے نہ غیرت کی۔ آپ کو زندہ رہنا ہے۔ بہنوں کا بار اٹھانا ہے۔ آپ کو پیسے کی ضرورت ہے۔ یہ پیسہ آپ اپنی محنت کے عوض لیں گے۔ کسی کا احسان نہیں ہوگا۔ احسان فقط اتنا ہوگا کہ یہ لوگ آپ کو آبرو مندانه کام دیں..... منہ دیکھتے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا اشی۔ اپنے حق کے لیے کوشش کرو..... اس کے لیے لڑو..... چھین لینے کی قوت پیدا کرو.....“

وہ بے دھڑک ایسی باتیں کہتی۔ اشی کے بے جان حوصلوں میں جان پڑ جاتی۔ ایک پر جوش و لو لے اور لگن سے وہ ان بڑی بڑی اسامیوں کے آستانے پر حاضری دینے پہنچ جاتا۔

ریشم نے جلدی جلدی چیزیں خریدیں اور ڈرائیور کو اشی کے نئے گھر کا رستہ بتانے لگی۔

وہ کارپوریشن کا قرضہ چکا کر مکان خالی کروا کے نئے نئے گھر میں آ بے تھے۔ اس گھر میں وہ ایک دفعہ ہی آئی تھی۔ اہل خانہ تو اس دن قبر کی سی گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ وہ جلد ہی اٹھ آئی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں اشی اور خالد کا موازنہ ہونے لگا۔ اشی بھی تو اسی سطح پر آ گیا تھا۔ خالد اور سلیمہ۔ لپک جھپک ان کے کئی روپ نگاہوں میں لرز گئے۔ اسے جھر جھری سی آ گئی۔ ذہن سے اس کثیف بوجھ کو ہٹانے کے لیے اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کیا۔ ذہن کے شیطانی پن پر اسے بے طرح کوفت ہونے لگی۔ جتنا وہ دھیان بٹانے کی کوشش کر رہی تھی اتنا ہی وہ ان کے گرد گھوم رہا تھا۔ وہ سڑک پر آتے جاتے لوگوں کے متعلق سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے تیز گاڑی کے قریب سے گزر جانے والے چہروں کو دیکھتے ہوئے اس شغل سے کچھ بہانے کی کوشش کرنے لگی۔

”رکنا۔ ڈرائیور۔“ اچانک وہ پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”جی جناب۔“ اس نے گاڑی پیچھے لے جانے کا اشارہ کیا۔

”اشی۔“ ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے بے صبری سے پکارا۔

ہاتھ میں کچھ کاغذات گول کئے اشی سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔

گاڑی رکنے پر چونکا اور پھر ریشم کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی کوفت دینے والے تاثرات تھے۔

ریشم کا دل دکھ گیا۔ چند مہینوں کی بے رحمیوں نے اشی کو کس بے دردی سے پکل ڈالا تھا۔ ہمیشہ ایک خوبصورت سی مسکراہٹ سے چمکنے والا چہرہ کھر آلود شام کی طرح تھا۔ اس کی چال میں خود اعتمادی کا تناؤ بھی نہیں رہا تھا۔ چہرے کی طرح لباس بھی خستہ حالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

”میں آپ کے ہاں ہی جا رہی تھی۔“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ تھکے ہوئے لہجے میں مختصر سا جواب تھا۔

”خالہ جان کا کیا حال ہے۔ سب ٹھیک ہیں۔ شمو باجی چلی گئیں؟“ ریشم نے رکتے رکتے سارے سوال کر دیئے۔ کتنا دکھ ہو رہا تھا اسے اشی کو دیکھ کر۔

اشی نے اثباتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہی ہیں۔ شمو پچھلے ہفتے چلی گئی تھی۔“

”آئیے نا۔ آپ بھی تو گھر ہی جا رہے ہیں۔“ بڑی جھجک کے ساتھ ریشم نے

کہا۔

”میں آ جاؤں گا، تم جاؤ۔“ اشی نے کوفت زدہ لہجے میں کہا۔

”کام بنا کہیں۔“ ریشم نے آزار سے بچنے کے لیے کہا۔

اشی نفی میں سر ہلاتے ہوئے تلخی سے مسکرایا۔ ”مشکل ہی ہے کہ کہیں بنے۔“

”پھر وہی مایوسی.....“ وہ بڑے پیار سے بولی۔

وہ ہنس دیا..... طنز، تمسخر اور مایوسی سے بھرپور ہنسی۔

ریشم کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہونے کو تھے۔ کیسی سی کڑواہٹ آنکھوں میں گھلتی محسوس ہو رہی تھی۔



”آپ کی سوچ منفی ہوتی ہے۔ یہ بری بات ہے اشی۔“ وہ شاکی نظر آئی۔

”چلیے یہی سہی..... ہاں تو آپ گھر جائیں گی؟“ وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

”جانا تو تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں اب ارادہ بدل دیا؟“ وہ چند لمحوں سے دیکھنے کے بعد بولا۔

”آپ تو ہمارے ہاں کبھی آتے ہی نہیں۔“ ریشم نے گلہ کیا۔

”کس برتے پر آؤں؟“ وہ بڑے دلفگار لہجے میں بولا۔

”اشی۔“ ریشم کی روح چیخ اٹھی۔

وہ پھر ہنس پڑا۔

”مجھے ڈر لگتا ہے۔ آپ اذیت پسند ہوتے جا رہے ہیں.....“ وہ آنکھوں کو

پھیلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ریشم۔“ وہ سنبھل کر بولا۔

ریشم نے غیر یقینی کے انداز میں اسے دیکھا۔

وہ قدرے قریب آ گیا اور دروازے کے کھلے پٹ پر جھکتے ہوئے آہستگی سے

بولا۔ ”تم میرے لیے بہت عظیم سہارا ہو ریشم۔ یہ سہارا کبھی ذرا سا بھی سرک گیا تو یقین کرو،

میں اس طرح منتشر ہو جاؤں گا کہ میرے وجود کو سمیٹنا ممکن ہی نہ رہے گا.....“

ریشم نے گھور کر اسے دیکھا۔ پھر نظروں میں ملائمت لاتے ہوئے بولی۔ ”اس کم

حوصلگی پر کسی دن پٹ جائیں گے میرے ہاتھوں.....“

وہ اس ہمت افزائی پر طمانیت سے مسکرا دیا۔

اور ریشم ڈرائیور سے گاڑی واپس کرنے کا کہتے ہوئے بولی۔ ”پھر کسی دن آؤں

گی..... آپ بھی امی کو دیکھنے آجائیے گا نا..... بالکل ہی ٹھیک تو نہیں ہو گئیں۔“

گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔ اشی نے وعدے کے لیے ہاتھ اٹھایا..... دروازہ بند کرتے

ہوئے..... اور پھر گاڑی نظروں سے اوجھل ہونے تک اسی سمت دیکھتا رہا۔ ریشم گھر پہنچی تو

مضمحل تھی۔ اشی کی طرف سے خاصی متفکر تھی۔ اسے اچھی نوکری نہ ملی تو؟

ملازمہ کو چائے کا کہہ کر وہ امی کے پاس آئی۔ ان کو پیار کیا۔ دعائیں لیں اور

اپنے کمرے میں آ گئی..... بازار سے خریدی ہوئی چیزیں سلیمہ کے کمرے میں بھجوا دیں۔

اپنے کمرے میں چند منٹ بھی آرام نہ کر پائی تھی کہ ملازمہ آ گئی۔

”زریں بی بی آئی ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”ڈرائنگ روم میں۔“

”اکیلی ہے!.....“

”جی اکیلی ہیں۔“

”چلو میں آتی ہوں۔“

ریشم بستر سے نکلی..... شال اوڑھی اور ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

زریں بڑے تپاک سے ملی۔ اس کے چہرے پر تو بڑی اجلی اجلی مسکراہٹ تھی۔

”آج تو بلا کی سردی ہے۔“ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں خود حیران ہوں۔ اتنی سردی میں تم کیسے آ گئیں.....“ ریشم اس کے قریب

بیٹھ گئی۔

”ضروری کام تھا۔“ وہ مسکرائی۔

”کیا؟“

”بتاؤں گی ابھی..... پہلے ہیٹر تو منگواؤ.....“

”اگر ہیٹر نہ ہو تو.....“

”کوئلے تو ہوں گے.....“

”وہ بھی نہ ہوں تو؟“

”تو..... چلو میں باورچی خانے میں چل کر بیٹھتی ہوں۔ چائے بنانے کے لیے

آگ تو جلاؤ گی ہی.....“

ریشم ہنس پڑی۔ پھر اس نے ملازمہ سے ہیٹر لانے کو کہا۔

”ہاں تو کہو، کونسا ضروری کام ہے؟“

”بے تاب کیوں ہوئی جا رہی ہو۔ سردی سے تو نجات پالینے دو۔ گرم گرم

چائے پلاؤ پہلے۔“

”کیوں؟ میری ترقی کا کوئی مژدہ لے کر آئی ہو؟“

”بہت بڑی ترقی کا۔“

زریں بڑے معنی خیز انداز میں آنکھیں نہچاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی ریشم جواب تک مذاق برائے مذاق سمجھ رہی تھی، چونکی..... سنبھلی اور پھر سنجیدگی سے بات پوچھی۔

”ایک بڑی اہم بڑی ضروری بات ہے۔“

”میں مزدوری کر کے آتی ہوں۔ اس لیے تھکی ہوئی ہوں..... براہ مہربانی چپا چپا

کر باتیں نہ کرو۔“

”تمہیں آسودہ کرنے کا ارادہ ہے۔ مزدوری چھڑانے کا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

اور جب ہنستے ہنستے زریں نے شہزاد کی خواہش کا ذکر کیا تو پہلا لمحہ اسے ساکت کر

دینے والا تھا۔ آنکھوں کے ساتھ اس کا منہ بھی کھلا تھا۔

”بھئی وہ بہت سنجیدہ ہے۔ تمہاری رضامندی کے بعد وہ اس سلسلے میں کوئی قدم

اٹھانا چاہتا ہے۔ تمہیں پتہ ہی ہے۔ وہ ایک ماہ کے لیے کل باہر جا رہا ہے۔“ زریں بولی۔

”ہاں.....“ بے جان سی آواز اس کے منہ سے نکلی۔

”اسی لیے تو اس نے خاص طور پر مجھے بھیجا ہے۔ جانے سے پہلے وہ تسلی کرنا چاہتا

ہے۔ پھر واپس آ کر اپنی امی کو تمہارے پاس بھیجے گا۔“

ریشم کئی ثانیے گم صم رہی۔ زریں بھی کچھ نہیں بولی۔ بس مسکرا مسکرا کر ریشم کو دیکھتی

رہی۔

”زریں۔“

”ہوں۔“

”تم میری دوست ہو؟“

”سو فیصد۔“

”تو پھر دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، یہ بات تمہیں کہنا چاہیے تھی؟“

”کیا؟“

ریشم اٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگی۔ پھر زریں کا سنجیدہ چہرہ دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

”زریں اپنی بلا میرے گلے ڈالنے سے پہلے سوچا ہوتا کہ میں بھی ایک لڑکی ہوں۔ جو باتیں

تمہیں ناگوار ہیں، مجھے بھی بری لگ سکتی ہیں۔“

زریں کچھ نہ بولی۔ ریشم کے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔

”چپ کیوں ہو گئیں؟“

”ریشم.....“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”شہزاد کی خوبیاں خامیاں

تمہارے سامنے ہیں۔ پر کچھ تمہارا کام ہے۔ ویسے تمہیں بتا دوں کہ تمہارے لیے اس کے دل

میں بڑے مخلصانہ جذبات ہیں اور شاید تم پہلی لڑکی ہو جسے اس نے پوری شرافت سے لڑکی

سمجھا ہے..... عزت دی اور احترام کیا۔ تمہاری تقدیس سے مرعوب ہو کر اس نے کبھی بری

نظر بھی تم پر ڈالنا گوارا نہ کی..... کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

ریشم کو اس حقیقت کا اعتراف تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ زریں شہزاد کی ساری

خامیاں ساری خوبیاں یکجا کر کے توازن قائم کرنے کی کوشش میں باتیں کرتی رہی۔

چائے آگئی۔ سلسلہ گفتگو کچھ یوں بھی منقطع ہو گیا کہ سلیمہ آگئی تھی۔ سب نے مل

کر چائے پی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں..... ہاں ریشم کا ذہن انتشار کی کیفیت سے

دو چار رہا۔

شام ڈھل آئی تھی۔ جب زریں محمودہ بیگم کے کمرے سے نکلی..... ریشم اسے

گاڑی تک چھوڑنے آئی۔

”پھر کیا کہوں اسے؟“ زریں نے اس کا ہاتھ دبایا۔

”کچھ نہیں.....“ ریشم ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ ”میں کل اس سے بات کر لوں

گی۔“

زریں نے اس کے چہرے سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی..... لیکن اس کا

چہرہ حویلی کے بند صدر دروازے کی طرح لگا..... اندر کیا تھا..... وہ کچھ جان نہ پائی۔

اس کے جانے کے بعد ریشم سیدھی اپنے کمرے میں آئی اور رضائی میں منہ

سرپلیٹ کر پڑ گئی۔

سوچوں کے نئے باب کھل گئے تھے۔ اشی کی محبت میں جذباتی فیصلہ ایک لمحہ میں ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ فیصلہ ہو بھی گیا تھا۔ پھر بھی رات بھر سوتے جاگتے میں سوچیں الجھتی سلجھتی رہیں۔ اشی کا وجود درمیان میں نہ ہوتا تو شاید ریشم اس پیغام پر اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی..... آسودگی و آسائش اس کی ازلی کمزوری تھی۔ دھن کی طلسماتی کرامات کا بھی تجربہ تھا۔ لیکن اشی!

یہاں آ کر وہ رک جاتی۔ محبت خدا سے ہے اور خدا محبت۔ وہ اس حقیقت کو رد نہ کر سکتی تھی۔ اپنی محبت کے لیے وہ اس سے بڑی قربانی اور نہ دے سکتی تھی کہ اپنی ازلی خواہشوں کی تکمیل اور اپنی دیرینہ آرزوؤں کی راہ میں آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو جائے۔

یقیناً

محبت کی راہ میں یہ اس کا بہت بڑا ایثار تھا۔

رات کی بے قرار سوچوں کا نچوڑ وہ استغفی تھا جو صبح اس نے شہزاد کی میز پر ڈال دیا۔

”بیٹھے۔“ شہزاد کا دل تحریر کی چند سطریں پڑھتے ہی بجھ گیا۔

ریشم بیٹھی نہیں، بڑی متانت سے بولی۔ ”میں جاسکتی ہوں؟“

”نہیں.....“ شہزاد نے اس کا استغفی پھاڑ دیا..... ریشم حیرت زدہ ہی اسے دیکھنے لگی۔

”یہ..... یہ.....“ وہ ہکلا گئی۔

”مجھے آپ کے فیصلے سے بے شک صدمہ ہوا ہے ریشم..... لیکن.....“ وہ کرسی پر

پیچھے ہٹتے ہوئے مسکرایا..... یہ مسکراہٹ ایسی بخ بستہ تھی کہ ریشم کو جھرجھری آ گئی..... اس

نے آنکھیں جھکا لیں..... شہزاد بغور اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ ”میری پیشکش

سے آپ متفق نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے..... آپ کا یہ فیصلہ مجھے قبول ہے لیکن اس میں استغفی کی

تک سمجھ نہ آئی۔“ ریشم نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے شہزاد بولا۔ ”جہاں تک میرا خیال

ہے۔ میں نے دفتری اوقات میں ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے آپ اس عمل پر مجبور ہوئی

ہوں۔ آپ میرے لیے قابلِ تعظیم ہیں..... جائیے اپنی سیٹ پر..... اس بات کا آپ کے

کام سے کوئی تعلق نہیں..... زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں.....“

ریشم سر جھکائے کھڑی تھی۔ کھری کھری سنانے کو اس نے کتنی باتیں سوچی تھیں۔

تلخ..... کڑوی، کیلی اور طنز سے بھرپور باتیں!! لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

”جائیے مس ریشم۔ آئندہ ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“ وہ میز پر بازو رکھتے ہوئے

آگے کو جھکا۔ ریشم مشینی انداز میں پٹی اور دھیرے دھیرے دروازے کی طرف چل دی۔

کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا۔

شہزاد نے دونوں بازوؤں کے حلقے میں سر میز پر رکھا ہوا تھا۔

-----○-----

کئی ماہ گزر گئے۔

اشی کے پاس سفارش تھی نہ رشوت۔ ایم اے کی ڈگری کی کیا وقعت۔ سرکاری اداروں میں رسائی تھی نہ پرائیویٹ میں۔ دو ایک جگہ نوکری ملنے کی امید ہوئی بھی تو تنخواہ اس سے کم تھی۔ جو وہ ابھی لے رہا تھا۔ ضرورتیں تو ہزاروں روپے کی طالب تھیں۔ ایسی من پسند ملازمت ملنا ممکن ہی کہاں تھی۔ بڑے آستانوں کی ناصیہ فرسائی کی میل ملاقات والوں سے درخواست کی لیکن کام کہیں نہ بنا۔ ناکامی کا شدید ترین رد عمل اس کی طبیعت کا چڑچڑاپن تھا۔ امی اور گھر والوں سے تو تلخ ہو ہی جاتا تھا۔ اب تو ریشم کی حوصلہ افزائی بھی اسے کھلنے لگتی۔ وہ اکثر چڑچڑاتا اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت اثر لیتا۔

اندھیروں کے بعد روشنی آتی ضرور ہے۔ یہ روشنی نور کی پھوار ہو سکتی ہے اور جہنمی شعلوں کی لپک بھی لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں کہ روشنی کیسی بھی ہو..... اندھیروں کو نکل جاتی ہے..... اور راہیں صاف طور پر نظر آنے لگتی ہیں۔

رحمان صاحب کا کاروبار پنڈی اور کراچی میں پھیلا ہوا تھا۔ محنت سے کمایا تھا۔ تقدیر نے رہبری کی تھی۔ ہزاروں لاکھوں میں بدلے تھے اور اب تو ایک سپورٹ امپورٹ میں جو کچھ کما رہے تھے، حساب ہی نہ تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیوی مرچکی تھی۔ بڑے بیٹے کو اونچے گھرانے میں بیاہ کر پریشان تھے۔ بہوان کے کنٹرول میں کہاں رہتی۔ اونچے طبقے کی ساری صفات اس میں تھیں..... یہیں سے رحمان کی سوچوں کی حد ٹوٹی تھی۔ وہ دولت مند ضرور تھے لیکن طبیعت میں سادگی اور سچاپن تھا..... شمو کو چند ملاقاتوں میں پرکھا تو اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ چھوٹے بیٹے کے لیے وہ کسی ایسی ہی لڑکی کے متلاشی تھے جو سنبھل کر زمانے کا ساتھ بھی دے سکے اور مشرقی روایات کی بے حرمتی کرنے کی مرتکب بھی نہ ہو۔

نچھی کو بہانے بہانے شمو نے ان کو دکھا بھی دیا تھا۔ ذکی سے بھی سامنا ہو گیا تھا۔ بیٹے نے باپ کی ایما پر بخوشی سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

صغیر احمد کے مرنے سے بات کچھ دب گئی تھی..... لیکن جب رحمان کراچی سے شمو کے ہاں افسوس کرنے آئے تو اپنی دلی خواہش کا پھر سے اظہار کیا۔

شمو ہچکچائی..... پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے..... جو مالی خلا صغیر احمد کی موت سے پیدا ہو گیا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے وہ نچھی کے رشتے کی حامی کیوں کر بھر لیتی اور پھر آنسو بہاتے ہوئے اپنی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے معذرت کر دی۔

رحمان صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آہستگی سے بولے۔ ”مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ اب تو یہ رشتہ حاصل کرنا میرا اخلاقی فرض بھی ہو گیا ہے۔“ پھر وہ چپ بیٹھے آپوں آپ سر ہلاتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔

کئی دنوں بعد وہ پھر آئے۔ چائے کے دوران انہوں نے شمو کے میکے کا ذکر جھپٹ کر دیا۔

”کیوں بیٹی، کام بنا آپ کے بھائی کا کہیں؟“

شمو نے مایوسی سے سر ہلا دیا.....

”ہوں۔“

”شاید میں ان سے ملا تھا؟“

”جی۔ نچھی کو وہی ساتھ لے کر آیا تھا۔“

”ہاں..... ہاں..... اچھا لڑکا ہے.....“

”سب کچھ اچھا ہی ہے انکل۔ ایک ہی خرابی ہے کہ ملازمت اچھی ملتی ہے نہ

پاس پیسہ ہی ہے کہ کوئی کاروبار ہی کر لے۔ خدا بخشے ابا مرحوم ساری عمر دیانتداری سے نوکری کرتے رہے۔ یہی سبق انہوں نے اولاد کو دیا لیکن.....“

”مایوسی کی کوئی بات نہیں بیٹی..... خداوند کریم مسبب الاسباب ہے۔“

”حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ پریشانی رہتی ہے۔ اسے دیکھ کر تو کلیجہ کٹتا ہے

انکل۔ وہ ہمارا کھوتا بھائی ہے۔ ابا جان تو جان دیتے تھے اس پر۔ کسی ذمہ داری کا اسے پتہ

ہی نہ تھا۔ اب دردِ در کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ اتنے بوجھ اس پر آن پڑے ہیں..... کہ.....“  
 شمو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شعیب کا دل بھی برا ہو رہا تھا۔ شمو کا دکھ وہ دل سے محسوس کرتا تھا لیکن سمجھ نہ آتی تھی، کیا کرے۔ اپنا دامن اتنا وسیع کہاں تھا جو اس بدنصیب قبیلے کو اس کی وسعتوں میں چھپا لیتا۔ جہاں تک بن پڑا اشی کے لیے اس نے بھی دوڑ دھوپ کی لیکن کام کہیں نہ بنا۔ رحمان صاحب بڑے متاثر تھے۔ بڑے خلوص سے انہوں نے نیچھی کو بیٹی بنا لینے کا عہد کیا۔

”یہ ہماری ضرورت سے زیادہ ہی عزت افزائی ہے جو ہمارے حالات جانتے ہوئے بھی آپ میری بہن کے.....“

”اوہ..... شمو بیٹی..... تم یہ بات دل سے نکال دو..... کہ نیچھی بیٹی کی شادی کے لیے آپ لوگوں کے پاس کچھ نہیں..... مجھے انسانوں کی تلاش ہے.....“

شمو کا دل اس شفقت پر بھر آیا۔ ان کے سامنے رونا اچھا نہیں لگا۔ بہانے سے اٹھ آئی اور بے اختیاری سے بہنے والے آنسوؤں کو کھلی چھٹی دیدی۔

ڈرائنگ روم میں شعیب اور رحمان باتیں کرتے رہے۔ اشی کے متعلق رحمان صاحب بڑی تفصیل سے شعیب سے پوچھتے رہے۔ یہ لڑکا انہیں ہر لحاظ سے اچھا لگا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم کر لیا کہ اشی کی مگنی وغیرہ فی الحال نہیں ہوئی۔

”آپ کے پاس کوئی معقول کام نہ ہوگا۔“ شعیب نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

”کام بہت۔“ رحمان صاحب مسکرائے۔ چند لمحے چپ رہے۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”میرا کام بہت پھیل گیا ہے۔ بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کراچی اور پنڈی کا کام الگ الگ کر دوں۔ پنڈی تو سنبھال لوں گا۔ کراچی کے لیے مجھے سمجھدار اور دیانتدار آدمی کی ضرورت ہے۔ سوچ رہا ہوں اشی کو کیوں نہ سونپ دوں یہ کام۔ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہ کر سارا کام سیکھ جائے گا۔“

”آج ہی فون کر دیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”بہت محنتی اور ایماندار لڑکا ہے..... آپ کی امیدوں پر پورا اترے گا۔ پڑھا لکھا ہے۔ جلد ہی کام بھی سمجھ جائے گا۔“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“

پھر باتوں ہی باتوں میں شعیب نے ڈھکے چھپے لفظوں میں تنخواہ کی بات کی تو رحمان ہنس پڑے۔ شعیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ”اس کی ضروریات کو کافی ہوگی.....“

پھر آنکھوں میں بڑی چمک لاتے ہوئے رحمان رازداری کے انداز میں بولے۔ ”میں نے اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچا ہے شاید..... کراچی کا کام اس کے سپرد ہی کر دوں..... اپنی عارفہ بیٹی کے لیے مجھے ایسے لڑکے کی ہی تلاش ہے۔“

”جی؟“

”ہاں میاں آج کل اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ عزیزی نیچھی کو بیٹی بنا لیں گے تو اس کے بھائی کو بیٹا بنا لینے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہوگی.....“

یہ بات اتنی غیر متوقع تھی کہ شعیب حیرت زدہ سالن کا منہ دیکھنے لگے۔

رحمان صاحب معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”بھئی پہلے اسے بلاؤ تو سہی، پھر دیکھیں گے۔ بے فکر رہو، اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔“

رحمان کے جانے کے بعد شعیب نے ساری باتیں شمو کے گوش گزار کیں تو وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔ ”آپ غلط سمجھ ہوں گے..... بیٹی کے لیے کوئی اپنے منہ سے یوں کہتا ہے.....“

”نامہوں نے کہا تو یہی ہے۔ یہ بات ہوئی تو سمجھو اشی کا نصیبہ جاگ گیا۔ ان کی بیٹی سے تو تم ملی ہونا۔“ شوش و پنج میں پڑ گئی۔

”میں سلیم صاحب کو فون کر دیتا ہوں۔ اشی جتنی جلدی آ جائے، اچھا ہے۔“

”لیکن.....“

”کیا؟“

”وہ یہ سودا قبول نہ کرے گا۔“

”ہونہہ..... تم تو پاگل ہو۔ قسمت ایسے موقعے روز نہیں دیتی.....“

شمو کچھ سمجھ نہ پائی..... گھر کے جو حالات تھے۔ اس سے مخفی نہ تھے۔ پچھلے ہفتے امی کا خط آیا تھا۔ اشی نے اپنا سکوتر بیچ ڈالا تھا۔ یہ شاید آخری شے تھی جو ضرورتوں کے منہ میں ڈالنے کو بیٹی جارہی تھی۔ دکانداروں کے قرضے بڑھ گئے تھے۔ سفید پوشی کا بھرم بھی قائم نہ رکھا جاسکتا تھا۔

وہ سردیوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ریشم اور اشی ایک طرف تھے اور لا تعداد ضرورتوں کے ساتھ نجھی، شگو اور عاصی کا مستقبل ایک طرف۔

کئی دن اس نے شعیب کو فون کرنے نہ دیا۔ رحمان صاحب بار بار فون کرتے رہے۔ اشی کا پوچھتے رہے۔ رحمان صاحب اس دن خود آ گئے۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے اشی کے متعلق استفسار کیا۔

”بلایا نہیں آپ نے انہیں.....“

شعیب کچھ کہنے کو تھا کہ شمو جلدی سے بولی۔ ”دراصل گھر میں کوئی مرد نہیں ہے

نا..... لڑکیاں اکیلی چھوڑ کر وہ شاید نہیں آسکا..... امی ماموں کے ہاں گئی ہوئی ہیں.....“

”کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے۔ میں خود ہی لاہور ہواؤں..... نجھی بیٹی کے

لیے آپ کی امی سے سوال تو کریں؟“

”انکل.....“ شمو سنجیدگی سے بولی۔ ”اچھی طرح سوچ لیجئے..... صرف لڑکی لڑکی

ہے اور کچھ نہیں..... یہ نہ ہو بعد میں.....“

”اوہ بیٹی تم نے مجھے کتنا غلط سمجھا..... اپنے ساس سسر سے پوچھنا میرے متعلق۔

کیوں شعیب تم بھی تو کچھ گواہی دو.....“ رحمان نے بڑے پیار سے کہا۔

رحمان نے خود ہی لاہور جانے کی تاریخ مقرر کر دی۔ شمو اور شعیب کو تیار ہونے کو

کہا۔ ”عارفہ بھی ساتھ جائے گی۔“ انہوں نے اپنی بیٹی کا بھی نام لیا۔

رحمان صاحب بہت خوش تھے۔ ویسے اپنے ذرائع سے بھی وہ اس خاندان کے

متعلق پتہ کروا چکے تھے۔ اشی کے متعلق بھی خاصی پوچھ گچھ کروالی تھی۔ اسی لیے انہوں نے

بڑے اطمینان سے فیصلہ کر لیا تھا۔

”اشی نیک اور شریف لڑکا ہے۔ مجھے اپنی عارفہ کے لیے ہر لحاظ سے پسند ہے۔“

رہی پیسے کی بات تو اللہ کا دیا میرے پاس اتنا ہے کہ بچوں کے مستقبل تابناک ہیں۔ اشی مخفی ہوگا تو اس برنس کو آگے بڑھائے گا۔ میں نے کراچی کا کام اس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب مجھ سے دوڑ دھوپ ہوتی نہیں۔ ذکی اور اشی دونوں مل کر سنبھال لیں گے کاروبار.....“ رحمان صاحب بڑی صاف گوئی سے کام لے رہے تھے۔ شمو ششدر سی ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔

”حیران کیوں ہو بیٹی؟“ رحمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس لیے کہ میں اپنی بیٹی کے لیے خود ہی کہہ رہا ہوں۔ میں تکلفات کا عادی نہیں۔ دونوں رشتے مجھے منظور ہیں۔ لاہور جا کر میں آپ کی امی سے مل کر جہاں نجھی کو اپنی بیٹی بناؤں گا، وہاں عارفہ کو بھی ان کے سایہ عاطفت میں دے دوں گا۔ یہ میرا غیر متزلزل ارادہ ہے۔ خداوند تعالیٰ ان بندھنوں کو دونوں خاندانوں کے لیے باعث مسرت کرے۔“

”آمین۔“ شعیب نے کہا اور شمو سر جھکائے سوچوں میں ڈوب گئی۔ جو کچھ سن رہی تھی، یقین نہ آ رہا تھا اور یقین کر لینے کی صورت میں بھی پریشانی ہی پریشانی تھی۔

رحمان صاحب کے جانے کے بعد شعیب نے شمو کے کندھے پر مسکراتے ہوئے ہاتھ رکھا۔ ”اشی اور نجھی کی قسمت جاگ اٹھی۔ قدرت کے کام دیکھو۔“

شمو دوسرے دن ہی لاہور چلی گئی۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے امی سے صلاح مشورہ کرنا ضروری تھا۔ اشی کو کچھ نہ کچھ بتانا تھا۔

شمو نے ساری باتیں نجھی اور امی کو بتا دیں۔ دونوں ششدر رہ گئیں لیکن جلد ہی

حیران پریشانی بن گئی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... یہ کیونکر ممکن ہے اشی اور ریشم!“

سوچوں کی راہیں یہاں آ کر یوں رک جاتیں جیسے سامنے کوئی بہت اونچی بہت

لمبی چوڑی آہنی دیوار آ جائے اور اسے ڈھادینا اور عبور کر لینا اس کے بس میں نہ ہو۔

لیکن

معاملہ سوچوں سے نکال دینے کا بھی نہیں تھا۔ شمو کافی کشمکش کے بعد جذباتیت

سے پنٹ چکی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے امی کو احساس دلانے لگی۔ قدرت کی طرف سے فراہم کردہ



موقع سے افادہ کرنا چاہیے تھا۔ اشی کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو زندگی کے ناقابل برداشت بوجھ سے چور چور ہوا جا رہا تھا۔ نو دس ماہ کی صعوبت کی جچی میں پستے پستے بے حال تھا۔ شمو کا دل کٹ کٹ جاتا۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اشی کو ساری باتیں بتا ہی دیں۔ عذرا بیگم آنکھوں سے اشارے کرتے ہوئے منع ہی کرتی رہیں لیکن وہ سب کچھ کہہ گئی۔

اشی کو یوں لگا جیسے کئی سوئمن وزنی ہم اس کے سر پر آن پھٹا ہو۔ اسے اپنی شخصیت اور وجود کے ٹکڑے اڑتے محسوس ہوئے۔ وہ آنکھیں پھاڑے شمو کو دیکھتا رہ گیا۔

”اشی بیٹے،“ عذرا بیگم جلدی سے بولیں۔ ”ضروری تو نہیں کہ تم اس بات سے متفق ہو جاؤ۔“

”دونوں پہلو اس کے سامنے ہیں۔ سوچ سکتا ہے۔“ شمو نے آہستگی سے کہا۔

اشی کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ آنکھوں کا آزار بڑھ گیا۔ تلخی سے بولا۔

”ایک اپنا آپ ہی تو رہ گیا ہے شمو۔ وہ بھی چھین لینا چاہتی ہو۔“

شمو نے کچھ کہنا چاہا لیکن اشی جھنجھلا گیا۔ تیزی سے بولا۔ ”دنیا میں لاکھوں لوگ مجھ سے بھی بدترین حالات سے دوچار ہیں۔ آخر وہ بھی توجہ لیتے ہیں۔“

عذرا بیگم کا چہرہ دھندلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شمو نے اچھا خاصا محاذ بنالیا۔ جذباتی فیصلہ اسے قبول نہیں تھا۔

ریشم سے اسے بھی پیار تھا لیکن سوال یہ تھا کہ ایسے مالی حالات میں ریشم کا بار اشی اٹھا سکتا تھا۔

اشی مسلسل انکار کرتا رہا۔ شمو سے تو چڑ جاتا۔ دونوں میں اچھی خاصی لڑائی بھی ہو جاتی۔ شمو کی باتیں مدلل ہوتیں لیکن جذباتیت کو دلیلوں سے کیا کام۔

یوں

کئی دن بیت گئے۔ شمو نے شعیب کو خط لکھ کر رحمان کے آنے کی تاریخ آگے بڑھا دی۔ اس نے آس نہیں توڑی تھی۔ مسلسل ضربوں سے تو لوہے کو ڈھال لیا جاتا ہے۔

اشی کا ذہن تو محبت کے مارے انسان کا عام سا ذہن تھا۔

اشی کے حالات زندگی محمودہ بیگم سے مخفی نہ تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہی فکر مند تھیں۔ اکثر سائرہ سے دکھ سکھ کی باتیں کرتیں۔ سائرہ عملی زندگی میں قدم رکھ چکی تھی۔ تجربات بہت بڑے استاد تھے۔ ٹھہری ہوئی طبیعت تو پہلے ہی تھی۔ اب تو خوب ہی سمجھدار ہو گئی تھی۔ حالات کی یہ ناگوار صورت دیکھتے ہوئے وہ بھی متفکر تھی۔

لیکن

ریشم کے جذبات بھی اس سے پوشیدہ نہ تھے۔ کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ماں بیٹی اپنے طور پر ہی سوچتی رہتیں۔ دو ایک بار سائرہ نے دبے دبے لفظوں میں اشی کے حالات کا ریشم کو احساس دلانے کی کوشش بھی کی تو وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ”میں بچی نہیں ہوں باجی۔ لیکن وقت ایک سانہیں رہتا اور میں انتظار کر سکتی ہوں۔ آپ میرا فکر نہ کریں۔“

لذت انتظار شاید ریشم کی زندگی میں بھر پور خوشی لے آتی۔

لیکن

شمو گئی اور باتوں باتوں میں اس نے ساری روئیدار ریشم کے گوش گزار کر دی۔

ماں کی پریشانیاں رو رو کر بتائیں۔ اشی کے انکار کی صورت میں شجی کا مستقبل بھی تاریک تھا۔ بڑے دکھ سے وہ ساری باتیں بتاتی رہی۔

ریشم کی آنکھیں شدت کرب سے پھٹنے لگیں۔ چہرہ ایک دم خنجر گیا۔ سانس یوں آئی جیسے کھانسی کے بے آواز غوطے لگ رہے ہوں۔

شمو کی روح کا نپ گئی۔ اٹھ کر ریشم کو گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے رو دی۔

”ہم کتنے دکھی ہیں ریشم، ہمیں کسی کی نظر کھا گئی لیکن اشی کی خوشیاں اسے ضرور ملیں گی۔ ہم اسے مجبور نہیں کریں گے۔“

ریشم نے آہستگی سے شمو کے بازو اپنے گلے سے نکالے۔ برف کی طرح

ٹھنڈے اور سرسوں کے پھولوں کی طرح زرد ہاتھوں سے ریشم کے ہاتھ تھام لیے۔  
 ”باجی۔ اشی انکار نہیں کرے گا۔“ اس نے ٹھوس، مستحکم اور ہمالیہ کی چوٹیوں پر جمی  
 برف کی سی ٹھنڈک سے کہا۔

ریشم کی بات شمو کے لیے وجہ تسکین ہونا چاہیے تھی لیکن اس کا دل خون کے آنسو  
 رو دیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس سے دنیا کا بدترین گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ اس نے بہتیری تلافی  
 کی کوشش کی لیکن ریشم پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ایسے لوگوں کا دل تو ان بڑیک اہل شیشے کی طرح ہوتا  
 ہے۔ نہ ٹوٹے تو نہ ہی ٹوٹے لیکن ٹوٹ جائے تو ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جائے۔

شمو کے جانے کے بعد ریشم اتار روئی اتار روئی کہ صبر و ضبط کے سارے بند بہہ  
 گئے۔ اسے اپنے پیار کی شدتوں اور گہرائیوں کا پوری طرح آج احساس ہوا۔ اشی اس کی  
 چاہتوں کا نقطہ عروج تھا۔ اس کے عشق کی انتہا تھا۔ وہ اس سے چھن جائے؟ اس خیال ہی  
 سے وہ حواس کھو سکتی تھی۔ مر سکتی تھی۔

لیکن

جب جذبات کے طوفانی ریلے ختم گئے۔ آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ ذہن کچھ  
 سکون آشنا ہوا تو اس نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنا اور سنجیدگی سے سوچنے لگی۔

اشی کو دردِ در کی خاک چھانٹنے نو دس ماہ ہو چکے تھے۔ کوئی ایسا روزگار اسے اب تک  
 نہ مل سکا تھا جس سے وہ گھر گریہ ہستی کے اخراجات آبرو مندی سے پورے کر سکتا تھا۔ اس پر  
 تین جوان بہنوں کا بوجھ تھا۔ اس خستہ حالی میں یہ بوجھ ایک ناقابل تلافی ذہنی کوفت تھا۔  
 اب قدرت نے ایک انمول موقع فراہم کر دیا تھا۔ نجھی کی شادی ہو سکتی تھی۔ اس کا مستقبل  
 جگمگا سکتا تھا۔ اشی کو ایسا روزگار مل سکتا تھا جس سے آصی اور شگو کے مستقبل بھی روشن ہو سکتے  
 تھے اور عذرا بیگم کی پریشانیاں بھی ختم ہو سکتی تھیں۔

صرف ریشم کا وجود لہراتی خوشیوں میں مزاحم تھا۔

اگر وہ راستے سے ہٹ جائے تو ایک بدنصیب خاندان مصائب کے جال سے

نکل سکتا تھا۔

ریشم کا ضمیر بار بار دستک دے رہا تھا۔  
 پہلے تو ریشم نے دستک دینے والا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔

لیکن  
 دستک مسلسل تھی۔

وہ سوچتی رہی۔

کئی دن اور کئی راتیں سوچتی رہی۔

کبھی سوچیں مثبت ہوتیں اور کبھی منفی۔

اور  
 کبھی

یوں بھی ہوتا کہ مثبت سوچیں منفی سے ٹکرا جاتیں اور ذہن میں مکمل اندھیرا چھا

جاتا۔

پھر بھی وہ سوچتی رہی۔

ہر پہلو اس کے سامنے تھا۔ اسے لگتا تھا کہ محبت کے بغیر وہ مر جائے گی۔

لیکن

اس کا ضمیر چیخ اٹھتا۔ ”تمہیں محبت کرنے سے کون روکے گا ریشم۔ یہ اپنی جگہ اٹل

سچائی ہے۔ کوئی طاقت تم سے محبت کرنے کا حق نہیں چھین سکتی لیکن محبت کو غرض نہ بناؤ۔ اشی

کو اس کی پریشانیوں سے نجات دلا کر ہی تم محبت کی معراج کو چھو سکتی ہو۔ اسے آلام کے بحر

میں ڈوبنے سے بچا لو کہ محبت کا تقاضا یہی ہے۔“

کئی دنوں کی کشمکش کے بعد بھی سوچوں نے اس کا دامن نہیں چھوڑا لیکن ضمیر کی

مسلسل پکارنے اسے دلجمعی اور اطمینان سے ہر پہلو کا جائزہ لینے کی ہمت ضرور عطا کر دی۔  
ان دنوں اسے شہینہ کا بار بار خیال آتا۔ اپنی پسند کی شادی نہ ہونے پر اس نے  
خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن شادی ہو گئی تھی۔ سب کے ساتھ ریشم کا  
بھی یہی خیال تھا کہ وہ سسک سسک کر مر جائے گی لیکن وہ مری نہ تھی۔ جی رہی تھی، بڑی  
آن بان سے۔ بڑے ٹھٹھاٹ باٹ سے۔

اسے عائشہ بھی یاد آئی جس نے ماں باپ کی مرضی کے خلاف محبت کی شادی کر لی  
تھی لیکن شادی کے بعد زندگی کی حقیقتوں نے اس کے تصوراتی خاکے اس طرح نگلے تھے کہ  
اب اس کی اپنی شکل مخ ہو کر رہ گئی تھی۔

اور پھر ریشم کے سامنے خالد اور سلیمہ جیتی جاگتی مثال تھے۔ خالد جس نے محبت کی  
خاطر ماں بہنوں کو بھلا دیا تھا، خاندان سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اب جس طرح بیزار بیزار  
رہنے لگا تھا، احساس تک نہ ہوتا تھا کہ کبھی اس نے سلیمہ کی خاطر تن من کی بازی لگائی تھی۔  
مالی بد حالی نے محبت کو روند ڈالا تھا۔

ریشم کے سامنے حقیقتوں کے ننگے چہرے تھے اور وہ بڑی دلجمعی سے اسے دیکھ رہی  
تھی۔ غور سے ان کا مطالعہ کر رہی تھی۔

ساری سوچیں اس کے ذہن میں ابلتی رہیں۔

اس حقیقت کو اس نے تسلیم کر لیا کہ ضرورت بہت ظالم شے ہے۔ پیسے کی اہمیت اور  
افادیت سے وہ انکاری پہلے بھی نہ تھی۔ اب تو حالات کا جائزہ تجربوں کی مدد سے لے رہی تھی۔  
وہ سوچتی رہی۔

حال سے مستقبل جنم لیتا ہے۔ اشی کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر کے نظر ڈالتی تو  
جبر جبری سی آ جاتی۔ خالد کی سلیمہ کے روپ میں اپنے آپ کو دیکھنا اسے کبھی گوارا نہ تھا۔  
بیزاری، ٹھنڈی کوفت، منتشر سا گھر، بے رنگ اور مر جھائے ہوئے بچے۔ وہ گھبرا جاتی۔

اور

پھر

مسلسل سوچ نے اسے عظمت کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ اشی کے خوشگوار حالات

اور اپنے مستقبل کے آزار سے بچنے کے لیے اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔  
اشی اسے دنیا کی ہر شے سے عزیز تھا اور یہ اس کے پیار کی انتہا تھی جو اس نے اس  
عزیز وجود سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جاتی سردیوں کی بڑی اداس شام تھی۔ ریشم ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر  
نیم دراز تھی۔ سہ پہر کی دم توڑتی روشنیاں شام کے اترتے اندھیروں میں گھل کر بے کیفی کی  
کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ ریشم دم بدم مدہم ہوتی روشنیوں کا سارا دکھ من میں اتار رہی تھی۔  
آنکھیں بند کئے سوچ رہی تھی کہ یہ روشنیاں آہستہ آہستہ معدوم ہو جائیں گی اور پھر مکمل  
تاریکی چھا جائے گی۔ روشنی کا وجود ختم ہو جائے گا۔

لیکن

نہیں

ایسا نہیں ہوگا۔

انسانی عقل نے اندھیروں سے نپٹنے کا کتنا مجرب طریقہ ڈھونڈ لیا ہے۔ ذرا سا  
بٹن دبانے سے روشنی ساری تاریکی نگل لیتی ہے۔

یہ روشنی مصنوعی سہی۔

لیکن اتنی تیز تو ہوتی ہے کہ اندھیرے بھی جگمگاٹھتے ہیں۔

ریشم کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی تھی جس سے بوند بوند ہو چک رہا تھا۔  
وہ سوچوں کے تانے بانے میں جانے کب تک الجھی رہتی۔

کہ

بالکل غیر متوقع طور پر اشی آ گیا۔

ریشم کا دل جیسے غوطہ کھا کر ایک دم ڈوب گیا۔ اس کا سارا وجود کانپ گیا۔ وہ اشی کو  
دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکی۔

”آ جاؤں۔“ وہ بے تکلفی سے اندر آ گیا۔

وہ اسے بیٹھنے کا بھی نہ کہہ سکی۔ اس کے قریب ہی دوسرے صوفے پر وہ خود ہی

بیٹھ گیا۔

”میں شوکی کے پاس آیا تھا۔ ملا نہیں، خالہ جان وہاں تھیں۔“ وہ بڑی معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

”ہاں امی چچی کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔“ ریشم کے بے جان ہونٹوں سے بمشکل الفاظ پھسلے۔

”خیریت۔“ اشہی اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

”بالکل۔ بالکل۔“

”بہت دن ہو گئے تم نہیں آئیں ہمارے ہاں۔“

”ہاں۔ سوچ رہی تھی آنے کا۔“

”پھر؟“

”اب آپ آگئے۔“

”چلا جاؤں؟“

”نہیں۔“

اس نہیں میں محبت کا خوبصورت اصرار نہیں تھا۔ ایک سرد حکمانہ اصرار تھا۔ اشہی نے خاموش نظریں ریشم کے سپید چہرے پر مرکوز کر دیں۔

”ریشم۔“

”جی۔“

”میں کئی دنوں سے تم سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

”جی؟“

”شمو آئی ہوئی ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”اچھا؟“

”ہاں۔“

ریشم نے دم سادھے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے کسی مشکل مرحلے سے گزر رہا تھا۔ وہ واقعی مشکل مرحلے سے گزر رہا تھا۔ شوکی پیشکش اور اپنی ثابت قدمی کا ریشم کو

بتانے آیا تھا۔ یہ تو معمولی سی قربانی تھی۔ وہ تو ریشم کے لیے دنیا قربان کر سکتا تھا۔ اپنے پر جوش جذبات کے اظہار کے لیے اسے الفاظ نل رہے تھے۔

اور

ریشم دم سادھے اسے تنکے جا رہی تھی۔ پرانے تانبے کی سی رنگت۔ خوبصورت پیشانی پر بے شمار سلوٹیں۔ شگفتگی سے عاری چہرہ۔ اس کا دل کٹنے لگا۔ وہ اشہی کے چہرے سے اس کے جذبات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اس لیے خود ہی پہل کر لی۔

”سنا ہے آپ کو بہت اچھی ملازمت کی آفر آئی ہے۔“ وہ ناتمام سی مسکراہٹ سے بولی۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ اشہی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”جس نے بھی۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور پھر قدرے مسکرائی۔ ”سودا مہنگا نہیں۔“

”ریشم!!“ یہ اشہی نہیں، اس کی روح کی چیخ تھی۔

”ہونا یوں ہی چاہیے۔ امیر لڑکیوں کی غریب لڑکوں اور غریب لڑکیوں کی امیر لڑکوں سے شادیاں ہونی چاہئیں۔ دولت کا توازن صحیح رہتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ریشم۔“ اشہی نے بے بسی سے کہا۔ ”اس آفر کا تمہیں پتہ چل چکا ہے تو کیا میرے ٹھکرا دینے کا کسی نے نہیں بتایا؟“

”بتایا ہے۔“

”تو پھر.....؟“

”آپ سخت غلطی کر رہے ہیں اور میں آپ کو ایسی فاش غلطی کا مرتکب کبھی نہ ہونے دوں گی۔“

”ریشم۔“

”ریشم ہنس پڑی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”میں نے غلط نہیں کہا۔ غریب لڑکوں کی امیر.....“

”ریشم۔“

”جذباتی نہ بنئے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”تو۔ تو۔ تم۔“ غصے سے اشہی کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ ریشم کچھ کہتے ہی کو تھی کہ

اس نے اپنی بھرپور قوت سے تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

ریشم کی آنکھوں میں اندھیرا پھیل گیا۔

وہ خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے غرایا۔ ”مجھے یہی خدشہ تھا کہ تم مجھے چھوڑ

دوگی۔ شہزاد.....“

”اشی۔“ ریشم دکھ سے چیخ اٹھی۔ گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے نمناک نظروں سے اشی کو دیکھا۔

نظروں کے درد سے اشی بے تاب ہو گیا۔ اٹھ کر مٹھیاں بے بسی سے بند کرتے کھولتے بولا۔ ”مجھے ایسا کہنے کا کوئی حق نہیں۔ میں۔ میں۔“

ریشم اٹھ کر اس کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ ملائمت سے اس کا کندھا پکڑتے ہوئے بولی۔ ”جذباتی نہ بنے اشی۔ میرا اشارہ اپنی ذات کی طرف نہیں تھا۔ شہزاد کا بت تو میں نے بہت پہلے توڑ ڈالا تھا۔ میں تو آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔“

پھر

ریشم نے بڑے اطمینان سے ساری باتیں جوشمو نے بتائی تھیں، کہہ ڈالیں۔

اشی سر جھکائے پارے کی طرح مضطرب تھا۔

”بیٹھے۔“ ریشم نے اسے پیار سے بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو فیصلہ جذبات کی روشنی میں نہیں، عقل کی روشنی میں کرنا ہے۔“

”میں فیصلہ کر چکا اور اب دنیا کی کوئی طاقت اسے بدل نہیں سکتی۔“

ریشم اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں آنکھیں بند کئے رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ ”تو آپ اپنی خواہشوں کے جہنم میں پورے گھر کو جھونکنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟“

”ریشم۔“

”آپ کے حالات میرے بھائی کے حالات سے زیادہ خراب ہیں اشی۔ یاد ہے ایک دفعہ میں نے اس سلسلہ میں بات کی تھی تو آپ نے خالد کو برا بھلا کہا تھا۔ جانتے ہیں آپ نے کیا جواب دیا تھا؟“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”یہ احساس دلانا چاہتی ہوں کہ محبت کے بغیر ہم مر نہیں جاتے لیکن پیسے کے بغیر مر بھی سکتے ہیں۔“

”مجھے موت قبول ہے۔“

”انجان نہ بنے، مجھے بے دلیل باتوں سے چڑ لگتی ہے۔ حالات سے آنکھیں بند کرنے کی بجائے پوری آنکھیں کھول کر ان کا جائزہ لیجئے۔“

”ریشم۔“

”بتائیے ناشی۔ حالات کی بھٹی سے گزر کر آپ نے کن تجربوں کی روشنی میں ایسا سنگین فیصلہ کیا ہے۔ ان دس گیارہ ماہ میں آپ نے کیا کیا نہیں کیا۔ کون کون سے حیلے نہیں آزمائے۔ کونسا چارہ نہیں کیا لیکن آپ نے کیا پایا؟“

”تم۔“

”آئندہ بھی یہی ہوگا۔ درد کی خاک چھان کر ہر آستانے پر حاضری دے کر بھی آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ میں مفروضوں پر یقین نہیں رکھتی۔ اپنے تجربے کی بنا پر کہتی ہوں کہ نہ کوئی چھپر بٹھے گا۔ نہ ہی طلسماتی عمل کہ خزانے کا منہ کھل جائے گا۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

اشی غصے سے غرایا لیکن ریشم بڑے تحمل سے بولی۔ ”روزمرہ کی ضروریات کا منہ بند کرنے کے علاوہ آپ کے سر پر تین جوان بہنوں کا بوجھ بھی ہے اشی۔ اس آمدنی میں گزارہ مشکل ہے۔ آپ ان کی شادیاں کس طرح کریں گے۔ کیا اپنا گھر بسا کر انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے؟ بتائیے نا۔“

اشی نے سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ بے قراری سے پہلو بدلا اور بنا کچھ کہے سر جھکا لیا۔

”آپ کو ان سب فرائض کو نبھانے کو پیسے کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے انحراف کیا جاسکتا ہے نہ منہ موڑا جاسکتا ہے۔ سارہ باجی کی شادی کے سلسلے میں میں جانتی ہوں کہ اس پیسے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا پڑا اور اگر آپ یہ باور کرانے کی کوشش کریں یہ

سب پیسے کے بغیر بھی ہو جائے گا تو یہ اندھی سوچ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ حقیقت یہی ہے کہ آپ کی آمدنی تین چار سو سے زیادہ نہیں۔“

اشی نے تڑپ کر دکھی نظروں سے ریشم کو دیکھا۔  
”اور اس قلیل آمدنی سے روزمرہ کی عام ضرورتوں کا منہ بھی بند نہیں ہو سکتا۔ اس منہ کو بند کرنے کے لیے آپ شاید.....“ وہ چپ ہو گئی۔

اشی بڑے طنز سے ہنسا۔ ”ریشم سیدھی طرح کہہ دو کہ میری غربت سے تم بھی نباہ نہیں کر سکتیں۔“

ریشم نے آہستہ آہستہ رخ موڑ کر اشیشی کو مضحمل نظروں سے دیکھا۔ پھر متانت سے بولی۔ ”اگر صرف میرے نباہ ہی کا سوال ہوتا۔ جب بھی مجھے رک کر سوچنا پڑتا۔“

اشیشی تحمل سے سننے اور آرام سے سوچنے۔ اچھی طرح زندگی گزارنے کی خواہش فطری ہے۔ میں نے ابو کے مرنے کے بعد گھر کے حالات کبھی آسودہ نہیں دیکھے تھے۔ اس کے باوجود میں نے ہمیشہ اچھا پہننے اور اچھی طرح رہنے کی خواہش، امنگ اور آرزو کی۔ اپنی ماں کی مجبوریوں کو جانتے ہوئے بھی میں نے اپنی خواہش کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے معاملے میں شاید میں جذباتی سوچوں میں بہہ جاتی۔ آپ کی غربت سے نباہ کرنے کا وعدہ کر لیتی لیکن آنکھیں بند کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ سو ہی گئے ہیں مگر اب میرے نباہ سے زیادہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اہل خانہ بھی اس غربت سے نبھا کر سکتے ہیں یا کہ نہیں۔ شاید آپ اپنی ذمہ داریوں کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ نہیں۔“

اشی نے مضطربانہ نگاہیں ریشم پر ڈالیں۔  
”اپنی ذات کے خول میں مقید نہ رہیے اشیشی۔ میں جانتی ہوں کہ جدا ہو جانا ہم دونوں کے لیے گٹھن ترین مرحلہ ہے لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم محبت کو غم کا اظہار بنانے کی بجائے خوشی کی علامت سمجھ لیں۔“

اور پھر ریشم بڑے ٹھہرے ٹھہرے، سلجھے سلجھے انداز میں اشیشی کو حقیقتوں کے ننگے چہرے دکھاتی رہی۔ جذباتیت سے ہٹ کر عقل سے سوچنے پر آمادہ کرتی رہی۔ پیسے کی

طاقت کا احساس دلاتی رہی۔

”پیسے کے بغیر زندگی سگلتے جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں بڑے تلخ تجربات کئے ہیں۔ سارہ باجی کی شادی ایک تلخ ترین تجربہ ہے۔ اگر ہمارے پاس بھی بے شمار پیسہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی، سارہ باجی کی شادی نعیہ اور ریعہ سے کم تر جگہ پر ہوتی۔ وہ صورت شکل و عقل میں ان سے بہت بلند ہونے کے باوجود ان جیسے گھروں میں بیابا ہی نہ جاسکیں۔“

”ریشم۔“ وہ بڑے دکھ سے کراہا۔

”میں سچی بات کہہ رہی ہوں۔ نجھی، شگو اور آصی کے لیے آپ لاکھ سر پنچیں گے مگر آپ کو کبھی ایسا اچھا گھر اور رشتہ نہ ملے گا۔ یہ جو رشتہ مل بھی رہا ہے، اس کے پس پردہ سرمائے کی اپنی غرض ہے۔ آپ آج اس رشتے سے انکار کر دیں۔ رحمان صاحب لاکھ اچھے سہمی۔ میں یقین سے کہتی ہوں، وہ کبھی نجھی کو قبول کر جائیں۔“

”میں کیا کروں ریشو۔ میں کیا کروں؟“ بے بس ہو کر اشیشی نے سراپنے ہاتھوں پر گرا لیا۔ ”میں۔ میں تم سے چھٹ کر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”ہم جانور نہیں ہیں اشیشی۔ انسان ہیں۔“ ریشم کرب سے بولی۔ ”اپنے لیے تو ہر کوئی جیتا ہے۔ دوسروں کے لیے جیا جائے، عظمت تو یہی ہے۔“

”تم۔ تم میری آخری خوشی کا گلا بھی گھونٹ دینا چاہتی ہو۔“ اشیشی نے ویران آنکھوں سے ریشم کو دیکھتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”نہیں۔“ ریشم نے گلے میں پھنسی ہنکی سے نپٹتے ہوئے پھٹ جانے والی نظروں سے اشیشی کو دیکھا۔ ”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ پھٹ جانے کے دکھ کے بدلے آپ کو اتنی خوشیاں ملیں گی کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دکھ اپنی شدت کھو دے گا۔ آپ اپنی امی کے چہرے پر خوشی کے سائے دیکھیں گے تو آپ کو خوشی نہ ہوگی۔ نجھی اپنے گھر میں شاد و آباد ہوگی۔ تو آپ خوش نہ ہوں گے۔ آصی اور شگو کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا تو آپ کو اطمینان نہ ملے گا۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار خوشیوں کو سمیٹ لیں گے تو دکھ آپوں آپ ان کے بار تالے دب جائے گا۔“



اشی اس کی بات سنی ان سنی کر کے شکستہ لہجے میں بولا۔ ”تمہیں میرے جذبوں کی شدت کا شاید احساس نہیں۔“

”ہے۔ مجھے پوری طرح احساس ہے اشی۔ اپنے جذبوں کی تندی سے بھی میں بے خبر نہیں۔ اس کرب کا بھی بخوبی اندازہ ہے۔ جو ہم دونوں کی راہیں جدا ہو جانے پر ہوگا۔ لیکن میں ان سب کو سہہ لوں گی۔ مجھے یہ تو اطمینان ہوگا کہ میں نے اپنے پیار کی خاطر کچھ کیا ہے۔“

ریشم رکی۔ گردن صوفے کی پشت پر نڈھال انداز میں ڈالتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر امنڈتے جذبات کو روک لیا۔ ریشم رکی۔ تڑپتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ سراپا درد نظر آ رہی تھی۔ صندلی رنگت نچڑے ہوئے لٹھے کی طرح سپید پڑ گئی تھی۔

اشی کا دل سینے میں بکس کی طرح تڑپا۔ ریشم نے سر آہستگی سے اٹھایا۔ لبوں پر ہلکا سا تبسم لاتے ہوئے ننناک نظروں سے اشی کو دیکھا۔ پھر بولی۔ ”بڑا کٹھن مرحلہ ہے لیکن ہمیں خوش اسلوبی سے نبھالینا ہوگا۔“ اشی نے بے قراری سے پہلو بدلا۔

ریشم ٹوٹے ہوئے لہجے میں اسے پرمغز دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اشی بے چین ہو ہو کر پہلو بدلتا رہا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ اس کی آنکھوں میں کبھی خون اتر آتا اور کبھی مایوسی کی دھول پھیل گئی۔ کبھی صوفے کی پشت پر گردن ڈال دی اور کبھی سر ہاتھوں پر گرالیا۔ ریشم بولتی رہی۔

بولتی رہی۔ اپنے تجربوں کا نچوڑ اس کے سامنے لاتی رہی۔ سارہ کی شادی اور امی کی بیماری ایسے تجربے تھے کہ پیسے کی اہمیت کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پیسے کی طاقت کا اسے اندازہ تھا۔ پیسے کے بغیر انسان گردش میں آئے ہوئے پیسے کی مانند ہے۔ اس دور میں انسان کی انسانیت کوئی نہیں دیکھتا۔ اس کی صلاحیتوں کو کوئی نہیں پرکھتا۔ اس کے بلند افکار کسی کے لیے

باعث کشش نہیں ہوتے۔ پیسہ پاس ہے تو ہر خوبی اس میں ہے۔ پیسہ نہیں ہے تو وہ زمین کے سینے کے بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔

اشی ستار ہا اور وہ بولتی رہی۔ ”اگر میں تمہاری دلیلوں سے اتفاق نہ کروں تو۔“ وہ مرے مرے لہجے میں بولا۔ ”تو یہ حقیقت سے فرار کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“ ریشم اٹل لہجے میں بولی۔ ”ریشم۔“

”آپ اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں اب تک گم ہیں۔“ ”مجھے۔ زندہ رہنے کا گر سکھاتے ہوئے یہ بھی نہ بھولو کہ انتہائی بے دردی سے میرا گلا گھونٹ رہی ہو۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں مہیب سنائے تھے۔ وہ ہولے ہولے بڑبڑایا۔

”تم نے تو اپنا درس دے دیا۔ اب دیکھنا مجھے ہے کہ اذیت کی چھری تلے میں سانس بھی لے سکتا ہوں یا نہیں۔“ ”اشی!“ ریشم کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکلی گئی۔ اس کا دم گھٹنا جا رہا تھا۔ دردی شدت سے بے حال ہو کر کانپ رہی تھی۔ اشی نے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ بے چین ہو گیا۔

اور بے ساختہ اسے تھام لینے کو ہاتھ پھیلا دیئے۔ آزمائش کا یہ شدید ترین وار تھا۔ دودھی دل ایک ہی سطح پر تڑپ رہے تھے۔ شدت جذبات سے مغلوب بھی تھے۔ عشق کی بلند یوں اور انتہاؤں کو چھو رہے تھے۔ لیکن

پھر بھی جدا ہو جانا مقدر بنا لیا تھا۔ ریشم قدرے پیچھے ہٹ گئی اور ہاتھ اٹھاتے ہوئے منجمد لہجے میں بولی۔

”نہیں اشی۔ نہیں۔“

اشی کے پھیلے ہوئے ہاتھ بے جان ہو کر گر گئے۔ اس نے سختی سے اپنے بے رنگ ہونٹ کو کاٹ لیا۔

”ہم۔ یہیں سے الگ ہو رہے ہیں اشی۔“ ریشم کی پسینی ڈو شیراؤں جیسی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ ڈوبتے ابھرتے سانسوں میں بولی۔ ”ہم جذبات کی بھٹی کا ایندھن نہیں بنیں گے۔ ہم نور کی پھوار بن کر ایک دوسرے کے سینے میں ہمیشہ لودیتے رہیں گے۔ میں جانتی ہوں۔ آپ مجھے بھلا سکیں گے نہ میں آپ کو۔ جھوٹے سہارے نہ آپ کو دوں گی۔ نہ ان کے سہارے خود چوں گی۔ میں آپ کے۔ دل کا درد بن کر رہوں گی۔۔۔۔۔ آپ میری زندگی کی سب سے مقدس سچائی۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی ہم۔ خوش رہنے کی پوری پوری کوشش کریں گے کہ ہم نے کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے اپنے وجود کو قربان کیا ہے۔“

اشی کے دل و دماغ کے پر نچے اڑے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کڑوا کیلا دھواں گھل رہا تھا۔ سارا وجود زلزلے کے ہلکے پھلکے جھٹکوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ کتنی بری طرح وہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

”جائیے۔ اشی۔“ ریشم کی آواز ٹوٹ گئی۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھی ٹھوڑی تلے رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے آنسو گالوں پر بہنے لگے۔

اشی نے لہو لہان نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے سے یوں رخ موڑ لیا۔ جیسے تاب نظارہ نہ ہو۔

دوسرے لمحے

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

-----○-----

آسمان گرا

نہ

زمین پھٹی

اشی عارفہ کا شوہر بن کر جیتا رہا اور ریشم کچھ مدت بعد شہزاد کا مقدر بن گئی۔

کئی سورج ابھرے

اور

ڈوب گئے۔

کئی

موسم آئے

اور

بیت گئے

خوبصورت گھر، سوسائٹی میں اونچا مقام، مخلص ساتھی، صحت مند اور پھول سے

بچے۔ زندگی سے سمجھوتہ کر لینے کے بعد دونوں نے سب کچھ پالیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آگ بہت بھڑکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سب کچھ جلا

ڈالے گی۔

لیکن

آہستہ آہستہ بھڑکتے شعلوں نے دم توڑ دیا۔

کچھ عرصہ تک چنگاریاں بھی سلگتی رہیں

لیکن وہ وقت بھی آیا کہ چنگاریاں بجھ کر ٹھنڈی راکھ رہ گئیں۔

اور

پھر

ہواؤں نے اس راکھ کو بھی منتشر کر دیا۔

اب نہ شعلے تھے نہ چنگاری۔ راکھ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

لیکن جس جگہ آگ جلے وہاں سیاہی مائل لال لال نشان ضرور رہ جاتا ہے۔ یہ

داغ کبھی نہیں مٹتا۔

کبھی..... نہیں..... مٹتا!



ایک سو ساٹھ

ڈاٹ کام